نیا ایرانی ادب

(مع ترمیم و اضافہ)



ڈاکٹر ظہور الدّین احمد

نیا ایرانی ادب

(مع ترمیم و اضافہ)

ڈاکٹر ظہور الدّین احمد

نگارشات ☆ میاں چیمبرز ☆ 3 ٹمپل روڈ ☆ لاہور
فون:6362412- فیکس:6312968

نام کتاب: نیا ایرانی ادب
مصنف: ڈاکٹر ظہور الدین احمد
سال اشاعت: 2000ء
ناشر: آصف جاوید
نگارشات پبلشرز
میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور
مطبع: المطبعۃ العربیہ لاہور
قیمت: =/250 روپے

مندرجات

تعارف

نئے ادب سے مراد وہ ادب ہے جو تقریباً انیس سو عیسوی سے لے کر ان آخری اسی سالوں میں وجود میں آیا- یعنی ایران میں ناصرالدین شاہ قاچار کے قتل (1896ء) سے جمہوریہ اسلامی ایران کی تشکیل تک- خیال یہ ہے کہ طالب علموں کو تمام اصناف ادب یعنی شاعری' ڈراما' افسانہ' ناول اور نثر کے نئے رجحانات سے آشنا کرایا جائے اس لئے مصنّفین کے حالات اور ان کی ادبی خصوصیات سے پہلے ایک مختصر لیکن کسی حد تک جامع دیباچہ لکھا ہے تاکہ وہ تاریخی اور ثقافتی عوامل اور موثرات واضح ہو جائیں- جن کی وجہ سے کلاسیکی ادب نے نئی صورت اختیار کر لی ہے-

یہ کتاب ادبیات نو سے گویا ایک تعارف نامہ ہے- میں نے مجوزہ خاکہ کے مطابق ہاتھ روک روک کر لکھا ہے تاکہ کتاب حدوں سے باہر نہ نکل جائے کیونکہ بعض مصنّفین ایسے بھی ہیں جن پر الگ ایک ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے میں نے صرف ہر مصنف کے سوانح حیات بیان کرنے کے بعد اس کی تصانیف و تالیفات کا ذکر کیا ہے اور مضمون کا زیادہ حصہ اس کے فن کی خصوصیات بیان کرنے میں صرف کیا ہے-

ادبیات نو پر لکھنے والے کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا ہے- اس سے پیشتر اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے- شعراء کے تو دیوان چھپ گئے ہیں اور چند ایک تذکرے بھی شائع ہو گئے ہیں لیکن افسانہ' ناول اور ڈراما پر بہت کم لکھا گیا ہے- اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ لکھنے کے برابر ہے- دوسری دقت یہ ہے کہ مصنفوں کی نگارشات دستیاب نہیں ہوتیں- اگر کسی زمانے میں شائع ہوئی تھیں تو اب ناپید ہیں- ڈراما کے متعلق تو معلومات صفر کے برابر ہیں- حال ہی میں دکتر ابوالقاسم جنتی نے "بنیاد نمائش درایران" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے لیکن اس میں تنقید کا حصہ عنقا ہے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ڈرامہ نگاروں کے اپنے مصنفہ ڈرامے شائع نہیں ہوئے اس لئے ان کے متعلق تعارفی نوٹ لکھنا بھی مشکل ہے- میں تنگی وقت کے باوجود تہران میں اپنے دوران قیام میں پانچ چھ ڈرامہ نگاروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی بیاضوں میں سے تین تین ڈرامے پڑھ سکا-اور ان کے فن ڈرامہ کے متعلق مختصر سا لکھ سکا ہوں-

ہم نے ناول' افسانے یا ڈرامے کا پہلے خلاصہ بیان کر دیا ہے پھر ان کے متعلق انتقادی رائے کا اظہار کیا ہے- یہ طریق بھی ارادتاً اختیار کیا گیا ہے- تاکہ ان کتابوں تک جن صاحبوں کی

رسائی نہیں وہ ان کے مطالب سے آگاہ ہو سکیں اور خود بھی ان کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔ ہر صنف ادب میں اور بھی مصنف نکل سکتے ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں آ سکتا ہے اکثر نثر نگار' افسانہ نویس،شعراء اور محقق ابھی زندہ ہیں اور اپنی تصانیف و تالیفات میں مصروف ہیں۔ ان میں سے بعض تاریخ ادبیات میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور بعض کا مقام متعین کرنے کے لئے وقت لگے گا۔

پس منظر

تاریخی پس منظر

نیا ادب ایران کی تاریخ و اجتماعی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جابجا ناقد شخصیتوں اور موثر عوامل کا ذکر آتا ہے۔ اگرچہ ہم نے ہر صنف ادب کی تاریخ' ارتقا میں ان کا ذکر کر دیا ہے اور تصانیف میں تاریخ کے جن گوشوں کی طرف اشارات ملتے ہیں' ان کے طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ عہد کی سیاسی تاریخ کا مجمل خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جا سکے اور نئے ادبی رجحانات سمجھنے میں مدد مل سکے۔

ناصرالدین شاہ قاچار(1848- 1896ء) کی حکومت درباری تھی۔ اگرچہ اس کے عہد حکومت میں مغربی تمدن کے اثرات رونما ہو رہے تھے چھاپہ خانہ قائم ہوا تھا۔ اخبار و رسائل کا رواج ہو رہا تھا۔ جدید تصورات ترجموں کے ذریعے داخل ہو رہے تھے۔ تارو ڈاک کا انتظام ہو چکا تھا لیکن رعایا کی حالت دگرگوں تھی۔ امراء عیاش تھے حکام کا جبر و استبداد سخت تھا۔ رشوت خوری عام تھی۔ امین السلطان صدر اعظم کے توسط سے جب تمباکو کی اجارہ داری انگریزوں کی ایک کمپنی کو عطا کر دی گئی۔ تو عوام میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ علماء نے امتناع تمباکو نوشی پر فتویٰ دیا۔ آخر بادشاہ کو مجبور ہو کر عہد نامہ فسخ کرنا پڑا اور عہد نامہ کی رقم انگریزوں سے قرض لے کر ادا کی۔ اسی زمانہ میں عوام میں بیداری کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ قوم کے درد مند رہنما ملک کے اندر اور باہر حکومت استبداد اور اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ بادشاہ کے خلاف بھی نفرت کا سیل امنڈ آیا تھا۔ امین الدولہ حاج شیخ حسن نجم آبادی اور سید جمال الدین اسد آبادی کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے لکھے پڑھے لوگوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ یہاں تک کہ 1313ھ میں مرزا رضا کرمانی نے شاہ کو قتل کر دیا۔ یہ شخص سید جمال الدین اور نجم آبادی کے مریدوں میں سے تھا۔ ناصرالدین شاہ کے بعد اس کا بیٹا مظفر الدین شاہ (1896-1906ء) تخت پر بیٹھا۔ یہ کمزور اور نالائق شخص تھا۔ جاہل اور بے بصیرت درباری امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ امین السلطان صدر اعظم روسی سیاست کی طرف مائل تھا۔ مظفر الدین شاہ نے اس کو معزول کر کے مرزا علی خان امین الدولہ کو اس کے بجائے منصوب کیا اس نے سلطنت کے مالی امور کی کافی اصلاح کی لیکن درباری کی سازش سے شاہ نے اس کو معزول کر کے پھر امین

السلطان کو عہدہ صدارت عطا کیا- بادشاہ نے تین مرتبہ یورپ کا سفر کیا اور بے جا اخراجات سے سلطنت کا دیوالہ نکال دیا- روس سے قرض لئے اور شمالی ایران کے محاصل چنگی کو گرو رکھ دیا- انگریزوں سے قرض لئے جنوب ایران کے تار ڈاک اور چنگی کے محاصل کو ضمانت کے طور پر گرو رکھ دیا- اس طرح بیرونی سلطنتوں کو ملک کے سیاسی اور اجتماعی مسائل میں دخیل کر دیا- بلژیکی افسر جو چنگی کی تحقیق و تفتیش پر مامور تھے- ان میں سے نوزیلژیکی وزارت گمرک کے عہدے تک جا پہنچا- علماء اور تجار کی مخالفت کی بنا پر امین السلطان معزول ہوا اور سلطان مجید مرزا عین الدولہ اس کے بجائے صدر بنا یہ شخص بھی حالات کو نہ سدھار سکا- اسی زمانہ میں ادھر مشروطیت خواہوں کا زور بڑھ رہا تھا- ادھر صدر اعظم کی طرف سے جور و استبداد زیادہ ہو رہا تھا- اخبار بند کئے جا رہے تھے- رہنماؤں کو قید و بند کی مشقتوں میں گرفتار کیا جا رہا تھا- آخر عین الدولہ بھی معزول ہوا اور مرزا نصراللہ خاں مشیر الدؤلہ نائینی صدارت کے لئے منتخب ہوا- اسی کے عہد صدارت میں یعنی 1324ھ میں شاہ نے فرمان مشروطیت یعنی پارلیمانی حکومت پر دستخط کئے اور مجلس شوریٰ ملی نے قانون اساسی پاس کیا- پانچ دن کے بعد بادشاہ مرگیا-

مظفر الدین شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمد علی شاہ تخت نشین ہوا- اس نے مشروطیت کی مخالفت کی اور مشیر الدولہ کو معزول کر کے امین السلطان کو مقرر کیا لیکن اسی سال وہ ایک آزادی خواہ کے ہاتھوں قتل ہوا- اس کے بعد مرزا ابوالقاسم خاں ناصر الملک کو صدارت کے لئے منتخب کیا- نمائندگان مجلس کے دباؤ پر اس نے مشروطیت کے استقلال کے لئے کوشش کرنے کا وعدہ کیا- لیکن بادشاہ نے اس کو قید کر دیا- آزادی خواہوں نے بادشاہ کی بدنیتی سے خبردار ہو کر تہران اور باہر کے شہروں میں اس کے خلاف فوجی تنظیم کی- 1326ھ میں بادشاہ نے "لیا خوف" روسی قزاق خانہ کے افسر کی مدد سے مجلس پر بمباری کی اور بعض نمائندوں کو قتل اور بعض کو قید کیا- شاہ کے اس استبداد سے بغاوت کی لہر دوڑ گئی- آزادی خواہ مجاہدین نے تبریز پر قبضہ کیا- باقر خاں، شار خاں، تقی خاں، محمد ولی خاں، پیر مخان اومنی اور علی قلی خاں، سردار اسعد بختیاری نے آزاد فوج کو اکٹھا کر کے کرج کے مقام پر شاہی فوج کو شکست دی اور 1327ھ میں تہران پر قبضہ کر لیا- بادشاہ سفارت خانہ روس میں پناہ گزین ہوا- آزادی خواہوں نے اس کے بارہ سالہ بیٹے احمد مرزا کو بادشاہ منتخب کیا اور محمد علی شاہ کو 75 ہزار سالانہ وظیفہ دے کر روس میں چلے جانے کو کہا لیکن اس نے خراسان اور استراباد کے راستے لوٹ کر تخت پر قبضہ کرنا چاہا- آخر اس کا وظیفہ بھی موقوف کر دیا گیا اور وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر یورپ میں چلا گیا- ناصر الملک نائب سلطنت بنا اور

مرزا حسن خاں مستوفی الملک وزیراعظم ہوا- نئی مجلس نے امریکہ اور سویڈن سے امور مالیہ کے ماہروں کو دعوت دی- مورگن شوستر مشیر امریکی نے قابل قدر خدمات انجام دیں لیکن روس نے حکومت کو اس کی بیدخلی پر مجبور کیا- روسی افسروں نے اور بھی دست درازیاں کیں گنبد مشہد پر بمباری کی، تبریز کے بعض آزادی خواہوں کو قتل کیا- 1333 A 1913ء میں احمد شاہ کی تاجگذاری ہوئی اس کے عہد حکومت میں داخلی حالت بد سے بدتر ہوگئی- اطراف و جوانب سے قبائل نے مرکزی حکومت سے انحراف کیا- اسی زمانہ میں جنگ عظیم (1914ء- 1918ء) شروع ہوئی- روسیوں نے شمال اور انگریزوں نے جنوب میں اپنا اقتدار جما لیا اور جرمن اور آسٹریا کی ان فوجوں سے جنگ کی، جو ترکی وسیلے سے ایران میں مقیم تھیں اور ایران اغیار کی فوجوں سے پامال ہو گیا- 1919ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا جسے قرار داد شوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- اس کے مطابق مالی، فوجی اور محاصل چنگی کے تمام امور انگریز مشیروں کے تحت انجام پاتے تھے- اس معاہدہ کی مخالفت ہوئی اور امریکہ کے اثر سے یہ معاہدہ منقطع ہو گیا- اسی اثنا میں رضا خاں شمال سے اپنی فوجوں کو لے کر تہران میں داخل ہوئے اور سید ضیاء الدین وزیراعظم کی مدد سے حکومت پر قبضہ کر کے 1299 ش 1921ء میں سردار سپہ بن بیٹھا- 1300ء میں سید ضیاء الدین الگ ہو کر یورپ چلے گئے اس کے بعد قوام السلطنت اور پھر پیرنیا مشیر الدولہ وزیراعظم بنے- 1301 ش میں موخر الذکر نے استعفیٰ دیا تو پھر اول الذکر وزیراعظم ہوئے- اسی سال مرزا حسن خاں مستوفی الملک نے کابینہ کی تشکیل کی- 1302 ش میں پھر مشیر الدولہ برسرکار آگئے- آخر رضا خاں خود 1303 ش میں وزیراعظم اور وزیر جنگ ہوئے- 1304ء میں مجلس شوریٰ ملی نے احمد شاہ کو معزول کر دیا اور رضا خاں کو شہنشاہ تسلیم کر لیا- 1305 ش بہ مطابق 1925ء میں تاجگذاری کی رسم ادا ہوئی اور بادشاہت کو ان کے خاندان میں موروثی مان لیا گیا- رضا خاں کا عہد سلطنت جہاں ترقیات کا دور شمار ہوتا ہے- وہاں ڈکٹیٹری اور تشدد کا عہد گنا جاتا ہے- اس کے قہر و جبر کے سامنے کسی کو مجال گفتگو نہیں تھی- تقریر و تحریر کی آزادی مانگنے والوں اور کمیونزم کے طرفداروں پر بڑی سختیاں ہوئیں- جیل کے شکنجوں نے بہت سے ہونہار شخصوں کی جانیں ضائع کیں- اس نے چھوٹی بڑی بغاوتوں کو دبا کر ملک میں امن قائم کر دیا- پولیس اور فوج کی از سر نو تنظیم کی- بڑے بڑے شہروں کے درمیان سڑکیں بنوائیں- جنوب سے شمال تک سراسر ایران میں ریلوے لائن بچھا دی- وزارت خانے قائم کئے صنعتی فلاحی بنک بنائے- بانک ملی کا افتتاح کیا- تجارت اور زراعت کے وسائل کو ترقی دی- نئی طرز کے مدارس اور کالج قائم

کئے۔ یونیورسٹی کی عمارت کھڑی کی۔ تہران اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں عالیشان عمارتوں سے ایران متمدن نظر آنے لگا۔ ڈاک، تار، ٹیلیفون کے محکموں میں وسعت ہوئی۔ ریڈیو سٹیشن قائم ہوا۔ پردہ اٹھ گیا۔ سارے ایران کو متحد اللباس کر دیا۔ آثار قدیمہ کی حفاظت ہوئی۔ عجائب گھر بنے۔ فردوسی ؒ، حافظ ؒ و سعدی ؒ کے مقابر تعمیر ہوئے غرض مملکت کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جس میں اصلاح نہ ہوئی ہو۔ ایران کا ذرہ ذرہ اپنی نئی ترقیوں کے لئے اس سپاہی شہنشاہ کا مرہون منت ہے۔ دوسری جنگ عظیم(1939ء - 1946ء) میں ایران جرمن کا ساتھ دے رہا تھا لیکن روسیوں اور انگریزوں نے ایران میں فوجیں لا ڈالیں اور بادشاہ کو 1320- 1941ء میں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا اور اسی سال اس کا بیٹا محمد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہوا۔ حکومت کا زاویہ نظر بدلا۔ ایران اقوام متحدہ کے ساتھ شریک ہوا۔ ایران کے راستے روس کو مدد پہنچی۔ جرمن کو شکست ہوئی۔ تہران میں روز و یلٹ، چرچل اور سٹالین کا اجتماع ہوا اور دوررس فیصلے کئے گئے۔ جب محمد رضا شاہ نے عنان حکومت سنبھالی تو ایران میں سخت ابتری تھی۔ غلہ کی کمی اور گرانی کے ساتھ زبردست وبا پھیل گئی تھی۔ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ 1324- 1325 بہ مطابق 1945- 1946ء میں سید جعفر پیشہ وری اور علی شبستری اور صادق پادگان نے ڈیموکریٹ پارٹی بنا کر آذر بائیجان میں خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اسی طرح ملا مصطفےٰ نے کردستان میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ جب مرکزی فوج ان کے خلاف روانہ ہوئی تو روسی فوج مقیم ایران مانع ہوئی آخر انگریزوں اور امریکنوں کی دخالت سے روسی دستے واپس اپنے ملک میں گئے اور مرکزی حکومت کی فوجوں نے حملہ آور ہو کر آذر بائیجان اور کردستان کو از سر نو اپنے تصرف میں کر لیا۔ 1330- 1952ء میں پٹرول کی پر منفعت صنعت قومی بنا لی گئی۔ محمد رضا شاہ کے عہد میں ایک بہت بڑا سیاسی تحول ہوا۔ حزب تودہ یعنی کمیونسٹ پارٹی کی زیر زمین سازشوں نے نظام حکومت کو الٹ دینا چاہا۔ ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم بھی بادشاہت ختم کرنے کے حامی تھے۔ حالات اتنے خطرناک ہو گئے کہ بادشاہ چپکے سے اٹلی چلا گیا۔ لیکن فضل اللہ زاہدی کے بروقت کودنے سے تخت بچ گیا۔ ڈاکٹر مصدق گرفتار ہوئے تو وہ پارٹی غیر قانونی قرار دی گئی اور اس کے اراکین کو چن چن کر گرفتار کیا گیا اور قتل کیا گیا۔ بعض غائب ہوگئے۔ مدت تک سیاسی بحران قائم رہا۔ کئی وزارتیں ٹوٹیں اور بنیں۔

محمد رضا شاہ پہلوی کے عہد سلطنت میں ملک کو سیاسی استحکام حاصل ہوا۔ بادشاہ نے اپنی حکمت علمی سے تمام ممالک سے سیاسی روابط استوار رکھنے کی کوشش کی صرف شط العرب، بحری

اور خلیج فارس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کی وجہ سے عراق، بحرین اور مصر سے اختلافات رہے ہیں، علاقائی تعاون کی بنا پر ترکی، ایران اور پاکستان کے درمیان اقتصادی ترقی کے لئے جو اتحاد ثلاثہ کی بنیادیں استوار ہوئیں وہ اسلامی ممالک کی یک جہتی اور ہم آہنگی کے لئے نیک فال ہیں۔

بادشاہ نے رعایا کی بہبود و آسائش کے لئے قابل قدر اقدامات کئے ہیں، 1341 میں انقلاب سفید کے نام سے ایک پروگرام مرتب کیا۔ بادشاہ نے وہ گاؤں جو شاہی املاک میں تھے۔ کسانوں میں تقسیم کر دیئے تاکہ وہ مالکانہ حقوق حاصل کر کے دلجمعی سے محنت کریں اور ملک کی زرعی معیشت کو ترقی دیں۔ ایک اور قانون کی رو سے جاگیرداری کو تقریباً ختم کر دیا اور فقط محدود اراضی املاک کی اجازت دی گئی۔ جاگیرداروں کی زمینیں مزارعین میں معقول شرائط پر تقسیم کر دی گئیں۔ تاکہ پچیس سال کے عرصہ میں اقساط ادا کر کے مقسومہ زمین کے مالک بن جائیں۔

ایران میں ہر بالغ کے لئے دو سال تک عسکری تربیت لازی تھی۔ بادشاہ نے اس سپاہ ملت کو سپاہ دانش قرار دے کر اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ گاؤں میں جا کر سکول کھولیں اور اہل دیہہ کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اس طرح کی ایک سپاہ بہداشت بھی منظم کی جو گاؤں کی صحت و نظافت کے لئے کام کرے۔ بادشاہ خواندگی دور کرنے اور ملک کو نور تعلیم سے روشن کرنے کے بہت بڑے حامی موید اور کوشاں تھے۔

بادشاہ نے زمینداروں کو جنگی زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ سرکاری کارخانوں میں حصہ دار بنا دیا اور انہیں چھ فی صد نفع دیا گیا تاکہ انہیں دوسرے ذرائع سے منافع کی صورتیں مہیا ہو جائیں۔ ایک اور قانون کے ذریعے مزدوروں اور کارکنوں کو بھی کارخانوں میں حصہ دار بنانا لازم قرار دیا گیا۔

شہنشاہ کی اصلاحات میں سے دو اور قابل ذکر ہیں ایک تو یہ کہ ملک کے تمام جنگلات کو قومی سرمایہ قرار دیا گیا تاکہ اس قومی دولت سے بھی اچھی طرح استفادہ کیا جائے دوسرا یہ کہ خواتین کا وقار بلند کرنے کے لئے ان کو بھی مجلس شوریٰ ملی کے لئے حق رائے دہی عطا ہوا اور اب وہ بھی ملک کے اس ادارہ جمہوری کی رکن منتخب ہو سکتی ہیں۔

شاہ رضا کے عہد میں پٹروکیمیکل، فولاد سازی، فرج، کولر، ریڈیو، ٹیلیوژن، موٹر گاڑیاں اور دوسرے وسائل زندگی تیار کرنے کے لئے کارخانے قائم کئے۔ ملک میں دریاؤں کا پانی موڑنے اور پانی ذخیرہ کرنے کے لئے 23 بند بنائے گئے۔ خوزستان میں سد محمد رضا شاہ پہلوی مشرق وسطیٰ

میں سب سے بڑا اور بلند بند شمار ہوتا ہے۔

تعلیم میں بہت زیادہ ترقی ہوئی، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا عوام کی صحت معالجہ کے لئے اقدامات کئے گئے۔ ہسپتالوں میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹروں کی تعداد دگنی ہوئی۔ مزدوروں کی صحت، آسائش، علاج، معاوضہ وغیرہ کے لئے اقدامات کئے گئے اجباری بیمہ کرانے کا قانون جاری ہوا۔ یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہوئی۔ ہزاروں طالب علم امریکہ اور یورپ کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے۔

رضا شاہ نے انقلاب سفید کے نام سے جو ارضی اصلاحات کیں، تجزیہ نگاروں نے بتایا ہے کہ ان کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ جن دہقانوں کو زمینیں ملیں انہیں کہا گیا کہ کاشتکاری کے جدید مشینی طریقوں سے کام لیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی بنائی گئیں کہ ان کو آلات کشاورزی حاصل کرنے کے لئے قرضے دیں۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ مقروض کاشتکار قرض ادا کرنے کے لئے شہروں میں چلے آئے زمینیں پیداوار سے محروم رہیں۔

بادشاہ نے غیر ممالک کو ایران میں سرمایہ کاری کی اجازت دی۔ 1349 ش 1970 میں 119 قائم ہوئیں جن میں 36 امریکہ، 18 مغربی جرمنی اور 14 انگلستان کی تھیں۔ 350 ملین ڈالر سرمایہ کاری میں سے 215 ملین ڈالر سرمایہ امریکی کمپنیوں کا تھا۔ قانون کے مطابق ان کمپنیوں کو اپنے ممالک کو منافع بر آمد کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن 30 فیصد رقوم جو باہر جاتی تھیں وہ واپس انہی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کے لئے پہنچ جاتی تھی۔ ان کمپنیوں کے توسط سے ایران میں موٹر بنانے، بجلی کا سامان بنانے، مشروب بنانے اور دوسرے وسائل زندگی بنانے کے لئے گراں بہا اور پیچیدہ کارخانے قائم کئے گئے۔ ان کارخانوں کو چلانے اور دیکھ بھال کرنے کے لئے بیرونی انجینئر اور ماہرین کی ضرورت ہوئی اور ان کو بڑی بڑی تنخواہیں اور دوسری سہولتیں دینی پڑیں۔ ملک کی تمام اقتصادی زندگی کا انحصار پٹرول کی آمدن اور بیرونی ٹیکنالوجی پر منحصر صنعتوں پر تھا اور نجی صنعت و حرفت کے لئے کوئی تحرکہ اور مہمیز نہیں تھی۔

ملک میں 30 تجارتی اور خصوصی بنک تھے لیکن عام طور پر یہ بین الاقوامی بنکوں کے کنٹرول میں تھے اور اس میں بیرونی عناصر کے حصص زیادہ تھے اور صنعتی پیداوار کو نقصان پہنچتا تھا۔ 1955ء میں امریکی نے پہلی مرتبہ ایران کو 13 ملین ڈالر قرضہ دیا تاکہ وہ اسے فوج کی تنظیم پر خرچ کرے۔ اس کے بعد قرضوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک وہ زمانہ آیا کہ 1973ء میں شاہ اسلحہ و سامان جنگی کا سب سے بڑا خریدار بن گیا اور 35 فیصد امریکی بر آمدات جنگی ایران

کے لئے مخصوص تھیں۔ شاہ اسلحہ خریدنے کے لئے رقم پیشگی بھی ادا کر دیتا۔ امریکہ اگر دو ڈالر وصول کرتا تو اس میں سے ایک ڈالر کا ایرانی پٹرول خریدتا اور اپنی فوج کے لئے نئے نئے اسلحہ بنانے کے لئے کارخانوں میں بھی سرمایہ لگاتا۔

امریکہ نے ایرانی فوج کی تنظیم کی۔ ملک میں بھی تربیت کی اور امریکہ میں بھی ہزاروں افسروں کی تربیت کی۔ 1955ء سے امریکی فوجی افسر مشیر کے طور پر ایران میں مقیم ہو گئے تھے۔ 1956 ش/ر 1977ء میں عسکری اور غیر عسکری افراد کی امریکہ میں تعداد 45 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پولیس اور فوج پر بھی امریکہ کا کنٹرول ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے امریکہ کو روس کی سرحد کے قریب بندر عباس میں اور آبنائے ہرمز میں واقع جزیرہ ابو موسی میں ریڈیو الیکٹرونک اور راڈار کا نظام قائم کرنے کی اجازت دی تاکہ وہ روس اور بحرہند میں روس اور دوسرے ہمسایہ ممالک کے بحری اور ہوائی جہازوں کی آمدو رفت کو نظر میں رکھے۔

ساواک جو سازمان اطلاعات ونیت کشور کا مخفف ہے ایک قسم کی سی آئی ڈی تھی جو سلطنت کے ہر مخالف پر نظر رکھتی تھی۔ سی آئی اے امریکہ اور موساد اسرائیل کی مدد سے اس کی تنظیم ہوئی اور سیاسی قیدیوں کو جسمانی اور روحانی اذیت دینے کے طریقے سیکھے گئے، کہتے ہیں کہ ایران کا ہر آٹھواں فرد اس کا رکن تھا اور ہر شخص پر ایک دوسرے کے متعلق بداعتمادی پھیلی ہوئی تھی اور حکومت کا خوف طاری رہتا تھا۔ اخبارات پر بھی ساواک کا کنٹرول تھا۔ دفتروں میں ساواک کا آدمی بیٹھتا تھا اور سیاسی مقالات لکھواتا تھا۔

شاہ رضا اپنے آپ کو آریائی نسل سے شمار کرنے پر فخر کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے آریا مہر کا لقب اختیار کیا۔ 1350- 1971ء میں اس نے اپنے آپ کو ایران کی قدیم شہنشاہت سے وابستہ کر کے 2500 سالہ جشن قدیم شہنشاہی منایا اور کروڑوں روپیہ خرچ کر کے دنیا بھر کے سربراہان سلطنت کو دعوت دی اور سنہ ہجری کو سنہ شہنشاہی سے تبدیل کیا۔ وہ کورش، دارا اور انوشیروان کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔

ایرانی تمدن آشنائے غرب ہو چکا تھا۔ تجدد پسندی کے روپ میں مغربی تمدن کی تمام خرابیاں معاشرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ شراب خانے کھلے تھے۔ گناہ و عصیان کی دکانیں کھلی تھیں۔ عریانی کا دور دورہ تھا۔ اسلامی ضوابط و احکام کی پروا نہیں تھی۔ 15 فروری 1342/ 1963ء کو امام خمینی کی قیادت میں معاشرے کو اسلامی نہج پر لانے اور کفر و اغیار پرستی کے خلاف جہاد کرنے کا عزم بالجزم کیا گیا۔

شاہ کے خلاف جدوجہد

1350 سے 1355 ش ر 1971- 1976ء تک شاہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رہی۔ حکومت کی طرف سے گرفتاریاں اور مقدمات چلے اور سزائیں ملیں۔ بہت سی عزیز جانیں تلف ہوئی۔ 1356/ 1977ء میں ڈاکٹر شریعتی اور آیت اللہ مصطفٰی خمینی کسی سازش کے خلاف قتل کیے گئے۔

12 دی 1356 کو روزنامہ اطلاعات میں ایرانی استعمار سرخ و سیاہ کے عنوان سے مقالہ چھپا۔ اس میں امام خمینی کو توہین آمیز الفاظ میں یاد کیا گیا تھا۔ قم میں اس کے خلاف مظاہرہ ہوا اور پولیس نے جلوس پر گولی چلائی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد تبریز، شیراز، اصفہان، مشہد، تہران، اہواز، خرم اور یزد میں ان شہدا کا چہلم برپا ہوا۔

25 فروری 1357 کو قزلی حصار جیل میں سیاسی قیدیوں نے اذیت و عقوبت کے خلاف بھوک ہڑتال کی۔ تہران یونیورسٹی اور پولی ٹیکنک کے طلبہ نے سیاسی قیدیوں کی ہمدردی میں جلوس نکالے اور تعلیم کا بائیکاٹ کیا۔ اسی دن اصفہان میں مزدوروں نے ہڑتال کی اور عوام بھی اس میں شریک ہوئے۔ پولیس اور فوج نے گولی چلائی اور بہت سے افراد مارے گئے۔ اصفہان میں پہلی مرتبہ مارشل لاء نافذ ہوا۔ 17 شہریور 57/ 1978ء میں تہران اور دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے اور فوج نے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ تقریباً 4 ہزار افراد مارے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں 600 عورتیں تھیں۔ 24 مہر 1357 کو امام خمینی کے حکم پر عام سوگ منایا گیا۔ 10 مہر 57 کو اول محرم کی مناسبت سے لوگوں نے چھتوں پر چڑھ کر سیاسی نعرے لگائے اور اللہ اکبر کی صداؤں سے شہر گونج اٹھا۔ محرم کے دوران میں ہی لاکھوں آدمیوں نے جلوس نکالے۔ پٹرول کمپنی کے مزدوروں اور طلبہ نے ہڑتال کی تو بہت سے فوجی سپاہی عوام کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ بعد کے اہم واقعات کی تفصیل اس طرح ہے۔

26 دی 57 کو شاہ نے ایران چھوڑ دیا۔ 16/1/1979ء

12 بہمن 57 امام خمینی پیرس سے آکر ایران میں داخل ہوئے۔ 1/2/79

22 بہمن 57، انقلاب اسلامی کی فتح مندی

28 بہمن 57، حزب جمہوری اسلامی کی تشکیل

15 فروردین 58، انجمن مجاہدین انقلاب اسلامی کی تشکیل

4 خرداد 58، تشکیل جہاد سازندگی

13 آباز 58، سفارتخانہ امریکہ پر قبضہ

11 آذر 58، عوام کی اکثریت نے قانون اساسی (آئین) کی تصدیق کر دی۔

5 بہمن 58، پہلے صدر مملکت کا انتخاب

24 اسفند 58، مجلس شوریٰ کے انتخابات

5، اردی بہشت 1359/ 1980ء امریکہ نے سفارتی کارکنوں کی رہائی کے لئے 100 کمانڈو کے ہمراہ 6 جہاز اور 8 ہیلی کاپٹروں کو طبس میں اتارا مگر طوفان کی وجہ سے حملہ ناکام ہوا۔

7 خرداد 59، مجلس شوریٰ اسلامی کا افتتاح

31 شہریور 59، عراق نے سرزمین ایران پر حملہ شروع کر دیا۔

30 دی 59، 4420 دن کے بعد سفارت خانہ کے امریکی کارکن رہا ہوئے۔

21 خرداد، 1360/ 1981ء بنی صدر صدارت سے الگ کر دیئے گئے۔

7 تیر 1360، حزب جمہوری اسلامی کے دفتر میں بم پھٹنے سے 72 بہترین رہنما اور نمائندگان مجلس شہید ہوئے۔

2 مرداد 1360، مجلس شوریٰ اسلامی اور صدر کے لئے دوسری مرتبہ انتخابات ہوئے محمد علی رجائی صدر منتخب ہوئے۔

6 شہریور 1360_ بم پھٹنے سے صدر مملکت محمد علی رجائی اور ڈاکٹر باہنر وزیر اعظم شہید ہوئے۔

بنی صدر کی معزولی کے بعد مجاہدین خلق کی جماعت باغیانہ اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف رہی اور انقلاب اسلامی کے رہنماؤں کو چن چن کر قتل کرتی رہی۔ آخر حکومت کی سخت گیری کے پیش نظر مجاہدین خلق سے وابستہ اشخاص گرفتار ہوئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔

عراق ایران جنگ کے درمیان شروع شروع میں عراق کا پلہ بھاری رہا اور انہوں نے بہت سا علاقہ زیر تصرف کر لیا۔ مگر انقلاب اسلامی سے سرشار نئی منظم ایرانی فوج اور سپاہ پاسداران انقلاب کے صبر و استقامت اور بے نظیر دلیری اور جذبہ شہادت سے تقریباً تمام مقبوضہ علاقہ واپس لے لیا گیا۔

امام خمینی کی بے مثال قیادت کے زیر اثر ایرانی قوم متحد رہی۔ عوام ان کے فرمان پر جان و مال کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہے۔ انتظامی ادارے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی تنظیم بھی

ہوئی۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے جہاد سازندگی کی بنیاد رکھی گئی جس میں زراعت، صحت، تعلیم اور سکونت سے متعلق **تنظیمات** قائم ہوئیں۔ **کمیتہ** ہائے انقلاب اسلامی نے امن و امان قائم کرنے، معاشرے کی اصلاح کرنے، وطن کی حفاظت کرنے انصاف دلانے، انقلاب اسلامی کے نظریہ کو عام کرنے، مخالفین کو گرفتار کرنے، غیر قانونی اسلحہ جمع کرنے اور پاسداران سپاہ کے حوالے کرنے کی غرض سے ملک و ملت کے مفاد میں بہت کام انجام دیئے۔ دادگاہ ہائے انقلاب اسلامی شریعت اسلامی کی رو سے ارزاں اور سریع انصاف مہیا کرنے کے لئے قائم کی گئیں۔ جنگ میں شہید، زخمی اور معذور ہونے والوں کے لئے اور ان کے کنبوں کے افراد کے لئے امداد اور پنشن کا انتظام کرنے کے لئے بنیاد شہید قائم کی گئی۔ مملکت کے ہر شخص کو مکان مہیا کرنے کے لئے بنیاد مسکن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔

ثقافتی پس منظر

نئے ادب میں جہاں سیاسی حوادث و واقعات پر تنقید ملتی ہے وہاں ایران کی ثقافتی زندگی پر تبصرہ موجود ہے۔ دورہ قاچار میں ایران تمدنی اور اخلاقی اعتبار سے پس ماندہ تھا۔ امراء عیاش تھے۔ عوام مفلس، عام اقتصادی حالت کمزور تھی۔ آمدورفت کے وسائل محدود تھے۔ گھوڑوں، گدھوں پر سفر ہوتا تھا۔ گھوڑا گاڑی چلتی تھی پولیس اور فوج کا نظام ناقص تھا۔ رشوت عام تھی۔ عوام توہم پرست تھے۔ عورتیں حجاب میں تھیں۔ تعویذ ٹوٹکوں کا رواج تھا۔ مذہبی اقتدار ملاؤں، واعظوں اور روضہ خوانوں کے ہاتھ تھا۔ دل و دماغ بے کار رسوم اور فضول اعتقادات میں جکڑے ہوئے تھے۔ عوام و خاص تریاک پینے کے عادی تھے تعلیم مکاتیب تک محدود تھی۔

فتح علی شاہ کا بیٹا عباس میرزا (م۔ 1249 ہجری) حاکم آذربائیجان تھا اس نے یورپی تمدن سے متاثر ہو کر اپنے ملک میں تبدیلی لانے کے لئے کوشش کی۔ اسلحہ سازی اور پارچہ بافی کے کارخانے قائم کئے۔ پریس کو رواج دیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے طالب علموں کو یورپ بھیجا۔ یورپی ممالک کے عسکری اور سیاسی نمائندوں کی آمدو رفت سے بھی یورپ کے متعلق ایرانیوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ امیر کبیر دوبار روس گیا اور اس نے ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد حکومت میں مالی اور اداری اصلاحات کیں۔ دارالفنون کی بنیاد رکھی۔

میرزا حسین سپہ سالار بھی قانون کی حکمرانی چاہتے تھے۔ مغرب میں معاشرتی اور ثقافتی ترقی کی

باتیں کرتے تھے۔ وہ فرانسیسی زبان میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ مظفر الدین شاہ کے زمانے میں محسن خاں مشیر الدولہ استانبول، لندن، اور پیٹرز برگ میں سفیر رہے۔ انہوں نے دارالفنون میں تعلیم حاصل کی۔ بعض عدالتی اصلاحیں بھی کیں۔ انہوں نے اخبارات کو آزادی دی۔ بعض یورپی مشیروں کو ایران بلایا۔ قاچاری شہزادوں میں شہزادہ علی قلی میرزا **اعتضاد السلطنتہ** اور شہزادہ فرہاد میرزا اعتماد الدولہ نے اپنے وطن کی ترقی کے لئے کوشش کی اور اپنے ہم وطنوں کو زمانے کے نئے انداز سے آشنا کرنے اور لعل فال اور نجوم کے توہمات سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کی۔ علی قلی میرزا نے سلطانیہ اور تبریز کے درمیان تار کا سلسلہ جاری کیا۔ فلک السعادۃ کے نام سے کتاب لکھی فرہاد میرزا نے علمی کتابوں کے تراجم شائع کئے۔

نیا ادب ان تمام عیوب و نقائص کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے فرسودہ نظام کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ تمدن نو، تعلیم نو اور بیداری دل و دماغ کے لئے کوشش اور جہاد ہے۔ نیا تمدن آیا۔ اپنے ساتھ نئے فیشن اور نئی ضروریات لایا۔ صنعتی و حرفتی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع بدلے۔ نئے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ اقتصادی اور مالی ضرورتیں بڑھیں۔ ملاؤں کا زور کم ہوا وطن پرستی کے جذبات نے سر نکالا۔ جب پرانے مسائل ختم ہوئے تو ادیبوں نے نئے موضوعات تلاش کئے۔ اب نئے تصورات کی تبلیغ ہونے لگی۔ بے حجابی کے ساتھ بے حیائی کا بھی رواج ہوا۔ رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوئیں۔ شراب کا عام فیشن ہوا۔ ازدواجی اور جنسی عمارت کی بنیادیں ہل گئیں۔ تجدد کے بعد آخری بیس سالوں میں عورت ادیبوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ فواحش نے بہت متاثر کیا ہے۔ انمل اور بے جوڑ شادیوں اور مردوں کی ہوس کاریوں اور بے راہ رویوں کے خلاف بھی اکثر مصنفین نے لکھا۔

ایران میں انقلاب اسلامی کے بعد بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی۔ شہنشاہی کا نام و نشان مٹانے کے لئے اقدامات کئے گئے۔ بادشاہ کے تمام مجسمے ہٹا دیئے گئے۔ مغربی تمدن کے شیطانہ اعمال کو ختم کر دیا گیا۔ شراب خانے بند ہوئے۔ ایرانی سفارتخانوں کی شراب نالیوں میں بہا دی گئی۔ رقص و سرور کی محفلیں، کابرے ممنوع ہوئے۔ سینما اور تھیٹر کی اصلاح ہوئی۔ قحبہ خانے بند ہوئے۔ تمام ملک میں اسلامی پردے کا رواج ہوا۔ یونیورسٹیاں بند کر کے تمام ضد انقلاب عناصر کو خارج کیا گیا اور اسلامی اصول کے مد نظر تمام تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کی گئی اور نئی درسی کتابیں شائع کی گئیں۔ جن درسی کتابوں میں شاہ کا نام آتا تھا ان سب کو منسوخ قرار دیا گیا۔

نماز جمعہ کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ لاکھوں افراد نماز جمعہ میں شریک ہونے لگے ہیں اور ایک مستند عالم سے خطبہ سنتے ہیں۔

منشیات کی روک تھام کے لئے سخت سزائیں دی گئیں۔ شیعہ سنی اختلاف سے اجتناب' اسلامی قوتوں کے اجتماع اور وحدت اسلامی کے احیاء و فروغ کے لئے تبلیغ کی گئی۔

جدید شاعری

جدید شاعری کے رجحانات سیاسی اور اجتماعی انقلاب کے مرہون منت ہیں' ایران کی تاریخ میں اس قدر موثر انقلاب کبھی نہیں ہوا جس کے اثر سے معاشرہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خیالات و نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ اس زمانہ میں چھاپہ خانہ کا رواج ہوا۔ نظم و نثر کی نئی اور پرانی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئیں۔ اخبار و رسائل عام ہوئے۔ لوگوں میں تعلیم کا چرچا زیادہ ہوا۔ فرانسیسی' انگریزی' روسی' جرمنی اور عربی مصنفوں کی نگارشات فارسی زبان میں ترجمہ ہو کر ارباب ذوق میں پھیل گئیں۔ (1215ھ بہ مطابق 1897ء) سے تہران اور پھر دوسرے شہروں میں نئے مدارس کا رواج ہوا۔ تعلیم عام ہوئی نوجوان نئے علوم سے آشنا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول تک مذہبی تعصب اور سیاسی کشمکش کی وجہ سے ہمسایہ ممالک سے تعلقات منقطع رہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں بین الاقوامی حقوق کے تحت دوسرے ملکوں سے روابط بڑھے۔ قاچار بادشاہوں نے یورپ میں سفر کئے۔ بعد میں تاجروں' سیاحوں' معلموں اور سفیروں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ ان کے ساتھ ساتھ یورپ کا ادب بھی ایران میں داخل ہوا۔ جس کا اثر نئے زمانہ کے لکھنے والوں پر نمایاں نظر آتا ہے۔

1324ھ (1906ء) میں مشروطیت قائم ہو جانے اور جمہوریت کے اصول رائج ہونے سے ایک اہم تبدیلی ہوئی جس سے تمام شعبہ ہائے زندگی اثر پذیر ہوئے اور کلاسیکی ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لوگوں میں وطن پرستی اور غرور ملی کے جذبات پیدا ہوئے نئے قوانین اور نئے ادارے قائم ہوئے۔ انفرادی حکومت بدل کر ملی حکومت بن گئی۔ انفرادی فکر کی جگہ بھی اجتماعی فکر نے لے لی۔ بادشاہ کی شخصیت مطمح نظر رکھنے کے بجائے ادباء اور شعراء نے ایرانی سماج کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیا ان کے شعر و سخن میں ان مسائل کا ذکر آنے لگا جن سے ایرانی زندگی کا تعلق تھا۔ چنانچہ سیاسی اجتماعی اور اصلاحی امور کے متعلق اکثر نظمیں لکھی جانے لگی۔

صنعت و حرفت کے انقلاب نے بھی ایرانیوں کو بہت متاثر کیا۔ نئی اختراعات اور رسل و رسائل کے نئے ذرائع نے ایران کی کایا پلٹ دی۔ اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے بارھویں صدی ہجری تک ایران ایک ہی ڈھرے پر چلا آ رہا تھا۔ نئی مشینوں اور نئے کارخانوں سے ایک نیا ایران وجود میں آیا۔ بجلی' تار' ٹیلیفون' موٹر' ریل اور ہوائی جہازوں کی اڑان نے قرون وسطی کے ایران کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ کھانا' پینا' رہنا' سہنا' کاروبار' گھربار سب میں تبدیلی ہوئی۔ جب ماحول میں

تبدیلی ہوئی تو شاعر کے محسوسات میں بھی تبدیلی ہوئی۔ سیاسی، صنعتی اور اجتماعی افکار ایران کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ اس طرح شاعری میں بھی ایک تبدیلی اور فراخی پیدا ہوئی۔ قیام مشروطیت کے زمانے میں شعراء بنیادی حقوق و قوانین کے متعلق شعر لکھتے تھے۔ ریلوے جاری کرنے، نئے کارخانے کھولنے اور قومی اداروں کے اجراء کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے بعد میں شاعر جمہوریت، سوشلزم اور ملک کے ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے متعلق اپنے پر جوش خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ گزشتہ پچاس سالوں میں شعر و سخن میں وہ تبدیلی اور ارتقاء ہوا جو گزشتہ پانچ سو سالوں یا پانچ ہزار سالوں میں بھی نہیں ہوا تھا۔

عصر حاضر میں شاعری کے تین اسلوب ہمیں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تو وہی متقدمین والا یعنی کلاسیکی اسلوب ہے جس میں قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی اپنے روائتی انداز میں رائج ہے۔ دوسرا اسلوب وہ ہے جو قدیم و جدید سے مرکب ہے۔ اس اسلوب میں وہ شعراء شامل ہیں جو افکار جدید کو قدیم ہیئت و انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ صرف و نحو، وزن و قافیہ اور معانی و بیان کی پرانی روایات کے پابند ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس اسلوب میں بھی تغیر نظر آتا ہے۔ وزن و قافیہ میں بھی اور مضامین میں بھی جدت آرہی ہے۔ تیسرا اسلوب بالکل جدید ہے اس میں کلاسیکی ادب کی روایات سے بغاوت ہے چونکہ شعری ادب زیادہ چھپتا ہے زیادہ لوگوں کے کانوں تک پہنچتا ہے اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ شعر کی زبان بھی ایسی ہو کہ سوسائٹی کے عام افراد بھی اس کو سمجھ سکیں۔ اس لئے پرانی وضع کی مشکل اور ثقیل بحروں کے بجائے نئی آسان اور طرب انگیز اوزان کو منتخب کیا گیا ہے۔ مغربی شاعری کی ہیئت اکثر شعراء کے مد نظر رہی ہے۔

جہاں یہ کوشش ہوئی کہ خیالات و افکار کو عام کرنے کے لئے زبان سادہ اور رواں استعمال کی جائے وہاں قومی تعصب کی بنا پر یہ تحریک بھی چلی کہ زبان کو عربی الفاظ سے پاک کیا جائے چنانچہ پارسی سرہ میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ تشکیل فرہنگستان نے اس تحریک کو اور فروغ دیا۔ چونکہ عوام فکاہیہ چیزوں کو پسند کرتے ہیں اس لئے عوام کی بولی میں بھی سیاسی امور پر طنز و ظرافت کے ذریعہ تنقید کی گئی یہ فکاہیہ نظمیں بھی بہت پسند کی گئیں۔ روائتی قصیدہ، مثنوی اور رباعی کے بجائے مسمط، ترکیب بند لکھے جانے لگے۔ ترانوں کا بھی رواج ہوا اور فارسی شاعری میں یہ ایک نیا تجربہ ہوا۔ موسیقی سے ہم آہنگ کرنے اور عوام کے لئے دل پسند بنانے کے لئے تصنیف سرود اور لطیف غزلیں بھی لکھی گئیں۔

تاریخ ایران کے ایسے سیاسی قطعی حوادث پیش آئے جن سے ہر دور میں ایک نیا زمانہ اور نیا ماحول پیدا ہوا۔ اس زمانے کو پانچ بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے اس دور میں شاعری بھی متاثر ہوتی رہی ہے۔

(1) پہلا دور 1314ھ سے 1324ھ تک (1896- 1906ء) یعنی ناصر الدین شاہ کے قتل سے اعلان مشروطیت تک۔

(2) دوسرا دور 1324ھ سے 1340ھ تک (1906- 1921ء) اعلان مشروطیت، رضا خان پہلوی کے برسراقتدار آنے تک۔

(3) تیسرا دور 1340ھ سے 1360ھ (1921- 1941ء) تک یعنی عہد رضا خان پہلوی اول۔

(4) چوتھا دور 1360ھ سے 1400ھ (1941- 1979ء) تک محمد رضا شاہ پہلوی کا دور سیاسی اور اجتماعی۔

(5) جمہوریہ اسلامی کی تشکیل کا دور 1979ء

تبدیلیوں کی وجہ سے ہر دور کی شاعری دوسرے دور سے جداگانہ خصوصیات رکھتی ہے۔ پہلا دور مظفرالدین شاہ کے عہد سلطنت پر مشتمل ہے۔ اس عرصہ میں ایرانیوں میں نئے سیاسی افکار اور وطنی اور قومی جذبات پرورش پا رہے تھے۔ اس زمانے میں اخبار و رسائل جاری ہوئے۔ نئی طرز کے مدرسے ہر جگہ برپا ہوئے، ترکیہ اور مغربی ممالک میں آمدورفت شروع ہوئی۔ روس اور جاپان کی جنگ میں جاپانیوں کی فتوحات سے لوگوں میں غرور ملی اور وطنی وقار کا خیال پیدا ہوا۔ ریل، تار، ٹیلیفون، موٹر اور دوسری نئی صنعتوں کا رواج ہوا۔ اور یورپ کے نئے علوم و فنون کو دیکھ کر لوگوں میں حیرت و تعجب کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ مستبد حکومت سے تنگ آگئے تھے۔ اور دوسرے ممالک کی انصاف اور قانون پر مبنی حکومتوں کے ساتھ اپنی حالت کا مقابلہ کرتے تھے، تہران، تبریز، اصفہان، مشہد اور دوسرے شہروں میں ہفت روزہ اور ماہنامہ رسائل جاری ہوئے۔ استامبول مصر اور ہندوستان سے بھی تربیت، اطلاع، حبل المتین، پرورش اور ثریا کے نام سے رسائل جاری ہوئے۔ ان میں وطن پرستی، مفاخر تاریخی، اتحاد دول اسلامی اور اروپائی مغربی علوم و فنون کی تحسین کے موضوعات پر نظمیں اور قصیدے شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بھی بادشاہ، وزیراعظم، امرائے سلطنت اور شاہزادے شعراء کی قدر و تربیت کرتے تھے۔ مرزا علی اصغر خان اتابک وزیری بھی شعر دوست اور شاعر نواز تھا۔ اس دور کے بڑے بڑے شاعروں نے بادشاہ اور وزراء کی مدح میں قصاید بھی لکھے ہیں۔

دوسرا دور یعنی مشروطیت کے پندرہ سال' یہ وہ زمانہ ہے جس میں استبداد کا دور ختم ہوا۔ مجلس' دفاتر اور وزارتیں بنیں۔ بے شمار رسائل و اخبار جاری ہوئے۔ فرانسیسی' انگریزی اور عربی جدید کی کتابیں اور ان کے ترجمے ایران میں عام ہوئے۔ سکولوں میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس دوران میں جنگ عظیم واقع ہوئی جس کی و؎ سے سارا جہان متاثر ہوا۔ ایران کا شاہ جو آئے دن یورپ کی سیاحت کو جاتا۔ حکومت نائب السلطنت یا وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتی مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو قبائل کے سرداروں نے اطراف سے بغاوتیں کیں۔ سیاسی پارٹیوں میں عجب کش مکش ہوئی۔ اختلاف آراء سے سارا نظام سلطنت مضمحل رہا اس دور میں شعرو سخن کا موضوع حکومت اور اس کے محکموں پر تنقید رہا۔ اجتماعی بدحالی کی اصلاح کے لئے فکر مندی۔ عورتوں کی افسوس ناک پستی پر اظہار اور آزادی اور مشروطیت کے قیام کے لئے جدوجہد جیسے موضوعات پر اکثر نظمیں لکھی گئیں۔ اسی زمانہ میں ابوالقاسم خان نائب السلطنت اور علی قلی خاں سردار سعد خان بختیاری کی تشویق سے علم و فضل کی قدرو منزلت ہوتی رہی۔ آقای حسن وثوق (جو دو سال تک ایران کے خودمختار حاکم بنے رہے) کے عہد سلطنت میں جرمنی کو شکست ہوئی۔ روس میں انقلاب برپا ہوا جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ آقای وثوق اور ان کے وزیراعظم احمد نصیر الدولہ خود بھی شاعر اور فاضل تھے۔ ان کے اپنے اشعار بھی رسائل و جرائد میں چھپتے رہے اور انہیں کے زیر اثر و تربیت شعرو سخن کی طرف توجہ بھی ہوتی رہی۔

تیسرا دور رضاخاں پہلوی کا دور حکومت تھا۔ دوسرے یورپی ممالک کی طرح ایران میں حکمران کی شان بھی ایک ڈکٹیٹر کی تھی۔ اس شہنشاہ کے عہد سلطنت میں حکومت کو وسعت حاصل ہوئی۔ وسائل **نقلیہ** کا رواج ہوا۔ جدید صنعتوں کا اضافہ ہوا فوجی نظام میں اصلاح اور ترقی ہوئی۔ سارے ملک میں عملاً ایک فرد واحد کی حکومت تھی بادشاہ کی جباریت سے سب ڈرتے تھے۔ اس لئے کسی کو اعلانیہ تنقید کی جرات نہ ہوتی تھی۔ پولیس اور سنسر کا ہوا سر پر سوار رہتا تھا۔ شعراء کے اشعار میں اس کی مدح و ثنا کا پہلو نکلتا تھا۔ بادشاہ شعر شناس نہیں تھے اس لئے مدح گوئی کا صلہ کہاں سے ملتا۔ اگر کسی شاعر نے حکام یا دفتر والوں کی زبردستی اور تعدی کی شکایت بادشاہ کے حضور میں اشعار میں لکھ کر بھیج دی تو شاعر داد رسی کی بجائے سزا کا مستوجب ہوتا کہ اس نے بارگاہ سلطنت میں زبان شعر میں کیوں گفتگو کی لیکن علی اکبر داور اور محمد علی فروغی جیسے بزرگوں کی علم دوستی کی وجہ سے بادشاہ کا رویہ کچھ اعتدال پر رہا۔ اخبار و

رسائل میں بہت کم نظمیں چھپتی رہیں۔

ایران میں شعرو شاعری سے عام بے اعتنائی کے باوجود کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے رہے جن کی وجہ سے ذوق ادب رکھنے والوں کا شوق قائم رہا۔ یورپ اور دوسرے بیرونی ممالک میں مستشرقین کی توجہ اور تحقیق کی بنا پر لوگ ایرانی ذہن سے آشنا ہو چکے تھے۔ اس لئے ایرانیوں کو اپنے بزرگوں کی عظمت کا احساس تھا۔ رضا شاہ کے زمانے میں فرانسیسی فاضل لوئی ماسیینون' انگلستان کے سرڈین سن راس' ہندوستان کے رابندر ناتھ ٹیگور' امریکہ سے پروفیسر پوپ اور روس سے پروفیسر اوربل ایران میں آئے۔ حکومت اور عوام کی طرف سے عزت و احترام سے ان کا خیر مقدم ہوا۔ ان مستشرقین نے بھی ایرانی فکر و نظر کی بلندیوں اور وسعتوں کی تعریف کی۔ اس لئے ایران کے اپنے ادباء اور شعراء میں شوق اور حوصلہ پیدا ہوا۔ 1353ھ (1934ء) میں فردوسی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی اور اس کے مزار پر ایک عمدہ اور نفیس عمارت بنائی گئی۔ دنیا بھر کے علماء اور شعراء نے شاہنامہ اور اس کے مصنف پر مقالات لکھے اور قصاید کہے۔ 1356ھ (1937ء) میں سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی گلستان و بوستان بڑے اہتمام سے چھپیں اور سعدی نامہ کے عنوان سے مجلّہ تعلیم و تربیت میں علمی و تحقیقی مقالات شائع ہوئے۔ حافظ شیرازی' سعدی' خیام' کمال اصفہانی' خواجو کرمانی' حمد اللہ مستوفی اور بابا ہمداخ کے مزاروں پر خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں۔ اس لئے بھی لوگوں میں شعراء کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔ شعراء کے دیوان تحقیق و تلاش' مقابلہ و تصحیح اور حواشی و **تعلیقات** کے ساتھ شائع ہوئے جن سے شعراء کا کلام عوام تک پہنچا۔ اس زمانہ میں ملک الشعراء بہار کی ہمت اور کوشش سے دانش کدہ کے نام سے ایک مجلّہ بھی جاری ہوا جو اس زمانے کی گویا علمی و ادبی تاریخ ہے۔ انجمن ادبی ایران کے نام سے ایک اور انجمن برپا ہوئی۔ اس میں آقای حسین سمیعی' رضا خاں نائینی۔ وحید دست گروی اور شاہزادہ ہاشم مرزا جیسے نامور شعراء اور استاد شامل تھے۔ اس انجمن کا ایک رسالہ "ارمغان" کے نام سے بیس سال تک علمی و ادبی خدمات انجام دیتا رہا۔ اسی زمانہ کے آخری سالوں میں وزارت تعلیم نے بھی شعرو سخن کی ترویج کے لئے توجہ دی۔ نوجوان طالب علم مجلس مشاعرہ میں اپنی نظمیں پڑھتے اور انعامات حاصل کرتے۔ ان تمام عوامل کی وجہ سے شعر کی روح زندہ رہی۔

چوتھا دور یعنی 1360ھ سے 1400ھ (1940- 1979ء) تک کا زمانہ ایک آزادی پسند زمانہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں جہاں سیاسی آزادی کے امکانات بڑھے اسی طرح دوسرے شعبوں میں آزاد افکار کی تجدید ہوئی' اشتراکی اصولوں کی تبلیغ ہوئی' کسانوں مزدوروں اور دوسرے طبقات کی

اقتصادی حالت کو سدھارنے اور حکومت کی خرابیاں دور کرنے کے خیالات عام ہوئے۔ جنگ عالمگیر دوم ختم ہوئی۔ جمہوریت کی فتح ہوئی۔ ایران نے بھی اقوام متحدہ کا ساتھ دیا۔ جنگ کے خاتمہ پر سیاسی اور اقتصادی انقلاب رونما ہوا۔ ان تغیرات کے ساتھ ساتھ ادب بھی ان تغیرات و اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس عہد میں اخباروں کی عام اشاعت سے شعراء کی توجہ فرد سے ہٹ کر سماج کی طرف مبذول ہوئی۔ اس زمانے میں پرانے اور نئے لکھنے والے اپنی قدیم و جدید روش میں طبع رسا کو کام میں لائے۔

19 بہمن 1349 ش ر 1961ء سے 22 بہمن 1352ش/ 1979ء تک شہنشاہی کے خلاف عوام کی مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔ فدائیان خلق اور مجاہدین خلق جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اس دور مبارزہ میں خارجی ادب کے ترجمے بھی ہوئے زیر زمین اور گروہی ادب بھی نظر آتا ہے چنانچہ اس زمانے میں دلاوران جنگی، مسلح جنگ، قید خانوں میں اذیت اور مجاہدین کو پھانسی چڑھانے سے متعلق موضوعات پر شعر لکھے گئے۔ یاس ونا امید کے بجائے روشن مستقبل کا امیدوار بنایا گیا۔ شعراء نے دریا، موج، طوفان، جنگل، کوہ لالہ، سرخ ستارہ، اور اسلحہ کی باتیں کیں۔ اس دور کے افکار و احساسات کی جھلک مجموعہ کلام ""شعر جنبش ہائے نوین"" میں ملتی ہے جو 1352ش/ 1948ء میں شائع ہوا۔

دورہ حکومت شہنشاہی میں شعراء کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ شعراء جو متقدمین کے کلاسیکی انداز میں لکھتے رہے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ اب بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے بزرگوں کی پرانی روش کے مطابق قصیدہ، غزل، قطعہ اور رباعی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مثلاً ادیب الممالک امیری، بہار، جلال ہمائی، وحید دتس گروی، حبیب یغمائی، لطف علی صورت گر، رعد تبریزی، پژمان، ادیب طوسی وغیرہ۔

دوم وہ شعراء جنہوں نے مغرب کی تقلید میں ہیئت و معنی دونوں میں نئی راہ پیدا کی انہوں نے پرانی روش میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مثلاً محمد حسین فروغی، علی اکبر دھنخدا، ایرج مرزا، پروین اعتصامی، عارف قزوینی، عشقی، صادق سرمد، غلام رضا روحانی بہار، فریدوں تو للی وغیرہ۔

سوم وہ شعراء جنہوں نے ہیئت تو پرانی رکھی لیکن معنوں کے لحاظ سے نئے افکار پیش کئے۔ بہار، فرخی یزدی، رعدی، رشید یاسمی، سعید **نفیسی**، موید شابتی، صور تگر، رہی **معیری**، نصراللہ فلسفی وغیرہ۔

موضوع کے اعتبار سے بھی شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے مثلاً

(1) اشعار وصفی۔ اس قسم کی اچھی نظمیں لکھنے والوں میں بہار، رشیدی یاسمی، وحید دست گرو رعدی، رہی **معیری** کا نام لیا جا سکتا ہے۔

(2) اشعار وطنی۔ اس موضوع پر ایران اور ایرانی یاد گاروں پر فخریہ اشعار کہے گئے ہیں اور وط پرستی کے جذبات کا اظہار جوش و اخلاص سے کیا گیا ہے پرانے اساتذہ میں سے طالبوف، ادیب الممالک، ادیب پشاوری، فرغی، عشقی، دانش مشہدی وغیرہ اور ایران قدیم کے آثار مناظر پر لکھ والوں میں بہار، صور تگر، جلال ہمائی، حسین مسرور معروف ہیں۔

(3) اشعار تاریخی۔ اس موضوع پروہ نظمیں ہیں جن میں ایران اور دنیا کے سیاسی و تاریخ انقلابات و حوادث کا ذکر ہے۔ مثلاً جنگ و صلح کنفرانس، قتل بادشاہ اور بنای حکومت نو وغیرہ۔ اس سلسلہ میں ادیب الممالک، شوریدہ، بہار، افسر، عشقی، فرخی یزدی، وحید دست گروی کی اچھی نظمو کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(4) اشعار مترجم۔ یہ وہ اشعار ہیں جو غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کئے گئے ہیں مترجمین میں سے حیدر علی کمال، نصراللہ فلسفی، رشید یاسمی، حسن وثوق الدولہ دکتر **خانلری** اور لاہوتی کے نا لئے جا سکتے ہیں۔

(5) سرمایہ و مزدور اور سوشلزم پر اشعار۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں سے فرخی یزدی لاہوتی رعدی، پروین گنابادی، علی اشرف دبیر، عشقی، کاظم رجوی کے نام معروف ہیں۔

(6) اشعار انتقادی۔ اس موضوع پر ان شعراء کی نظمیں شامل ہو سکتی ہیں جنہوں نے حکومت سرکاری اداروں اور اجتماعی خرابیوں پر تنقید کی ہے۔ مثلاً ادیب الممالک، علی اکبر دہ خدا، وحیدی دست گروی، سید اشرف گیلانی، غلام رضا روحانی وغیرہ۔

(7) اشعار اخلاقی۔ یعنی وہ نظمیں جو بری عادات و رسوم کی مخالفت اور تنقید اور اچھی عادات اور بلند اخلاق کی ترویج اور تشویق کے لئے لکھی گئیں۔ اس طرز کے اشعار میں بہار، ایرج مرزا، وحید دست گروی، حبیب یغمائی، جلال ہمائی، رعدی، پروین اعتصامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موضوع پر ترکیب بند، مسمط، قطعات اور فکاہی نظمیں اکثر رسائل و جرائد میں بھی چھپتی رہتی ہیں۔

(8) نسائیات۔ اس عنوان پر عورت کے سیاسی اور اجتماعی حقوق کی نگہداشت، جنس لطیف کے بلند مقام اور آزادی پر بہت سے اشعار لکھے گئے ہیں۔ مثلاً پروین اعتصامی، ژالہ اصفہانی، جنت

تہرانی، بہار، حسین سمیعی، ایرج مرزا اور روحانی وغیرہ کے اشعار قابل قدر ہیں۔

(9) اشعار صنائع عصری۔ اس موضوع پر عصر حاضر کی اختراعات اور ایجادات کے متعلق شعراء نے نظمیں لکھی ہیں۔ یہ خاص خاص نظمیں مجدی کردستانی، ابوالحسن مرزا، فروزانضر، صورتگر، روحانی، حسین شجرہ اور افسر کے فکر کا نتیجہ ہیں۔

(10) اشعار تربیتی۔ یعنی بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدارس اور نئی درسگاہوں کے متعلق اشعار۔ اس عنوان پر مندرجہ ذیل شعراء کے قطعات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عبدالعظیم قریب، سمیعی، ہدایت، محیط طباطبائی، ادیب طوسی، جلال ھمائی، ابوالحسن فروغی وغیرہ۔

(11) اشعار موسیقی۔ وہ نظمیں جو موسیقی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں مثلاً تصنیف، ترانہ اور سرود وغیرہ۔ اس قسم کی نظموں میں عشقیہ، طنزیہ اور انقلابی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں بہار، عارف، امیر جاہد، افسر، گل گلاب اور قریب مشہور ہیں۔

ملک الشعراء بہار نے طبقہ دوم میں شامل شعراء کے متعلق مندرجہ ذیل نظم میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے۔

بدعت افگندز چندی ز اہل ہوش
سبک ہائی تازہ با جوش وخروش
لیک زشت آمد بگوش

سہ بسر تصنیف عارف لیک بود
سبک عشقی ہم بدان نزدیک بود
شعر ایرج شیک بود

نیک بودند این سہ تن از اتفاق
درفن خود ہر سہ قاآنی مذاق
گاہ لاغر گاہ چاق

بود ایرج پیرو قائم مقام
کردہ از او سبک و لفظ و فکر دام
عارف و مشقی عوام

احمدای، سید اشرف، خوب بود
احمدا گفتن از و مطلوب بود
شیوہ اش مرغوب بود

سبک اشرف تازہ بود و بی بدل
لیک ہپ ہپ ناز بودش دربغل
بود شعرش منتحل

بعد از آنہا گشت روحانی ے علم
آں کہ در شعرش اجنہ زد رقم
خوب گوید لیک کم

دیگری پژمان و دیگر شہریار
شعر ہاشان تازہ است و خوشگوار
ہر دو لیکن کند کار

قطعہ ہای افراز روی یقین
ہست طرز قطعہ، ابن یمین
لیک محدود است این

شعر سرمد هست شیرین چون عسل
چامه و قطعه، دوبیتی و غزل
شیوه اش نامنتحل

نور ترین سکی که در دست شماست
بار اول از خیال بنده خاست
دفتر و دیوان گواست

شعر کہنہ و نو

جب اردپائی شاعری کے ترجمے ہوئے اور ایرانی ذہن نئی ہیئتوں اور نئے افکار و احساسات سے آشنا ہوا تو نوجوانوں نے اپنی زبان میں بھی اسی طرز و ہیئت میں تجربے شروع کئے ملک میں سیاسی و تمدنی بدلتے ہوئے حالات نے بھی لکھنے والوں کو قدیم روائتوں سے بغاوت پر آمادہ کیا اور انہوں نے صنف شاعری کی مروجہ ہیئتوں، بحور و اوزان اور بیان و بدیع کے **تکلفات** کو خیرباد کہہ کر بے قافیہ نظمیں لکھنا شروع کیں۔ پرانی تشبیہات اور روائتی استعارات کے بجائے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں وجود میں آئیں نئی روش کے حامیوں نے اپنے تجریدی خیالات کو مبہم انداز میں پیش کیا۔ اور بعض نظمیں بے آہنگ نثر بن کر رہ گئیں۔ کلاسیک انداز کے پیرو بزرگوں کو ایسی جدید شاعری پر غصہ آیا اور انہوں نے ایسی نثرنما شاعری کا مذاق اڑایا۔ مدتوں تک بحثیں چلتی رہیں۔ احمد کسروی نے در پیرامون شاعری، ایک مقالہ لکھا اور شاعری میں نئے رجحانات پیدا کرنے کی تلقین کی۔ وحید دست گروی نے انقلاب ادبی کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور نئی شاعری کے دلدادوں کی مذمت کی، ابھی تک یہ بحثیں جاری ہیں۔ اخبار اور رسائل میں مخالف و موافق رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ نئی طرز کے حامیوں نے کہا کہ قدیم شاعری پرانے ماحول کی پیداوار تھی۔ لوگ اپنے اپنے زمانہ کے مطابق سوچتے اور لکھتے تھے۔ اب مدحیہ قصاید کا عہد گیا۔ رزمیہ مثنویوں کی تشبیہات واستعارات بھی مکروہ و ناپسندیدہ ہو گئے۔ سخت قافیوں اور بے حبا ردیفوں کی پابندیوں سے معانی و مطالب بیان کرنے میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب نئے قسم کے مناظر دریا، پہاڑ نئے مشاہدات، حسن وجمال کی نئی زیبائشیں، عقل اور فکر کے نئے تجربات اور

نئے معاشی اور معاشرتی مسائل بیان کرنے کے لئے آسان اور بلیغ شاعری کی ضرورت ہے۔ بحور و اوزان کی پابندی اور قصیدہ و غزل کی ہیئت اظہار خیالات میں رکاوٹ پیش کرتی ہے۔ قدیم روش کے حامیوں نے کہا کہ نئے شاعروں نے بے قافیہ نظمیں لکھ کر اور قافیہ وزن کی پابندی چھوڑ کر آہنگ و موسیقی کا تانا بانا بکھیر دیا۔ ایک ہی نظم میں چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے اشعار میں متانت اور استواری نہیں رہتی۔ ایسے اشعار حافظہ میں بھی محفوظ نہیں رہتے۔ ان کے مطالب سمجھنے میں بھی عقید پائی جاتی ہے۔ نادر پور نے شعرنو کی حمایت میں اپنے مجموعہ کلام چشم ہا و دست ہا کے دیباچے میں، فریدوں تو للی نے اپنے مجموعہ کلام "رہا" کے دیباچے میں شعرنو کی حمایت میں دلائل پیش کئے ہیں اور کہا ہے کہ دنیا کی وسیع و غنی زبانوں میں نظم عاری نظم بے قافیہ کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ افکار نو کے لئے ہیئت نو اور کلمات نو ہی موزوں اور مفید ہو سکتے ہیں۔ نئے رجحانات سے متاثر اور نئے افکار کے مدعی لیکن کلاسیک طرز میں لکھنے والے شعرء کی یہ رائے عام پسند کی جاتی ہے کہ خیالات میں تو بے شک جدت ہو اور قومی و ملی ضرورتوں کا بھی خیال ہو لیکن وزن و قافیہ کی پابندی ضرور برقرار رکھی جائے۔ چنانچہ اسی نظریہ کی حمایت کی جا رہی ہے۔

روزنامہ تجدد (تبریز) اور مجلّہ **آزادیستان** (تبریز) میں تقی رفعت بانو شمس کسمائی اور جعفر خامنہ ای نے تقریباً 1297- 1300 ش کے درمیان فرانس اور ترکی میں نئی شاعری کے زیر اثر ایسی منظومات شائع کیں جن میں پرانی ادبی روایت سے انحراف تھا۔ ہیئات بھی نئی تھی اور موضوع بھی نیا۔ مصرعوں کو چھوٹا بڑا کیا اور قوانی کی پابندی بھی نہ کی۔ عشقی اور رشید یاسمی نے قدیم مروجہ قالبوں میں ترمیم اور تجدید کر کے اپنے اشعار کو نئی **شکلوں** اور نئے قالبوں میں پیش کیا۔ بعد کے شعراء میں نیما کا نام سرفہرست ہے جس نے شعر جدید کے اس اسلوب کو ایک تحریک کے طور پر پیش کیا اور اس کو رواج دیا۔ اکثر نوجوان شعرا نے اس کی پیروی کی۔

نادر نادر پور نے شعرنو یا شعر امروز کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے، مزید توضیح و توجیہ کی خاطر اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شعرنو یا شعر امروز

نادر نادر پور نے شعر انگور، کے دیباچے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ آج کل دو قسم کے اشعار ہیں۔ شعر نو اور شعر کلاسیک لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں شعر نو کے سوا اور جو کچھ استادان قدیم کی تقلید میں لکھا جا رہا ہے وہ شعر نہیں۔

شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی حوادث و مشکلات کا ان کے وقوع سے قبل یا ان کے ہم عصر احساس کرے۔

شعر نو میں دو اصول واضح ہونے چاہئیں۔ 1- دید تازہ۔ 2- یافت تازہ۔

دید تازہ سے مراد اشیاء و موجودات کا نیا احساس و ادراک ہے۔ شاعر زندگی اور قدرت کے نئے نئے گوشوں کو آشکار کرنا ہے۔ شاعر کا احساس و ادراک نیا ہوتا ہے تو اس کا بیان، تعبیرات، کلمات اور ترکیبات بھی تازہ ہوتے ہیں۔

محض پرانی ہیئتوں کو توڑنا، مصرعوں کو چھوٹا بڑا کرنا، قافیوں کو ترک کرنا۔ تجدید و تجدد کی دلیل نہیں۔ جس کسی نے بے قید و بند شعر کہے وہ شاعر نو پرواز نہیں کہا جا سکتا۔ پرانی ہیئتوں میں نئے شعر کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً شہریار کی غزلیات اور دکتر رعدی کا قصیدہ "زگاہ" ہم غزل و قصیدہ یا شعر آزاد کے مخالف نہیں لیکن چاہتے ہیں کہ ہیئت اور مضمون کا تناسب سمجھا جائے اور مظروف کو مناسب ظرف میں رکھا جائے۔

3 شہریور 1320 کے بعد نوجوانوں میں ایک تبدیلی آئی وہ پرانی نسل کے مراسم چھوڑ کر تجدد کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن اروپائی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان میں ابھی مشرقیت کے آثار باقی تھے۔ اس لئے بھی ان کی حیثیت دوغلی تھی۔ نئی نسل کے شعراء میں وحشت، ہراس، اندوہ، مرگ، بیگانہ، ناشناس، ناپائیدار قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔ جس سے احساسات اندرونی منعکس ہوتے ہیں۔

دور مشروطیت کے ابتدائی زمانے میں اجتماعی اور سیاسی مسائل پر موزوں کئے گئے اشعار ایک طرح سے اخباری مقالات سے مشابہ تھے۔ 1320 کے بعد شعراء شخصی احوال و کوائف کی طرف مائل ہو گئے۔ قبل الذکر دوسرے شعراء مثلاً ادیب الممالک اور بہار کے کلام میں جوش و خروش اور ہیجان پایا جاتا ہے۔

1322 میں ڈاکٹر پرویز خانلری نے صادق ہدایت، ڈاکٹر شعید نورانی اور رضا برجانی کی اعانت سے مجلہ سخن جاری کیا۔ اس میں شعر، شاعری کے بارے میں مقالات شائع ہوئے اور اروپائی شعراء میں سے بودلر اور ریلکه کی منظومات کے تراجم شائع ہوئے اور دوسرے نئے لکھنے والے

ممتاز صاحب طبع شعراء کا کلام شائع ہوا۔ تو للی درمیان شاعران ہم نسل، خود انیما، خانلری، گل چین، لاہوتی، پس از یما بیش از ہم، بر روئی شاعران نسل سالدیدہ و نسل جوان کنوں شمرد۔

1323ھ /1944ء میں دکتر خانلری نے اپنے مقالہ، شعر نو میں لکھا ہے کہ شاعر وہ ہے جو زندگی سے نئے اور خصوصی مطالب اخذ کرے اور ان کو بیان کے قالب میں ڈھالے اور دوسروں تک منتقل کرے، پھر 1325ھ بہ مطابق 1946ء میں جوانہ ہای شعر نو کے عنوان سے لکھا اور بتایا کہ نوجوان نئے موضوعات تلاش کرتے ہیں اور بیان کے نئے اسلوب کام میں لاتے ہیں، اگرچہ اس کوشش میں وزن و قافیہ کو توڑتے پھوڑتے ہیں۔ فصاحت کا خیال نہیں کرتے۔ پھر بھی ان کی طفلانہ کوششوں سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم مضامین کی تکرار اور تقلید سے بیزار ہیں۔

اسماعیل نوری علا نے اپنی کتاب "صور واسباب در شعر امروز ایران" میں 1320ھ /1941ء سے 1321ھ - 1968ء کی شاعری کا تجزیہ و تحلیل پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں نیما کے تتبع میں شعر جدید کے پیشرو منوچہر شیبانی اور اسماعیل شاہرودی شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کچھ ایسے شاعر نمودار ہوئے جو نیما کی روش کی مطابقت کے ساتھ نئی راہیں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ان میں سے احمد شاملو (ا۔ بامداد) اور سہراب سپہری کا نام لیا جا سکتا ہے اسی زمانے میں دو اور ابھرتے ہوئے شاعر لکھنے میں مصروف تھے جو میانہ روی کے قائل تھے اور شعر قدیم ایران سے بھی متاثر تھے اور شعر میں ابہام سے اجتناب کرتے تھے۔ ان میں ہوشنگ ابتہاج (ا۔ ملیه) اور سیاوش کسرائی نامور تھے۔ مہدی اخوان ثالث (م - امید) شعر آزاد کے تو قائل ہیں لیکن سبک خراسانی اور سبک مازندرانی کے بین بین چلتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں جو شعر کے نئے اسلوب کے ساتھ نئے مضامین لانے میں کوشاں تھے، ان میں سے نصرت رحمانی، یداللہ رویائی اور فروغ فرخزاد معروف ہیں۔ ان شعراء میں جو نئے نئے اسالیب کے امکانات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ محمود مشرف آزاد کا نام سربرآوردہ ہے اور جو شاعر پیکر تراشی (تصویر سازی) کو اہمیت دیتے ہیں ان میں سہراب سپہری کا نام لیا جا سکتا ہے۔

نادر نادر پور شعر نو کے مروج شمار ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم روایت سے نہیں ہٹنا چاہتے نئے اجتماعی تحول کے زیر اثر شعر میں ایک موج نو، وارد ہوئی۔ اس نئی تحریک کے ہیرو محمد علی سپانلو شمار ہوتے ہیں۔ وہ اسماعیل نوری، موج نو، سے متعلق لکھتے ہیں۔

1- شاعر بہ بارهای اجتماعی و تاریخی ادوات شعری نظر دارد۔

2- شاعر شکل ترکیبی این ادوات را مورد توجہ قرار مید۔

3- قدرت خیال انگیزی ونیز تجسم آنهار امور و استفاده قرار می دہد-

شعرائے عہد جدید کے مجموعہ ہائے کلام مشکل سے ہی دستیاب ہوتے ہیں- اس لئے ان کا تعارف صور و اسباب در شعر امروز' اور ادبیات دورہ بیداری ومعاصر کے توسط ہی سے پیش کیا جا سکا ہے-

احمد شاملو (ا- بامداد) متولد 1304ھ/ 1925ء

شاملو خود کہتے ہیں کہ شعرو شاعری سے مجھے خاص لگاؤ نہیں تھا- نیما نے مجھے شعر کی حقیقت سمجھائی اور میں ان کی "ناقوس" پڑھ کر ادھر مائل ہوا- وہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک شاعری ضائع شعری پر تسلط سے نہیں آتی بلکہ میرے خیال میں شعر کا ایک قالب شاعر کے ذہن میں آتا ہے- نقاشی' شعر اور رقص کا ایک ہی مفہوم ہے- اصل مقصد خیال و فکر کی دریافت ہے- پھر اس کا بیان ہے- شاملو شعر سپید (شعر معرا یعنی بے وزن شعر) کے حامی ہیں-

شاملو کا پہلا شعری مجموعہ "آہنگ ہائے فراموش شدہ" شائع ہوا- کسی نے اس کی طرف اعتنا نہ کیا- دوسرا مجموعہ "آہن ھا واحساس" تھا- اس کو بھی کامیابی نہ ہوئی تیسرا مجموعہ "قطعنامہ" کے عنوان سے شائع ہوا- اس میں اکثر اشعار تند اور اجتماعی شعور کے حامل تھے- اس کتاب کے بعض اشعار ادھر ادھر شائع ہوئے- چوتھا مجموعہ "ھوای تازہ" کے چھپنے سے معلوم ہوا کہ وہ محض نیما کا مقلد نہیں بلکہ خود بھی نئی چیزو کی تلاش میں ہے- پانچواں مجموعہ "باغ آئینہ" کے شائع ہونے سے شاملو کا کافی چرچا ہوا- لوگ اسے شاعر مردم کہنے لگے- ھوای تازہ میں سے ایک نمونہ دیکھئے-

برف آب شد' شگوفہ رقصید' آفتاب در آمد
من بخوبی ھانگاہ کردم و عوض شدم
من بخوبی ھانگاہ کردم
چراکہ تو خوبی واین ہمہ ی اقرار حاست' بزرگتہ ین اقرار حاست

چھٹا مجموعہ "ایدا در آئینہ" کے عنوان سے 1350/ 1971ء میں شائع ہوا- اس مجموعہ کے اشعار میں آگ زیر خاکستر چھپ گئی ہے- شاعر کے فکر پر غم و تاسف چھا گیا ہے- وہ زیادہ سنجیدہ ہو گیا ہے- مثلاً

جنگل آئینہ ھافرو ریخت
ورسولان خستہ بہ بہار شہیدان پیوستند
وشاعران بہ تبار شہیدان پیوستند
چونان کبوتران آزاد پروازی کہ بہ دست غلامان ذبح می شوند

ساتواں مجموعہ "ققنوی درباران" کے نام سے شائع ہوا- اسمیں شاملو پختہ تر اور دانا تر ہو گیا- وہ اپنے تجربات نژاد نو کے سامنے پیش کرتا ہے-

8- قطعنامہ: 1360ھ

شاملو کے اور بھی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں- 1348 میں مرثیہ ھای خاک' 1349 میں شگفتن درمہ' 1352 میں "ابراہیم در آتش" 1353ھ میں ھواو آئینہ ھا' 1256 میں "دشنہ در دیس" شائع ہوئے- ان مجموعوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات میں تحول آرہا ہے- اجتماعی اور حماسی مضامین سے ہٹ کر عاشقانہ موضوعات آرہے ہیں- آخر میں اس کے افکار فلسفیانہ عمیق اور علاقائی ہوئے جاتے ہیں- اجتماعی اور غنائی دونوں قسم کے موضوعات ملے جلے ملتے ہیں- آخری مجموعہ "دشنہ در دیس" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اشعار پر تحرک زندہ اور روبہ ت کامل ہیں-

شاملو نے عوامی لہجہ اور بولی میں شعر کہے ہیں- مثلاً پرج' دختر ای تنہ دریا قابل اعتنا نظمیں ہیں- اس نے مغربی منظومات کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا-

b Passage ناول کا فارسی ترجمہ "برزخ" کے نام 1334 میں شائع کیا- احمد شاملو شعر کے ہدف وموضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

امروز شعر حربہ خلق است
زیراکہ شاعران
خودشاقہ ای زجنگل خلقند
نہ یاسمین نہ سنبل گل خانہ فلان

وہ کہتے ہیں- شعر یعنی' دست نہادن بہ جراحات شہر پر وقصہ سردادن برای تیب از صبح دل پذیر است' شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ شہرو دیار کے دکھوں کو بیان کرے اور دکھیا دلوں کو

خشنود کرے۔ شاعر خالی اور ٹھنڈے دلوں میں زندگی کی امنگ پیدا کرے اور اسی طرح آگہی و بیداری عطا کرے۔ وہ اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میری کامل خود نوشت ہے۔ شعر سے مراد زندگی کے تاثرات نہیں بلکہ وہ خود یکسر زندگی ہے۔ تنگ دستی اور ناانصافی کے واقعات خیالی نہیں بلکہ بیداری میں مجھ پر گزرے ہیں۔

اسماعیل شاهرودی آینده

شاہرودی کے پہلے شعری مجموعہ آخرین نبرد (1330ش) کے دیباچے میں نیما یوشیج لکھتے ہیں۔ تمہیں توفیق حاصل ہو تو ان زنگ آلود طولانی زنجیروں کو توڑنے کے لئے آخری نبرد کرو۔ جنہوں نے تمہاری اور تمہارے ابنائے جنس کی زندگی کو جکڑ رکھا ہے نیما نے یہ بھی لکھا تھا کہ پانچ چھ سال کے بعد تمہارا فن اور ٹیکنیک ترقی کرے گا۔ شاہرودی نے اپنے دوسرے مجموعہ آینده (1346) میں خود لکھا۔

چنان بودم که در هر رهگذر و هر جا گذ شتم
بیگانگان را سوخت رنج من، تلاش، شتاب من
رسید آخر که رنج من بپوشانم بشادی های هستی
به امان هو سهایت نهادم سراسر دوائی ام را

شاہرودی زندگی سے وابستہ ہے وہ زندگی کی گیرو دار میں حالت تشنج میں ہے۔ مقصد و مسلک میں جس قدر ایمان محکم ہوتا ہے اس قدر احساسات برافروختہ ہوں گے اور فن بھی مقبول ہو گا۔ وہ آینده' میں اپنے دل و دماغ کی کیفیات کا یوں اظہار کرتا ہے۔

در درون دل بی آرامم
که زلسیار کسان ست نهان
جای خون است روان، از همه سو
آتش سرکش و سرگردان
از دم آتش من و زگل اوست
دل دنیائے دل من گلشن
باز بان آدری اوست که هست

ره آینده به چشم روشن

اس کے دو اور شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ہرسوی راه راه راه.....ای میقات نشین (1351) شاہرودی کہتا ہے کہ جب تک کوئی حادثہ یا واقعہ پیش نہیں آتا جو روح و دل کو گرمائے تو شعر میں تب و تاب نہیں آتی۔ نہرو کی وفات پر اس کے ہیجان کے لئے ایک بہانہ ہاتھ آیا تو اس نے لکھا!

نهرو برای آتش من بستر من است
و آتش است او در من
و خاکستر من است

ڈاکٹر حمید زریں کوب لکھتے ہیں: "شاہرودی شاعر مردم است و شعر خود را همه جا وقف انسان و عشق به انسان ها کرده است۔"

منوچہر شیبانی

1321 ش ر 1942ء سے شاعری شروع کی۔ 1323/ 1944ء میں "جرقہ" کے نام سے مجموعہ کلام شائع کیا۔ پھر 1343/ 1964ء میں "آتش کده خاموش" کے نام سے دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔ آخر میں "سرابہائی کویر" کے نام سے تیسرا مجموعہ شائع ہوا۔ منوچہر تصویر ساز موضوعی ست که در مخیله او جان می گیرد و عناصر آن به شدت به فعالیت می افتند و خیال او از راه تداعی معانی و تشبیه سازی به ترسیم حرکاتی سریع و تند می پردازد۔

شعر شیبانی' باوجود' زبان درهم ریخته و ناهموارش' دارائی شکل قابل دقتی ست لحن و وزن و ضربان شعر او به مقتضای معنی و ضرورت حال کلام تفسیری کند و این تفسیر بسیار طبیعی و راحت است۔

محمد علی سپانلو می گوید:

"مسئله ی بیان گسترده و در عین حال مفهوم شعرهای شیبانی بهترین طرز موجود بیان برای نمائش نامه های منظوم را که جای آن در ادبیات امروز ما خالیست ارائیه می دهد۔"

حمید زریں کوب نے لکھا ہے:۔ شیبانی نماینده نسلی است که زندگی و دنیای قدیم برایشان رویا

انگیز و لذت بخش است ہر چند محتوای شعر شیبانی صد در صد شعر اجتماعی امروز نرسیدہ اماسعی میکند سطحی از آن را درابیاتی توصیفی اراۂ می دھد

زبان او پرتوان و پر تحریک است

فروغ فرخ زاد

فروغ 1312 ش ر 1933ء میں پیدا ہوئی۔ دبیرستان کے تیسرے سال میں تھی کہ شادی کرلی۔ اس کے شوہر بڑے مہربان، ہمدرد اور ہنر دوست تھے۔ اس نے خیاطی کی تعلیم بھی حاصل کی اور ہنرستان کمال الملک میں مصوری بھی سیکھی۔ 1345 ش ر 1966ء میں کار کے حادثہ میں فوت ہوئی۔ اس کے مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے۔

اسیر 1334ھ، دیوار: 1336ھ اور عصیان: 1337ھ

تولدی دیگر: ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ شاعر زندگی کی دیوار میں اسیر ہے اور عصیان کے راستے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ لیکن تولدی دیگر میں وہ فلسفہ تجدید حیات لئے ہوئے منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے افکار میں وسعت آئی ہے اور وہ مفکر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔ اس نے عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر سخت تنقید کی ہے۔

فروغ نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی۔ معاشرتی روایات کی پروا کئے بغیر وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتی تھی۔ اس دلیری و بیباکی کی وجہ سے ان کا نام زبانوں پر آنے لگا۔ فروغ نے لکھا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسیر، دیوار اور عصیان جیسی کتابیں شائع کیں کیونکہ ان تینوں کتابوں میں، میں نے بیرونی دنیا کو بیان کیا ہے اس زمانے میں شعر میرے اندر تحلیل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ شوہر، معشوق اور آدمیوں کی طرح تھوڑی مدت کے لئے میرے گھر میں رہتے تھے۔ فروغ کو زندگی اور فن سے عشق تھا لیکن اسے شکست و ناکامی کا سامنا ہوا۔ اس لئے وہ ہر چیز کے خلاف طوفان کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ وہ گناہ کی طرف راغب تھی وہ درد و سوز و فراق و تنہائی سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ فروغ کو یقین تھا کہ شعری زندگی بوجودمی آیدو شاعر باید زندگی شاعرانہ داشتہ باشد۔

تولدی دیگر میں فروغ ہمہ چیز را با دیدی رو شنگرانہ می بیند۔ اندیشہ اش ورای جسم است و دیگر بہ خود و بہ تین خود نمی اندیشہ بلکہ بہ چیزی وسیع تر فکری کند۔ بہ اجتماع بہ زندگی بہ ہستی و بہ

انسان۔

فروغ بیباکی سے جنسی تلذذ کی بات کرتی ہے مثلاً:

ہمسلیہ روی سایہ ای خم شد
در نہا نگاہ راز پرورشب
نفسی روی گونہ ای لغزید
بوسہ ای شعلہ زد میان دولب

اپنے ر کی دفاع میں مردوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔

ولی ای مرد، ای وجود خود خواہ
مگو ننگ است این شعر تو ننگ است
برای شاعری شوریدہ چون من
ندانی این قفس تنگ است تنگ است
مگو شعر تو سرتاپا گنہ بود
ازین ننگ و گنہ پیمانہ ای دہ
بہشت و حور و آب کوثر از تو
مرا در قصر دوزخ خانہ ای دہ

رضا براہنی فروغ کے بارے میں لکھتا ہے:

"درفرخزاد یک من وجود دارد کہ حاکم بر ہمہ چیز است۔ این من یک من تغزلی است کہ گاہی سراجتماعی در می آورد و گاہی سراز فلسفہ۔"

فروغ خود کہتی ہے:

"کار ہنری یک جور تلاش است برای باقی ماندن ویاباقی گذاشتن خود و نفی معنی مرگ۔"

من، من کہ ہیچ گاہ
جز باد بار کی سبک و دلگرد
بر پشت بامہای مہ آلود آسمان
چیزی نبودہ ام
و عشق و میل و نفرت و در دم را
در غربت شبانہ ی گورستان

موشی بنام "مرگ" جویدہ است
"فرخزاد در عرفان در عشق در نفرت وحتی در طنز ہمیشہ بہ این آگاہی مجہنداست وعین آگاہی است
کے خامی را قابل بخشش می کند۔" (صورو اسباب در شعرامروز ص 29)

امید۔ مہدی اخوان ثالث:۔

اخوان نے ابتدائی زندگی مشہد میں گزاری جہاں اس کے والد تاجر تھے۔ وہیں وہ کلاسیکی شعرا سے آشنا ہوئے اور وہیں انہوں نے پرانے اسلوب میں قصیدہ اور غزل میں اشعار لکھے۔ ان کا پہلا مجموعہ اشعار ارغنون' کلاسیکی روایت کا نمائندہ ہے بعد میں وہ تہران آئے اور نیما سے آشنا ہوئے اور اس کی روش پر لکھنے لگے۔ ان کا دوسرا مجموعہ 1335 ش میں "زمستان" کے نام سے شائع ہوا اور وہ شاعر نو پرواز کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ 1338 میں "آخر شاہنامہ" 1345 میں " ازین اوستا" شائع ہوئے۔ ایک اور مجموعہ "پائیز در زندان" کے نام سے 1348ھ میں شائع ہوئے جس میں 1345 سے 1347 تک کا کلام محفوظ کیا گیا اس کے بعد جرائد و رسائل میں متفرق کلام چھپتا رہا۔ قالب واسلوب کے اعتبار سے اخوان نیما سے بھی ایک قدم آگے رہے۔

اخوان شعر میں وزن کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"وزن چیزی نیست کہ ازخارج بہ شعر تحمیل شدہ باشد بلکہ ہم زاد و پیکرہ روحانی و جسمانی شعراست۔ شعربدون قافیہ تعادل و توازن و تناسب خود ار از دست می دھد"۔ "اخوان زبانی کامل "مستقل و تازہ بوجود آوردہ۔"

ذہین اخوان پر شور وناآرام و مبتکرو آفرینندہ است۔

اخوان کے خیال میں شعر"داد نامہ "اور"فریاد نامہ " ہے جو ظالموں کی آنکھ کا کانٹا بنتا ہے۔ اور مظلوموں کی فریاد ہے۔ شعر انسانوں کے لئے روحانی پناہ گاہ ہے۔ اخوان کہتے ہیں کہ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ تفکر و تائل سے کام لے اور اپنے محیط سے غافل نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں " من اصلاً آدم ہای کہ خالی از تائل خالی از اندیشہ و تفکر نسبت بہ زندگی وہستی و محیط اطراف خود باشند در حقیقت آدم نمی دانم۔"

اخوان کو انسانوں سے محبت ہے۔ ان کے غموں ناامیدیوں اور خوف و ہراس کو پہچانتا ہے اور ان کے درد عاالم کو دیکھتا ہے اور اپنے مجروح دل سے فریاد کرتا ہے۔

حوشنگ ابتہاج سایہ:۔

ابتہاج 1306 ش ر 1927ء کو رشت میں پیدا ہوا سکول میں ہی تھا کہ شعر موزوں کرنے لگا ابتہاج کا پہلا مجموعہ کلام 1335 ش میں "نخسیتن نغمہ ہا" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں تقریباً تمام منظومات قدیم اسلوب میں تھیں۔ دوسرا مجموعہ "سراب" کے نام سے شائع ہوا ابتہاج' فریدوں تو لل' نادر نادر پور اور گل چین گیلانی جیسے میانہ رو شعراء سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس میں مضامین اور قالب کے اعتبار سے نئے رجحانات کی جھلک تھی۔ اس نے اکثر دوبیتیاں لکھیں لیکن عروضی سرحدوں سے باہر نہیں نکلا۔ تیسرا مجموعہ "شب گیر" کے نام سے 1332ھ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں نیما کے نئے اسلوب سے متاثر ہو کر بے وزن و قافیہ قطعات لکھے ہیں۔ نادر نادر پور کے تجزیہ کے مطابق قطعات میں حدیث نفس کی بجائے اجتماعی مضامین آگئے ہیں لیکن ان کا رنگ وعظ و نعروں کا ہے۔ سایہ کی طبیعت ان قطعات میں تابناک نظر آتی ہے۔ جن میں تغزل کا عنصر زیادہ ہے سایہ کے دیگر شعری مجموعے حسب ذیل ہیں۔

سیاہ مشق' 1332' زمین سیل' 1334' چند برگ از یلدا' 1344' شب گیر' 1360' یاد گار خون سرد' 1360۔

سیاوش کسرائی (کولی):۔

کسرائی کا پہلا مجموعہ شعر 1328 ش میں شائع ہوا۔ نادر نادر پور لکھتے ہیں کہ کسرائی کا تخیل شعری قوی ہے۔ اس کی تشبیہات خوش رنگ اور شگفتہ ہیں۔ اس کے دو بیتی اور ترانے مضامین لطیف کے حامل ہیں۔ اس کا دوسرا مجموعہ "خانگی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے مضامین میں تنوع ہے اور وہ تغیر کا آرزو مند ہے۔ زندگی کے محسوسات سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے۔ کسرائی کے دوسرے مجموعہ ہائے شعری حسب ذیل ہیں۔

آرش کمانگر' 1338' خون سیاوش' 1342 - بادماوند خاموش فرہنگ' 1345۔

محمد علی سپانلو:۔

سپانلو کا پہلا مجموعہ کلام ۱۳۴۸ھ ــــ بیابان" تھا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ شاعر کی کوشش ہے کہ وہ ہر شخص کے میلان کے مطابق بات کہے۔ دراصل وہ اپنا تعارف کرانا چاہتا

ہے۔ محمود آزاد نے لکھا ہے۔ "این مجموعہ باہیچک آز آثار اولیہ شعرا قابل مقالیہ نیست"

دوسر مجموعہ "خاک" کے نام سے 1344 ش میں شائع ہوا۔ اس کے متعلق وہ خود کہتا ہے۔ "درخاک' من زیا دردی نکردہ ام' زیادروی این کار کردہ ام کہ فیلی بیاد بیادرم کہ خودم را نیست بہ موئدلیت کہ مغزم بہ ذھن' رویاو تداعی دارد' مبراکنم۔"

تیسرا مجموعہ کلام 1346 میں دیوان "رگبا رہا" کے نام سے شائع ہوا۔ سپانلو کا عقیدہ ہے کہ قدیم ورثہ ہمارے وجدان ہمارے حافظہ' ہماری زندگی اور ہماری روایات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے ایسی دنیا ہے جو متمول ہے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر روز نئے نئے مسائل کا سامنا ہوتا ہے کبھی یہ دنیا ہمارے ساتھ موافق ہوتی ہے۔ اور کبھی مخالف۔ انہی احوال و کوائف سے شعر میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

سہراب سپہری:۔

پہلے مرحلے میں شعر نو کے حامیوں میں سپہری کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں اس نے مکتب "تصویر سازاں" کی بنیاد رکھی۔ تیسرے مرحلے میں "عرفان گرایان" کو وجود میں لایا۔ مرگ رنگ' (1330) اور زندگی خوابہا' (1332) پہلے دور کے نمایندہ شعری مجموعے ہیں۔ "آوار آفتاب" 1340 تصویر سازی کا نمایندہ ہے۔ سپہری کے باقی مجموعے' صدای پای آب (1344) اور حجم سبز (1346) ھشت کتاب (1355) کے عنوانات سے شائع ہوئے۔

نادر نادر پور نے لکھا ہے:۔

"من ہربار کہ یکی از اشعار سپہری را می خوانم می پرسم چگونہ در این زمان می توان این قدر آرام و خوش بین بود۔"

سپہری در ھمین دورہ بہ نگاہی نافذ و ذہنی ماوراء نگہ مجہزمی شود۔ اکنون درخت برای او ارزش سمبولیک واساطیری دارد۔

یداللہ رویائی:۔

رؤیائی کا پہلا شعری مجموعہ "رویائی ہا" تھا۔ دوسرا مجموعہ 1346ش میں "دل تنگی ہا" کے عنوان سے شائع ہوا اور وہ، نظم گرایان مشکل گو، کے زمرے میں شمار ہوا۔ رویائی کا خیال ہے کہ شعر میں اجتماعی مضامین ہوں۔ تجزیہ سے حاصل کئے ہوئے موضوع ہوں۔ روزانہ معاملات سے دور نہ ہوں۔ شعری آزادی سے لکھے جائیں۔

عبدالعلی وستغیب لکھتے ہیں:۔

"قطعہ ہای بسیاری درکتاب رویائی ہست کہ شکل کامل خود راگرفتہ اندو تصویرہاو اندیشہ ہای تازہ را نیز بیان می کند۔ واژہ ہای سادہ دھماھنگ و پر از طینن ہستندو ترکیب خویش بہ موسیقی شعر کمک می کنند۔"

رضا شاہ پہلوی کے آخری چند سالوں میں اس کے جورو استبداد کے خلاف اندر اندر چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ لیکن لوگ کھلے بندوں دل کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

شعری کہ چون غرور بلند است و سرکش است
شعری کہ آتش است
شعریست در دلم
شعری کہ دوست دارم وبتوانمش سرود

تو للی نے پہلے ہی انقلاب کی بشارت کی تھی:

شیپو انقلاب

پر جوش و پر خروش
ازنقلہ ہای دور
میایدم بگوش
می گیردم قرار
می بخشدم امید
می آردم بھوش

دکھی دل کی فریاد جاہد کے مندرجہ ذیل اشعار سے عیاں ہے:۔

بنگر ای آسمان، مرگ بیچا رگان، لیش خونخوار گان
غم یار و جور بیگانہ و خویش، بکوگویم از دل و سینہ ریش

حکومت کے جورو استبداد سے جب عوام کا خون بہایا گیا تومہدی اخوان ثالث جوان کی لاش کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔

از پشمنان مردم و از جانیان پست
روزی رسد کہ خلق کشد انتقامہا
ای پیر زن کہ تازہ جوان تو کشتہ شد
دیدی بلند نامش در بین نامہا
برگور بی نشان تو غمگین نمی رویم
این احترام نیست چون آن احترامہا
ای کشتہ ای شہید پر از نغمہ ہا کیم
بستا لسرای گور ترا صبح وشا مہا

عوام کو امام خمینی کی رہنمائی حاصل ہوجانے پر شعر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی۔ انہیں اپنی فدا کاری کا یقین دلایا اور ملک کو پنجہ استبداد سے نجات دلانے کی تمنا کی۔ محمد حسین حجتی نے لکھا۔

رہنمای بعد اعصار و قرآن
آمدہ درماندگان را **رھنمون**
میزند فریاد کای **مستضعفین**
یورش بر پیکر مستکبرین
باز گیرید حق خود را بید رنگ
از دوان پوزہ خونین فرنگ
این خیانت **پیشگان** را وارہید
حلقہ بر پیر امن قرآن زنید

الف قیام نے کہا۔

ای پیر خمین تا ترا یار شدیم
پیان ترا بجان خریدار شدیم

تا مہر ولایت , تو برماتابید
از زمزمہ عشق تو بیدار شدیم

خون است دلم، سینہ صد چاک ترا
صد باغ شگفتہ خارد خاشاک ترا
وقت است کہ سر فدا کنم در پایت
وز دست ودان رہا کنم خاک ترا

جمہوریہ اسلامی ایران وجود میں آجانے سے ملی ترانے لکھے گئے اور انقلاب کی برکتوں کا ذکر ہوا اور قربانیوں کے بعد آزادی پا کر قلبی مسرت کا اظہار ہوا۔ ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو بے شمار جنگی ترانے لکھے گئے۔ انقلاب اسلامی اور اس کی کامیابیوں کے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا۔ مثلاً یہ دو نمونے درج ذیل ہیں۔

ما مسلح بہ اللہ اکبریم
برصف دشمنان حملہ مہ بریم
لا الٰہ، لا الٰہ، لا الٰہ
وحدہ وحدہ، وحدہ
انجز وعدہ و نصر عبدہ
ابجز وعدہ ونصر عبدہ
اللہ اکبر اللہ اکبر
اللہ اکبر خمینی رہبر

تو ہستی و گزینش
انقلاب پر توان اسلامی سازش
امام و امت رزمندہ تو فندہ را بگرین
و مرگ عزت آور را صلا در دہ
کہ ہچو شاہدان جلوہ گاہ حق
شہیدان عزیز و سربلند دوش

در محراب عشق راستین، روسوی او داری (دکتر حسین حبیبی)

ایران میں انقلاب کے بعد اکثر عوام کے ذہنوں پر مذہب کا غلبہ رہا۔ نوجوان شعراء و شاعرات نے ظہور امام مہدی کے جلد ظہور، صحیح حکومت اسلامی اور برکتوں کے نزول کے متعلق دعائیہ نظمیں لکھیں۔ ان میں سے طاہرہ صفاری کی انتظار، سپیدہ کاشانی کی نور مبارک اور حمید سبزواری کی 'اے عدالت موعود' قابل ذکر ہیں۔

بعد میں ترانہ ہای ملی اور قومی و ملی نظمیں لکھنے میں حمیدہ سبزواری کا نام سربر آور رہ رہا۔ بہمن 63 کے ایک انٹرویو میں کیہان فرہنگی کو بتایا کہ اس نے تین سو کے قریب قومی ترانے اور نظمیں لکھی ہوں گی۔

بعض اصناف سخن

سرود:-

گیت یا ترانہ ہے- ایران قدیم میں ان گیتوں کا رواج رہا ہے- زردشتی گیت اور اوستا کا کافی حصہ سرود دینی یعنی مذہبی گیتوں پر مشتمل ہے' ایران جدید میں ان کا پھر رواج ہوا ہے- چنانچہ سرود شاہنشاہی' سرود جوانان- سرود توانائی' سرود ورزش لور سرود درخت کاری مشہور ترانے ہیں جن کا نوجوانوں پر بڑا اثر ہے- سرود لکھنے والوں میں افسر' جلہد' وزیری' گل گلاب اور خالقی مشہور شاعر ہیں-

تصنیف

اس نظم کا مدت مدید سے ایران میں رواج چلا آرہا ہے- اس نظم میں ایک تو مقامی حالات و واقعات کا ذکر ہوتا تھا- دوسرے وہ موسیقی سے ہم آہنگ ہوتی تھی- اور تیسرے عوامی بولی میں ہوتی تھی- یہ تینوں خصوصیات جہاں اس کی مقبولیت کا سبب ہوتی تھیں وہاں اس کے زوال کا سبب بھی بنتی تھی- مقامی واقعات وقت گزرنے پر لوگوں کے ذہنوں سے محو جاتے تھے- عام بولی جگہ جگہ مختلف ہونے کی وجہ سے یکساں طور پر رائج نہ ہو سکتی تھی اور چونکہ موسیقی لکھی نہیں جاتی تھیں- اس لئے وہ بھی فراموش ہو جاتی تھی- اس لئے سفینوں اور تذکروں میں اس قسا . کی نظموں کو محفوظ کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی-

قول:

تصنیف کو اصطلاح میں قول بھی کہتے ہیں- اس کی دو قسمیں تھیں- ایک تو یہ کہ متقدمین میں سے کسی شاعر کی غزل لے کر اس کو موسیقی سے ہم آہنگ کر دیا- جیسا کہ تصنیف "ای بعت خنداں لب لعلت کہ یکیدہ" میں سعدی کی غزل کو اپنا لیا گیا ہے یا کسی کے اشعار پر مستزاد بڑھا کر اس کو قول کی صورت میں بنالیا گیا ہے- جیسے ابن حسام ہروی کے شعر پر عبدالقادر عودی نے تصنیف کا اضافہ کر لیا- مثلاً

آن کیست کہ تقریر کند حال گدا را------در حضرت شاہی
از غلغل بلبل چہ خبر باد صبا را------ جز نالہ و آہی

مولانا روم کی بعض غزلوں کو بھی سماع و حال کی مجلسوں کے لئے موسیقی سے ہم آہنگ کر لیا گیا ہے-

موضوعات قول یا تصنیف:

کسی جابر حاکم کے خلاف طعن و ملامت کرنا یا کسی غیر معمولی برائی کرنے والے کی ہجو کرنا یا کسی غیر معمولی اچھا کام کرنے والے کی تعریف و تحسین کرنا مثلاً 1374ھ میں جب بوشہر میں احمد خاں کا قتل ہوا تو کسی مجہول الاسم شاعر نے تصنیف لکھی جو دیر تک زبان زد عام رہی- اس کا پہلا شعر یہ ہے-

خبر آمد کہ دشتشانزعپ بہار
زمین از خون احمد لالہ زارہ

شلوہ:-

اس قسم کے اشعار جو بزرگوں یا جوانوں کے مرثیہ میں لکھے جاتے تھے- جنوبی ایران میں ان کو شلوہ کہتے ہیں-

سورد:۔

وہ اشعار جو بیاہ شادی کی محفلوں میں مہمانوں کے استقبال، دولہا دلہن کے جلال و جمال کے متعلق پڑھ جاتے تھے ان کو سورد کہتے ہیں جو لفظ سوریاں سرود سے نکلا ہے۔

حرارہ:۔

وہ اشعار جو کسی علامت یا جذبہ انتقامی کو مشتعل کرنے کے لئے لکھے جاتے تھے ان کو حرارہ بھی کہتے رہے ہیں۔ مثلاً جب سلطان احمد سلجوقی نے رئیس ملاحدہ احمد بن عطاش کو گرفتار کر کے بازاروں میں تشہیر کر دیا تو ہیجڑے اس کے آگے آگے یہ حرارہ پڑھتے تھے۔

1- عطاش عالی، جان من، عطاش عالی، میان سرہلالی، ترابد ترچکارہ

2- ایک شخص حاجی رضا قاسمی نے شیراز میں حسام السلطنت کے زمانہ حکومت میں شرارت اور سرکشی کی۔ اپنی معزولی کے بعد جب حسام السلطنت دوبارہ 1282ھ میں شیراز آئے تو حاجی رضا نے استقبال کیا۔ حسام نے پہلے تو محبت سے پیش آکر اس کو ابلق گھوڑا عنایت کیا بعد میں اس کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ ظرفای شیراز نے اپنی مقامی بولی میں اشعار پڑھے ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

اسبت استدن ابلقت دادن

ازتخت جمشید ملقت دادن

یعنی اسبت راگر فتند و ابلقی کردند و ازتخت جمشید ترا متعلق نمودند۔

3- فرہاد مرزا فارس کے حاکم عوام پر سختی و جبر کرتے تھے۔ 1298ھ میں معزول ہو کر تہران میں بلائے گئے تو لوگوں نے یہ حرارہ پڑھا۔

شیراز بایں خرمی
ہوا یاپن پر نمی
شازوہ چرادرھی
ازقدم دخترم
خاک سیا برسرم

4- اسی قسم کی وہ تصنیف ہے جو ظل السلطان کی معزولی پر لکھی گئی۔ (1304ھ)

کو اصفہان پاتحت من
کو حکم ہای سخت من
شا بابا تقصیرم چہ بود
این بندو زبخیرم چہ پود

قدیم تصانیف میں سے جو باقی رہ گئی ہیں ایک تصنیف لیلیٰ ہے اور دوسری تہران میں 1287ھ لکھی گئی جس کا یہ شعر مشہور ہے۔

عقرب زلف کجت باماقمر قرین است
تاقمر در عقرب است حال ماچنین است

وہ شخص جس نے تصنیف کو ایک واضح صورت بخشی علی اکبر شیدا ہیں یہ صفی علی شاہ کے مرید اور نعمتہ اللہی درویش تھے سہ تارہ خوب بجاتے تھے اور بہت اچھا خط بھی لکھتے تھے۔ تصنیف مرضیہ انکی بہت مشہور تصنیف ہے۔ وہ 1326ھ میں وفات پا گئے۔

عصر حاضر میں تصنیف کو بڑا رواج ہوا ہے مقامی مضامین کے بجائے وطنی اور ملی موضوعات نے جگہ لے لی ہے۔ بادشاہوں اور مقامی حکمرانوں کے خلاف ملامت و سرزنش کے لئے تصنیف میں حرارہ کی خصوصیات داخل ہو گئی ہیں۔

عارف پہلے شخص ہیں جنھوں نے تصنیف کہ رنگ وبو کی محفلوں سے نکال کر سیاسی مضامین سے آشنا کیا اور اپنے ذاتی جوش و ہیجان سے لوگوں کے احساسات ملی کو بیان کیا۔ عارف کے بعد جاہد، وحید، پژمان، اور روحانی وغیرہ نے تصنیف کو نیا رنگ روپ بخشنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اب ہم چند برگزیدہ شعراء کا تفصیلی مطالعہ کریں گے، جنھوں نے جدید شاعری میں اہم خدمات انجام دی ہیں اور فن شعر کے نقطہ نظر سے بھی ان کا مقام متعین ہو چکا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

1- ادیب پشاوری
2- امیری
3- ایرج مرزا
4- بہار

ادیب پشاوری

سید احمد نام' ادیب تخلص' باپ کا نام سید شہاب الدین تھا- 1260ھ میں پشاور میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں پائی- جن دنوں انگریزوں اور سرحدی قبائل میں جنگیں ہوتی تھی انہی دنوں ایک جنگ میں ادیب کے والد' چچیرے بھائی اور دوسرے رشتہ دار مارے گئے لیکن ادیب اپنی جان بچا کر کابل کا آ پہنچے- ایک سال قیام کے بعد غزنی' ہرات' تربت' شیخ جام اور مشہد کا سفر کیا اور اس وقت تک کے سربر آوردہ علماء فضلاء سے علم حاصل کیا- 1387ھ میں سبزوار میں مقیم ہو کر حاج ملا ہادی سبزواری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا- 1300ھ سے تہران آگئے اور ساری عمر یہیں گزاری- 1349ھ میں وفات پائی اور امام زادہ عبداللہ (حضرت عبدالعظیم) میں مدفون ہوئے-

ادیب نے اپنی ساری زندگی فقیرانہ اور درویشانہ گزاری- نہ شادی کی اور نہ دنیاوی ساز و سامان کی طرف توجہ دی- ان کے سامان میں صرف چند کتابیں تھیں- مثلاً شفا' اشارات اور اسفار وغیر جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے نقل کی ہوئی تھیں- زندگی کے آخری سالوں میں عموماً ناصر خسرو' خاقانی' سنائی اور خاص طور پر مثنوی مولوی کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے-

ان کا دیوان علی عبدالرسولی نے مرتب کیا تھا- اس میں 4200 اشعار فارسی اور 370 اشعار عربی کے شامل ہیں- ضمیمہ کے طور پر دیوان کے ساتھ مندرجہ ذیل دو رسائل بھی شائع ہوئے ہیں- (1) دربیان قضایای بد یہیات اولیہ- (2) تصحیح دیوان ناصر خسرو اور **تعلیقات** تاریخ ابوالفضل بیہقی- یہ حواشی و **تعلیقات** تاریخ و لغت پر ان کی وسیع معلومات کے شاہد ہیں-

جنگ عظیم کے واقعات پر مبنی بحر متقارب میں 1400 اشعار کی ایک مثنوی قیصر نامہ لکھی تھی لیکن وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی-

زندگی کے آخری دنوں میں بو علی سینا کی اشارات کا فارسی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو مکمل نہ ہو سکا-

حکمت الٰہیات' ریاضی' طبیعات اور علوم قدیمہ پر ان کا بڑا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا- ان کو ہزاروں اشعار حفظ تھے- عصر حاضر میں علم و فضل میں ان کے مرتبہ کا کوئی شاعر نہیں گزرا- مرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے کہ ابوالعلاء معری تو صرف عربی میں اور یہ عربی فارسی دونوں میں نادرۂ دہر تھے- اس بلا کا حافظہ تھا کہ اگر ایسا کوئی عربی شعر جس کا مصنف نامعلوم ہوتا ان کے پاس لے

جاتے تو وہ فوراً شاعر کا نام اس کی تاریخ پیدائش و وفات اور اس شعر کے سابق و لاحق دوسرے اشعار پڑھ دیتے اور مجلس محو حیرت رہ جاتی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' ادیب نے فقر و گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ اس بے رنگ بو زندگی کے متعلق انہوں نے خود اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں:

خرد چہرہ برآرز نواشتم
جہاں را بکم مایہ بگناشتم
منشن چون گرائید زین رنگ و بوی
اگا تو لگاورش برکاشتم
سپر دم چو فرزند مریم جہاں
نہ شامم مہیا و نہ چاشتم
تن آسانی آرد روان را گزند
نہ ور زیدم این تخم ونہ کاشتم

اور اس زہد و توکل کے ساتھ اپنے گلشن علم و دانش میں خوش و خرم رہ کر آزادی بسر کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے خود اس بات کی تصدیق کی ہے۔

باغکی وارم درون خاطر خوراز علوم
می چمم درباغ وی چینم زہر شاخی بری
دولت آزادی وہم نعمت دانش مراست
نیستم احسان حق را ناشناس و کافری

لیکن اس کے بعد اپنی واژگوں نجتی کا گلہ کیسا اور فلک کج رفتار سے شکوہ کیا' یا تو کلام میں شاعرانہ تضاد ہے یا پھر نفسیاتی سچائی یہ ہے کہ وہ تباہ و برباد ہو کر اپنے وطن سے نکلے اور پردیس میں بھی ان کی معاش کا تسلی بخش انتظام نہ ہوا تو انہوں نے تصوف کی پناہ لی اور فناء خودی اور فناء آرزو کا راستہ اختیار کیا۔ اگر انہوں نے بے وفا دنیا اور ناپائدار زندگی سے مایوس ہو کر بے عملی کی زندگی اختیار کر لی تھی تو پھر یہ اشعار ان کے قلم سے نہ نکلتے۔

بادل تفسیدہ تر زتافتہ کانون
زار ھمی گریم از ستارہ واژون
قوت روانم ہمہ زخون جگر

گرنہ جنینم چراست روزی من چون
برمن فرسودہ گشتہ گردش گیتی
گشت چو برخوار بار گرد و طاہون
ازتن زارم نشاط و خواب زچشم
رفت بدانسان بدر کہ ہوش زمفتون

ایک اور قصیدہ میں انہوں نے زمانے کی ناسازگاری کا رونا رویا ہے۔ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدبین ہیں اور انہیں دنیا میں کہیں شادمانی نظر نہیں آتی انہوں نے لکھا ہے۔

یکی گل دران نغز گلزار نیست
کہ چنیندہ را زان دو صد خار نیست
منہ دل بر آوای بزم جہان
جہاں را چو گفتار کردار نیست

اس قصیدہ کے جواب میں میں ملک الشعراء بہار نے بھی ایک قصیدہ لکھا تھا جو سراسر خوشی بنی پر مبنی ہے اور شاعر کو اس جہان میں ہر جگہ ہنسی اور خوشی نظر آتی ہے قصیدہ کے پہلے دو شعر یہ ہیں۔

جہان جز کہ نقش جہاندار نیست
جہان را نکوہش سزاوار نیست
سراسر جمال است و فرو شکوہ
برآن' ہیچ آہو پدیدار نیست

قصاید

کل قصاید میں سے آٹھ قصاید میں تغزل وپند و موعظت اور دیگر معانی کے ساتھ ساتھ قیصر کی مدح ہے اور چار قصیدوں میں جنگ عمومی اور جنگ بین المللی پر تبصرہ ہے۔ اس موضوع پر قیصر نامہ کی طویل مثنوی بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام جنگ عظیم (1914-1918ء) کے درمیانی سالوں میں لکھا گیا ہے۔ قیصر جرمنی ویلہلم کی جرار اور پر عزم شخصیت شاعر کو بہت مرغوب ہے۔ وہ اس کی فتوحات کا مداح اور دعا گو ہے۔ اس کے پس منظر میں انگریزوں کے خلاف ادیب کا وہی جذبہ حقارت و نفرت کار فرما ہے۔ جو ان کو اپنی ہندوستانی زندگی سے ورثہ میں

ملا تھا۔ چنانچہ ممالک اسلامی اور ہندوستان میں جہاں جہاں انگریزوں کا تسلط تھا ادیب وہاں کے باشندوں کے لئے خیرو برکت کے متمنی ہیں اور ان کی آزادی کے لئے دعا گو ہیں۔ انگریزوں کے خلاف ان کے جذبہ مخالفت کو ملاحظہ کیجئے۔

گر سنہ اشکم زلندن سوئے ہندوستان شتافت
تاکہ الوان نعم از خوان ہر منعم گرفت
چون غلیواژی کہ بگرائید از بالا بزیر
بچہ حمہ و نہ یاموش از پی اشکم گرفت
کردہ دین عیسوی ترویج اندر ملک ہند
ہر کشیشی کو بدزدی چادر از مریم گرفت

جنگ عظیم میں شریف مکہ نے جو انگریزوں کا ساتھ دیا اور ترکوں اور جرمنوں کے خلاف امداد کی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔

گردن آن سگ بزن کو سوی کعبہ توشتافت
گردن آن ہم کو سوی کعبہ سگ را رہنماست

جس جوش و بے باکی سے انگریزوں اور ان کے حامیوں کی مخالفت کی ہے اسی آزادی اور بے باکی سے ایران کے دشمنوں اور وطن کے خائنوں کو بھی ملامت و سرزنش کا نشانہ بنایا ہے۔

ادیب کے نصیحت اور شکوہ کرنے کا انداز وہی قدیم متصوفانہ ہے جو خاقانی اور سعدی کا ہے۔

نظریہ شعر:-

ادیب شاعری کے پیغمبرانہ مسلک کے قائل تھے۔ وہ شاعری سے رہنمائی کا کام لینا چاہتے تھے۔

در رہ پرپیچ دین شعراست چوں میل بلند
بہر ہر گم کردہ راہی یا .عمداخم زنی

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ پرسوز اور پر اثر شعر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دل بھی سوزو اخلاص کی بھٹی میں پکا ہو۔ خیال سوز جگر کی آمیزش سے زبان پر آئے تاکہ دوسروں کے دل میں حرارت اور تپش پیدا کرے۔ چنانچہ ادیب نے خود اس مضمون کو واضح کر کے اپنی شاعری کا مدعا بیان کیا ہے۔

این سخن دور است ومعنی آتش و کانون ضمیر

زیں زبان مرآشتم را ترجمان ور وزنی

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

تا نگر گیرا شود چون آتش اندر سوختن
در تو جادو می کنم زین شعر ہمچو ساحری

اس کے بعد کہتے ہیں کہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اس روشنی سے جہالت کو دور کر کے انسان پیدا کر سکوں۔

بو کہ بزدایم ازین آئینہ بامن زنگ جہل
سوختم تن تا بکف آرم مگر خاکستری

ادیب کے مطبوعہ قصاید سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی عمر کے آخری بیس تیس برس کا کلام ہے کیونکہ ان میں وہ تمام خواص موجود ہیں جو ایک پختہ فکر قصیدہ کے لوازم ہونے چاہئیں۔ اکثر قصاید انوری اور خاقانی کے تتبع میں کہے گئے ہیں خاص کر پہلا یہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

چون روز خود ندید سکندر در آئینہ
بیہودہ بود کردن اسکندر آئینہ

اور دوسرا انیس صفحے کا طویل قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے۔

آنچہ باشکر کند آبی و باعود آذری
کرد بامن اندہ ایران و بغداد و ھری

ادیب کو اپنی شعری پختگی، کمال فن اور لطف بیان پر ناز بھی ہے اور خاقانی کو دعوت مبارزت بھی دیتے ہیں اور ان کو اپنی برتری کا احساس بھی ہے۔

ہر شعر زین چکامہ چو شاخیست بردرخت
کان شاخ را بود ثمر نو بر آئینہ
فرمان .بمن دہدنہ بخاقانی کبیر
گر درمیان مادوشود داور آئینہ

ادیب نے بھی خاقانی کی طرح ردیف کا التزام کیا ہے مثلاً پردرد، گرفت اور آئینہ ردیف والے قصاید ملاحظہ کیجئے۔ خاقانی اور ادیب دونوں میں علوم قدیمہ اور تاریخ و ادب کے متعلق اشارات و تلمیحات موجود ہیں جس کے سمجھنے کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ خاقانی میں

پیچیدگی تخیل اور اغلاق فکر موجود ہے۔ معانی الفاظ کی تہوں میں غرق ہیں تشبیہات اور استعارات کی گنجلکوں میں مطالب گم ہیں۔ لیکن ادیب کے ہاں خرابی نہیں تخیل واضح ہے۔ اور جملوں کی ترکیب رواں ہے۔ ادیب اجنبی نامانوس اور متروک الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

غزلیات

ادیب کی غزلیات میں کلاسیکی رنگ ہے۔ شوخی افکار و رعنائی تغزل نہیں۔ اکثر غزلوں میں قوانی ثقیل ہیں۔ جن سے غزل کی لفظی لطافت میں فرق آتا ہے۔ مثلاً یہ قوانی دیکھئے۔ مشبکیست، مشبکیست، سوزیدہ، آجیدہ، آمیزندہ، گریزندہ، مسکون شدنی، معجون شدنی، زندقو، اروندقو، حنجرہ، شبہ چرہ، اکمہ تو، جز مہ تو، وغیرہ انہیں ثقیل قافیوں کی وجہ سے غزلیات میں بھی قصاید کا رنگ غالب ہے ان کا محبوب حقیقی ہے جس کے فراق میں وہ تڑپتے ہیں۔ اور اپنے عشق کو زندہ رکھتے ہیں وہ اس کا حسن کائنات کی ہرشے میں جلوہ گر پاتے ہیں۔ روایتی انداز میں معشوق مجازی کا سراپا بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کو کسی بے درد سے پالا نہیں پڑا۔ اس لئے ان کی غزلوں میں واردات عشق کہاں۔ شراب کو تو شاید عمر بھر نہ چھوا ہو مگر اس کی غم زدائی کے قائل ہیں۔ مثلاً

می و معشوق و نوا زندہ زیبا درپیش
میل رقص از نکند مرد بگویم حاشاک
تازنگ از سینہ غمناک زدائی
پیش آر صراحی می و ساغر معقول

ادیب الممالک امیری

محمد صادق ان کا نام تھا۔ ادیب الممالک لقب اختیار کیا تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا حسین تھا۔ ان کے اجداد میں مرزا معصوم، مرزا ابوالقاسم قائم مقام محمد شاہ قاچار کے زمانہ سلطنت میں صدارت اور وزارت کے عہدوں پر سرافراز تھے۔ ادیب عراق میں ضلع شرا کے گاؤں کازران میں 1277ھ (1860ء) میں پیدا ہوئے ان کو ماں کی جانب سے بھی اپنی نسبی شرافت پر ناز تھا۔ ابھی چودہ پندرہ سال کے ہوں گے کہ ان کے والد 1291ھ میں وفات پا گئے۔ ادھر سے باپ کا

سایہ سر سے اٹھ گیا ادھر سے فیروز مرزا کے بیٹے ناصر الدولہ نے جو عراقی فوجوں کے کمانڈر تھے ان کے والد کی جائیداد زبردستی کم قیمت پر خریدلی اور ادیب الممالک اور ان کے بھائی پریشان حال ہو کر قم آگئے۔ وہاں سے تہران گئے ان کی والدہ بھی چھوٹے بچوں کو لے کر آگئی۔ مرزا علی اور مرزا ابوالقاسم قائم مقام نے مختصر سی معاش دے کر ایک حقیر سے مکان میں جگہ دی مگر اس کے بیٹے ان کو ہمیشہ لعن طعن کرتے اور ان کو ذلیل سمجھتے۔ آخر مرزا حسین اور مستوفی الممالک کو ان کے حالات سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے بڑی نوازش کی۔ ایک دن ادیب نے شکایت روزگار کرتے ہوئے شاہزادہ طہماسپ کی مدح میں قصیدہ لکھا اور مستوفی الممالک کی وساطت سے دربار میں پیش کیا۔ پہلے تو شاہزادہ نے توجہ نہ کی۔ بعد میں پختگی کلام پر متاثر ہوئے اور فرمایا" عجبا کہ باین کدکی پیرانہ شعرمی گوید" ایک اور مرتبہ شاہزادہ نے فرمائش کی کہ اوالفرج رونی کے اس شعر کی تقطیع کر کے اس کی بحر میں فی البدیہہ کہو:

شہ باز بہ حضرت رسید ھین
بگردان مرا بر نہید زین

ادیب نے اسی وقت صحیح بحر بتا کر تقطیع کی اور قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

طہماسپ خداوند ر استین
داردیم دکان در دو آستین

شہزادہ نے خوش ہو کر انعام و اکرام دیا اور پھر ان کو اپنے بیٹے غلام حسین حکمران تویسرکان کے سپرد کیا۔

1294ھ میں مستوفی الممالک کے حکم سے ان کو موروثی جائیداد مل گئی لیکن بد قسمتی سے مرزا علی اکبر خان حاکم مضافات نے ان کی تمام جائیداد کو کم قیمت اجناس کے عوض خرید لیا اور ان سے دستخط کروالئے۔

1309 میں امیر نظام کرمان شاہان میں حاکم مقرر ہوئے تو یہ بھی ان کی ملازمت میں انکے ہمراہ گئے۔ 1314ھ میں شہنشاہ کی طرف سے ان کو 'ادیب الممالک کا خطاب ملا۔ 1316 میں مدرسہ نعمانیہ قائم ہوا تو ان کو نائب رئیس بنایا گیا۔ وہ کبھی کبھی ممبرز پر وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ اسی سال انہوں نے تبریز میں روزنامہ "ادب" شائع کیا۔ 1318ھ سے 1320ھ تک یہی روزنامہ مشہد سے نکلا۔ 1321ھ سے وہ تہران چلے گئے اور 1323 تک روزنامہ "ارشاد" ترکی کے ساتھ فارسی میں ضمیمہ نکالتے رہے۔ 1324 میں روزنامہ "مجلس" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے سات مہینوں کے بعد

روزنامہ عراق عجم کا آغاز کیا جو تھوڑے عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد روزنامہ "ایران دولتی" کے سرد بیر رہے۔ 1327 میں مجاہدین کی صف میں شامل ہو کر فاتح کی حیثیت میں تہران میں داخل ہوئے۔ 1327 میں عدلیہ سمنان کے صدر مقرر ہوئے۔ 1331 میں رئیس صلحیہ ساہ جیلاغ متعین ہوئے 1332 میں وزارت داخلہ کی طرف سے نیم سرکاری روزنامہ "آفتاب" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1334 میں عدلیہ عراق اور 1335 میں عدلیہ یزد میں ان کا تقرر ہوا۔ 1336 میں تہران واپس آئے اور اسی سال وفات پا گئے۔ اور امام زادہ عبدالعظیم میں مدفون ہوئے۔

ادیب الممالک پہلے پروانہ تخلص کرتے تھے۔ جب مظفر الدین شاہ کی طرف سے امیر الشعراء کا خطاب ملا تو پھر امیر تخلص کرنے لگے۔

وحید دستگردی نے ان کا دیوان مرتب کیا ہے یہ ایک بڑا جامع دیوان ہے اس میں ہجو ہزل سے لے کر مدحیہ قصاید اور وطنی اور ملی شاعری پر نظمیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر ان کی قادر الکلامی اور متنوع افکار کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادیب ایک جید عالم وفاضل تھے۔ فارسی عربی ادب و لغت پر ان کو بڑا عبور تھا۔ تاریخ عرب وانساب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ قوی حافظہ ہونے کی وجہ سے جابجا اپنے قصاید میں تلمیحات و اشارات استعمال کرتے تھے جن کا سمجھنا ایک عام پڑھنے والے کی سمجھ سے باہر ہے۔

فلسفہ، ریاضی، نجوم، جفر، رمل اور فراست الید میں ان کو درک حاصل تھا روسی، کلدانی، ترکی اور مختصراً انگریزی اور فرانسیسی بھی جانتے تھے۔

ادیب نے مختلف موضوعات پر کئی رسائل لکھے لیکن ان میں اکثر ضائع ہو گئے۔ صیقل المرات در جغرافیا، سماء الدنیا در ہیات جدید، تابش مہر، فلک المشحون، تحفتہ الوالی در عروض، مقامات امیری، رشحات الاقلام، دیوان پارسی، پیوستہ فرہنگ اور رسالہ درعقد انامل ان کی تصانیف ہیں۔ جن سے ان کی وسعت مطالعہ اور مختلف علوم میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شعر و ادب میں ادیب الممالک کا مقام بہت بلند ہے ان کے معاصرین میں قاآنی، سروش اور ایک دو اور شعراء کے علاوہ کوئی اور شاعر ادیب کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔

ملی و وطنی شاعری

ادیب کے دیوان کا بیشتر حصہ وطنی و ملی شاعری پر مشتمل ہے وہ اپنے اندر ایک مخلص اور

حساس دل رکھتے ہیں۔ وطن کی تباہ و برباد سیاسی اخلاقی حالت پر ان کو بڑا افسوس اور دکھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک سرود ملی میں کہتے ہیں۔

فتادہ زغم رعیت شہ
بحال پریش و بروز سیہ
زبرای خدا زطریق وفا
نگر سوئے ما
کہ جہاں بماشدہ چون قفس
بگلو رسیدہ ھمی نفس

وہ اپنے اس خداداد ملکہ شعرو سخن کو فضول اور دوراز کار مضامین اشعار لکھ کر ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے قصیدہ وطن، میں ایسے شاعر کی مذمت کی ہے جو موہوم اور خیالی معشوق کی تعریف میں سخن سرا ہے۔ وہ اس کو تنبیہہ کرتا ہے کہ اس نیرنگ و فسوں سے باہر نکل اور اپنے وطن کو اپنا محبوب سمجھ اور اسکی مذمت میں اپنی زندگی قربان کر۔ جابر حکمرانوں، فاسق افسروں، بے انصاف عدلیہ اور بے قانون ضبطیہ کو بار بار تنبیہہ اور خدمت کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں بادشاہوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ محمد علی شاہ کی ہجو میں سینکڑوں اشعار لکھے ہیں۔ اس کی تاریخ ولادت "ای شہ بدبخت" کہہ کر نکالی ہے۔ وطن کی خوشحالی اور آزادی انہیں مرغوب ہے۔ دوسری متعدد اور آزاد قوموں کی مثالیں دے کر اپنے ہموطنوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جنگ روس و جاپان کا حال لکھ کر ایرانیوں میں غیرت ملی کا جذبہ ابھارا ہے اور جاپانیوں کی حوصلہ مندی، شجاعت اور استقلال کی مثال دے کر ان کی تقلید میں وطن دشمنوں سے پنجہ چھڑانے کے لئے جوش دلایا ہے۔

جب مجاہدین نے ایران فتح کیا اور محمد علی تخت بردار ہوا تو انہوں نے مسرت و اطمینان کا اظہار کیا اور لکھا۔

بیا کہ ملت ایران حقوق خویش گرفت

لیکن جب جمہوری انداز سلطنت اور مشروطیت حاصل ہوئی تو بد دیانت اور نااہل نمائندوں اور اداراتی کارکنوں کی وجہ سے ملک کا کار ہموار درست نہ ہوا۔ تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے "در کفن مشروط خواہان در دغی" کے موضوع پر ایک ترجیح بند لکھا۔ جس میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور غداران وطن کی مذمت کی انہوں نے لکھا:

دیدہ درخون جگر زد غوطہ
باد لعنت بہ چسین مشروط

اور پھر کہا:

یا بکش خشم را وبرکن پوست
یا بدشمن سپار خانہ دوست

ادب کی ملی شاعری میں متانت، خلوص اور توازن ہے۔ عشقی کی طرح جوش، شوریدگی اور خونریزی کا جذبہ کار فرما نہیں اور نہ ہی عارف کی طرح ان کے ملی ترانوں میں لچک گداز، نغمگی اور سوز ہے۔

قصیدہ گوئی

ادیب الممالک نے کلاسیکی انداز میں قصاید لکھے ہیں اور پرانے استادان فن کا تتبع کیا ہے۔ مدحیہ قصاید تھوڑے ہیں۔ انہوں نے ہر کس و ناکس کی مدح نہیں لکھی۔ صرف انہی شاہزادوں، حکمرانوں اور بادشاہوں کی مدح کہی ہے۔ جو اس کی نظر میں وطن دوست، خدمت گزار اور انسانوں کے خیرخواہ تھے۔ مثلاً امیرانوشردان، امیر نظام گردسی اور مظفر الدین شاہ مشروط بخش وغیرہ۔ ان کی مدح میں زیادہ جھوٹ اور مبالغہ نہیں۔ ہیئت وہی ہے انداز نیا ہے۔ خاقانی اور انوری کی طرح دو تین قصیدوں میں سخت قوافی نکالے ہیں۔ اور اپنے علم لغت کے بل پر سخت اور نامانوس الفاظ لائے ہیں:

مثلاً یہ قصاید ملاحظہ کیجئے۔

چون شہ برد العجوز از چرخ نازل
زمستان دست سردی داشت بردل
چو شدہ چہرہ شاہد صبح ابہج
از خورشید بسنہد زرینہ هوودج

یہ قصاید خاقانی اور انوری کے قصاید سے صرف اس لحاظ سے مشابہ ہیں کہ ان میں کبھی ہیئت ونجوم، فلسفہ و تاریخ اور دیگر علوم کی طرف اشارات و تلمیحات ملتی ہیں لیکن مشہور قصیدہ سراؤں کی طرح شوکت الفاظ پیچیدہ مرکب تشابیہ اور گنجلک استعارات اور زور دار تراکیب نہیں۔ دو

قصیدے فرخی کے تتبع میں لکھے ہیں ایک تو وہ مشہور قصیدہ ہے جو ان نے واغ گاہ ابوالمظفر امیر نصر کی ستائش میں لکھا تھا جس کا مطلع یہ تھا:

تا پرند نیلگون برروی بند ومرغزار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

جو قصیدہ ادیب نے مظفر الدین کی فرمائش پر اسی قسم کے موقع پر لکھا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔

ابر چون پیلان مست آمد فراز کوہسار
باد ہمچو پیلبان برپیل مست آمد سوار

دوسرا 355 شعر کا طویل قصیدہ ہے جو ضیاء الدولہ امیر انوشیروان کی مدح میں ہے جو فسانہ گشت وکہن شد حدیث اسکندر، کے تبتع میں لکھا ہے۔ اول الذکر قصیدہ میں اپنی برتری کا اظہار کرنے کے لئے شاعرانہ تعلی سے بھی کام لیا ہے اور لکھا ہے۔

فرخی سوزد چکا مہ عنصری شویدورق
عسجدی برد زبان فردوسی آیدباعتزا

ادیب اصل میں فرخی اور عنصری کے دبستان کا قصیدہ گو ہے۔ انہی استادوں کی طرح اس کے اشعار میں بھی سادگی اور روانی ہے۔ جملوں کی بندش اور ترکیب میں الجھاؤ نہیں لیکن زبان کے ارتقائی درجہ میں ہونے کی وجہ سے الفاظ کی تراش خراش میں متقدمین سے زیادہ صفائی اور لوچ ہے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ ادیب کے قصاید میں علم و ادب و تاریخ کی تلمیحات موجود ہیں جو قصیدہ کے وقار میں اضافہ کرتی ہیں۔

غزل گوئی

ادیب الممالک غزل کے مرد میدان نہیں سارے دیوان میں دس بارہ غزلیں ہیں اور وہ بھی خاص محبوب سے مخاطب ہو کر لکھی ہیں۔ ایک غزل میں ہر مصرعہ کا پہلا حرف ملانے سے اس کے محبوب کا نام بدرالدولہ سلطان بیگم بنتا ہے۔ غزل کا انداز روایتی ہے وصل، فراق، لب و رخسار و زلف و ابرو کے مضامین میں اگر محبوب کا نام مذکور نہ ہوتا تو یہ تمام غزلیں ایک روائتی خیالی محبوب کے متعلق متصور ہو کر پھیکی بے لطف ہو جاتیں۔ لیکن چونکہ کی تغزل میں سچائی ہے اس لئے اشعار میں کچھ جان معلوم ہوتی ہے۔ ایک غزل میں اپنے وصال جسمانی کا قصہ

خوب کھلے انداز میں بیان کر دیا ہے جو دلچسپ ہے۔

مثنوی

ادیب الممالک نے چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ کہیں واقعات کو نظم کیا ہے اور کہیں وطن اور اہل وطن کو موضوع سخن بنایا ہے۔ فراموش خانہ اور جنگ حسن خان باعیال خود طویل مثنویاں ہیں۔ ان میں جزئیات نگاری نہیں وضاحت و صراحت سے سلیس اور رواں دواں مصرعوں میں اپنا مطلب واضح کیا ہے۔ مثنوی میں فنی سقم اور ڈھیل بہت کم ہے چونکہ ان کو کلام پر قدرت حاصل ہے' اس لئے اشعار میں پختگی نمایاں ہے۔ مگر یہ تو ظاہر ہے کہ نظامی جیسی متانت اور ایجاز کا اعجاز تو ان میں نہیں ہے انہوں نے شاہنامہ کا ایک چھوٹا سا واقعہ "خواہش سیمرغ از رستم برای پیام بردن بہ بہمن شاہ" فردوسی کے تتبع میں نظم کیا ہے اور فارسی سرہ لکھنے کا بھی التزام کیا ہے۔ اچھی مثنوی ہے۔ تسلسل میں کہیں جھول نہیں اور فردوسی کی طرح الفاظ اور زواید کی تکرار بھی بہت کم ہے زور بیان اور جوش بھی ہے۔

ایرج مرزا

ایرج مرزا غلام حسین رضا کے بیٹے اور فتح علی شاہ کے پڑپوتے تھے۔ 1291ھ میں تبریز میں پیدا ہوئے چونکہ دادا کا نام بھی ایرج تھا۔ اس لئے احتراماً کچھ عرصہ کے لئے ایرج کو امیر خان کہتے رہے۔ بچپن میں آقا محمد تقی اور مرزا نصراللہ جیسے کامل فن استادوں سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ رشد کو پہنچے تو دارالفنون تبریز میں فرانسیسی اور دوسرے مروجہ علوم حاصل کئے۔ مدرسہ سے باہر منطق' معانی وبیان میں بھی معلومات حاصل کیں۔

حسن علی خان امیر نظام گروسی بڑے مردم شناس اور علم و ادب کے مربی تھے انہوں نے لڑکپن سے ہی ایرج کی استعداد' ذوق اور طبیعت کو پالیا تھا اس لئے وہ اس کو شعر کہنے کی ترغیب دیتے اور انعامات عطا کرتے۔ جب اسی امیر نے تبریز میں مدرسہ مظفری قائم کیا تو ایرج کو اس کا مدیر و معاون بنایا۔

سولہ سال کی عمر میں ایرج کی شادی ہوئی۔ تین سال بعد باپ اور اہلیہ وفات پا گئے اس لئے

کنبہ کی مالی مشکلات کے پیش نظران کو سرکاری ملازمت میں داخل ہونا پڑا۔ ابھی انیس برس کے ہوئے تھے کہ مظفرالدین شاہ کی طرف سے صدر الشعراء کا لقب عطا ہوا۔ اس لئے ضروری ہو گیا کہ تہواروں اور جشنوں پر مدحیہ قصاید اور قطعات وغیرہ لکھ کر پیش کریں۔ یہ کام ایرج کو دل سے ناپسند تھا۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو امیر نظام کی ستائش میں لکھا ہے۔ اس میں ان القابات سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

ایرج اس ناموزوں کام سے نجات کے لئے ہر دم منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ مظفرالدین شاہ کے اوائل سلطنت میں جب امین الدولہ آذربائیجان کے پیش کار ہو کر آئے تو انہوں نے ایرج کو اپنا منشی مخصوص بنایا۔ اس سلسلہ میں معین الدولہ کے ہمراہ تہران بھی جاتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اقوام السلطنت کے ہمراہ یورپ میں بھی گئے۔ واپسی پر نظام السلطنت نے تبریز کے دارالانشاء میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ 1318 میں تہران گئے اور 1319 میں خمسہ۔

ایرج بقول خود "گرد سرواری سلطان رفتن بہ قربان گفتن" سے تنگ آئے ہوئے تھے' اس لئے درباری ملازمت سے گلو خاصی کرائی اور ڈاک اور چنگی کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ کرمان شاہ میں اور کچھ عرصہ کردستان میں رہے۔ چونکہ چنگی سے بلجین مشیر روسیوں سے سیاسی گٹھ جوڑ کی بنا پر اختلاس (غبن)' کا خیال رکھتے تھے۔ اس لئے ایرج مرزا خدمت سے سبکدوش ہو کر 1322 میں تہران آگئے۔ آغاز مشروطہ میں ضیع الدولہ کی وزارت مالیہ میں 1324 سے 1325 تک ایرج نے کابینہ وزارت تشکیل کی۔ 1326 میں مخبرالسلطنتہ کے ہمراہ آذربائیجان میں جا کر کابینہ بنا ڈالی۔ اس کے بعد تہران میں آکر وزارت فرہنگ میں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کیا۔ دو سال بعد معاون حکومت اصفہان بن کر گئے۔ اس تقرر کے بعد دوبارہ محکمہ چونگی میں داخل ہو کر بانزلی گئے۔ واپسی پر اس محکمہ سے سبکدوش ہو کر دفتر محاکمات کے رئیس بنائے گئے۔ 1332 میں ان کے بڑے بیٹے جعفر قلی سے خودکشی لی۔ اس جگر سوز صدمہ کے بعد تہران چھوڑ کر معاون مالیہ کے منصب پر مشہد چلے گئے۔ آخر میں امریکی مشیروں کی آمد پر وزارت مالیہ میں۔ کبھی دفتر اور کبھی باہر ہڑتال اور تفتیش کرتے رہے۔ آخر اس کام سے خستہ و ماندہ ہو کر تہران چلے آئے اور ڈیڑھ سال کے بعد 1343ھ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔

ایرج مرزا نے فرانسیسی کے علاوہ عربی' روسی اور ترکی زبانوں میں بھی خوب مہارت حاصل کی تھی جس قدر اچھی نثر لکھے اسی قدر خوبصورت خط میں بھی اس کو لکھتے تھے۔ اور سننے والوں اور

دیکھنے والوں کو دوہرا لطف آتا تھا۔

عارف قزوینی نے مشہد کے ایک بہت بڑے جلسہ میں سلطنت قاچاریہ کے خلاف ایک غزل اور تصنیف پڑھی۔ ایرج نے اب وجد کی مذمت سن کر عارف نامہ کے عنون سے ایک طویل مثنوی لکھی اور عارف کی ہجو اور بدگوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس مثنوی کے خلاف نثر میں بھی مضامین لکھے گئے۔ اور نظم میں بھی جواب دیا گیا۔ ایرج نے خود بعض کا جواب الجواب بھی دیا۔ "عارف نامہ" سادہ رواں اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اور ملاؤں کے ہاتھوں ایرج کی تکفیر کا باعث بھی بنا کیونکہ اس میں ملاؤں کے خلاف بھی لکھا ہوا تھا۔ عارف نامہ کا انداز ملاحظہ کیجئے۔

شنیدم در تاتر باغ ملی
برون انداختی حق جبلی
نمی گویم چہ گفتی شرمم آید
زبی آزرمیت آزرم آید
تو آہوی مکن جانا گرازی
تو شاعر نیستی تصنیف سازی
عجب اشعار زشتی ساز کردی
عجب مشت خودت را باز کردی

رشید یاسمی نے لکھا ہے کہ مجھے ایرج کی مجالس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ادب و حیا سے گری ہوئی بات سننے میں نہ آئی۔ عارف نامہ کے علاوہ اس کی ساری شاعری میں ہزل و فحش نظر نہیں آتا۔

ایک مرتبہ ملک الشعراء بہار نے عارف نامہ لکھنے کا سبب پوچھا تھا۔ ایرج نے کہا۔ عارف نے خود مجھے اس کام پر مجبور کیا اور مجھے ناراض کر دیا۔ میں اس کی راہ تکتا رہا لیکن وہ ہمارا حال پوچھنے نہ آیا۔ ایک دن اتفاق سے باغ علی مشہد میں سیر کر رہا تھا کہ اس سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ جب مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے کہا اب موقع ہے کہ ہم ایک دوسرے کا منہ چوم لیں لیکن میری توقع کے خلاف اس نے میری طرف پشت کر لی اور کہا" میرا پیچھا چھوڑ دو تاکہ میں اپنا کام کروں۔"

وہ ان دنوں ایک ڈرامہ اور تصنیف کی محفل منعقد کرنے کے خیال میں تھا۔ بس انہیں الفاظ

پر میں نے منہ پھیر لیا اور رستے میں ہی عارف نامہ کی بنیاد رکھ دی اور اسی رات ساٹھ شعر کہہ ڈالے۔

ایرج کا دیوان مختصر سا ہے۔ اس میں صدر الشعرائی والے زمانے کا قدیم کلام شامل نہیں۔ ایرج نے خود اسے ضائع کر دیا تھا۔ موجودہ دیوان جو اس کے بیٹے خسرو نے ترتیب دیا ہے اس کی عمر کے آخری دس سالوں کا کلام ہے۔ عارف نامہ اور زہرہ و منوچہر دو طویل مثنویاں ہیں۔ باقی چھوٹی چھوٹی نظمیں، قطعات، کچھ غزلیں اور قصاید ہیں۔

ایرج اس زمانے میں زندہ تھے جب شاعری میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ عشقی، عارف اور بہار کلام یورپ کی تقلید میں نئی نئی ہیئتوں کو کام میں لا رہے تھے۔ اور بعض قدامت پسند پرانے کلاسیکی انداز کو ہی پسند کرتے تھے اور اسی اسلوب و انداز میں لکھتے تھے لیکن ایرج نے اپنی نئی راہ نکالی۔ اس نے کہا۔

این جوانان کہ تجدد طلبند
راستی دشمن علم و ادبند
آنکہ پیش تو خدای ادبند
نکتہ چین کلمات عربند

پھر شعر کے متعلق اپنا نظریہ بیان کیا کہ:

شاعری طبع روان می خواہد
نہ معانی نہ بیان می خواہد

جب طبع رواں حاصل ہو تو پھر صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے اور عجلت اور تیز روی سے ٹھوکریں نہیں کھانی چاہئیں۔ صبر و تحمل سے کام لے کر ہی کلام میں جزالت اور متانت آتی ہے۔ کلام کو دوسرا عنصر عشق ہے۔ جب تک شعر کہنے کا ذوق فراواں اور طبعی جوش نہ ہو اور دل جذبہ عشق سے سرشار نہ ہو۔ شعر بے لطف اور بے سوز رہتا ہے۔

شعر را در نظر اہل ادب
صبر باشد و تدو عشق سبب

مثنوی زہرہ و منوچہر میں لکھا ہے کہ:

فکر بدیع دانش وران
نغمہ جان پرور رامش گران

جملہ بیرون آید ازین کار گاہ

ایرج کا عشق محض روحانی عشق ہی نہیں تھا بلکہ اس میں ہوس و مستی شامل تھی انہوں نے خوب عیش و نشاط کی زندگی گزاری اور آخری عمر میں اسی عیش کوشی کے ہاتھوں اپنی ناداری و افلاس کا شکوہ بھی کرتے رہے لیکن انہوں نے بڑھاپے میں بھی عشق کو زندہ رکھا۔

آفت جان کسان عشق بود یا پیری
چکنم منکہ ہم این دارم وہم آن دارم

اپنے مزار کے لئے جو کتبہ لکھا تھا اس میں اپنے عشق کا ذکر کیا ہے:

عاشقی بودہ بدنیا فن من
مدفن عشق بودہ مدفن من
آنچہ از مال جہان مستی بود
صرف عیش وطرب و مستی بود

اور پھر ایک پوری نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "عاشق شدن آئین من است" مختصر یہ کہ انہوں نے جو اپنے کلام کی خود تعریف کی ہے وہ بالکل صحیح ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہر صاحب ذوق کے لئے میرا کلام:

چون مختصر و سلیس و خوبست
یاصاف و صریح و پوست کندہ است
از فرط محبت کہ دارند
گویند کہ شعر شعر زندہ است

ایرج کے کلام کے یہی اوصاف تھے جنہوں نے ان کو مقبول خاص وعام بنا دیا ان کی چھوٹی چھوٹی بحریں۔ واضح تخیل، جذبات میں صداقت و اخلاص اور سہل ممتنع کو پہنچے ہوئے سینکڑوں مصرعے اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتے رہے بہار نے لکھا ہے:

سعدی نوبود، چو سعدی بدھر
شعر نو آورد ایرج میرزا

ایرج مرزا نے جو نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں وہ نہایت مفید سادہ اور معنوی دلچسپیوں سے معمور ہیں۔ اور اکثر بچوں کے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے مادر نصیحت پدر، شوق درس خواندن، حکایت "بی داغ نیست لالہ باغ بشر ھمی" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی

نصیحتیں بڑی پائیدار روشن اور زمانہ کے متقضیات کے مطابق ہیں ایرج کو اپنے اس ناصح ہونے کا احساس تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں:

من ھمان دانا گویندہ دھرم کہ خورند
قصب الجبیب حد یثم را ہمچو شکر

ایرج مرزا اگرچہ شاہی خاندان کے ایک فرد تھے اور انہیں شہنشاہیت کے دوام کے لئے حمایت کرنے کا حق حاصل تھا اور جیسا کہ انہوں نے عارف کی تنقید پر جوش میں آکر عارف نامہ لکھا۔ اس کے باوجود وہ وقت کے حاکموں کے گفتار و کردار سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے جابجا اپنے اشعار میں نااہلوں کی مذمت کی ہے اور طنز و تعریض سے کام لیا ہے۔ ایران اور ایرانیوں سے محبت کا اظہار کر کے اپنی کوتاہیوں، غفلتوں اور بے راہ رویوں پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اور اہل وطن کو متنبہ کر کے اپنی حالت سنوارنے کی تلقین کی ہے......... عورتوں کو حجاب سے باہر نکلنے اور زیور علم سے آراستہ کرنے کے لئے بھی لطیف پیرائے میں اشعار کہے ہیں۔ درویش خرقہ پوش اور ملائے نادان کو بھی ہجوو ہزل کا نشانہ بنایا ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے:

فکر شاہ فطنی باید کرد
شاہ ما گندہ گول و خرفست
تخت تاج ہمہ را دل کردہ
در ہو تلہای اروپ معتکف

وزاراء کے متعلق:

وزراء ازچہ دیدہ می نشوند
راستی مردمان دیدنی اند
تا وزیرند از کسان ببرند
الحق این ناکسان بریدنی اند

عورت کے متعلق:

خدایا تاکی این مردان بخوابند
زنان تاکی گرفتار حجابند

ایرج کو کلام پر خوب قدرت حاصل تھی اور خوب حاضر طبیعت پائی تھی اگر کبھی متعین موضوع پر

شعر کہنے کی فرمائش ہوئی یا کبھی نظم کا مقابلہ ہوا تو انہیں کی نظم درجہ اول میں شمار ہوئی' چنانچہ:

(۱) برلین کے مجلّہ **ایرانشہر**' شمارہ 4' سال دوم میں "دل مادر" کا موضوع جرمن زبان سے اخذ کر کے مقابلہ کے لئے رکھا گیا تا کہ شعرای ایران اس پر طبع آزمائی کریں- ایرج کی نظم "قلب مادر" شاہکار شمار ہوئی او گراموفون ریکارڈوں میں ضبط کی گئی-

(2) روزنامہ اقدام نے "ہدیہ عاشق" کے عنوان سے ایک موضوع متعین کر کے شعراء کو طبع آزمائی کی دعوت دی- وحید دستگردی اور رشید یاسمین جیسے پختہ گو شعراء نے بھی نظمیں لکھیں لیکن ایرج کی نظم درجہ اول میں شمار ہوئی- نظم کا پہلا مصرعہ ہے:

عاشق محبت بسیار کشد

مثنوی زہرو منوچہر بہت اچھی مثنوی ہے- زہرہ مجسمہ حسن و عشق ہے اور منوچہر حسن و جوانی اور خرد کا **متمثل** ہے- زہرہ اپنے نازو انداز سے منوچہر کو شکار کرنا چاہتی ہے- کچھ دیر تو منوچہر ہوش و خرد کی نگہبانی سے مقابلہ کرتا ہے- لیکن آخر بے بس ہو جاتا ہے اور عشق کی فتح ہوتی ہے- اس مثنوی میں ایک حسینہ کسی نوجوان کو دام عشق میں لانے کے لئے جن جن حربوں کا استعمال کرتی ہے' شاعر نے اس کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے اور یہ انداز کافی حد تک جذبات انگیز اور شہوت خیز ہے- بیان کا اسلوب بڑا دلکش ہے-

مثنوی زہرہ و منوچہر شیکسپئر کی نظم کا ترجمہ ہے- ایرج نے جزئی تصرفات کئے ہیں- یہ مثنوی ناتمام رہی- مصطفیٰ مکی بن سلیمان شیبانی متخلص بادیب اور ڈاکٹر محمود حسانی نے اپنے طور پر الگ الگ اس فسانہ کو نظم کیا اور مکمل کیا- لیکن یہ صاحبان شاید اس بات سے ناواقف تھے کہ یہ مثنوی شیکسپئر کا ترجمہ ہے- اس لئے انہوں نے اپنے رجحان کے مطابق اس افسانہ کا اختتام کیا-

ایرج کی ناتمام مثنوی کے 419 بیت ہیں آخری شعر یہ ہے:

من گل روی تو نمودم پدید
خار تو برپای خود من خلید

چھپے ہوئے دیوان میں اس شعر سے بعد کے ستر 70 اشعار الحاقی ہیں-

ملک الشعراء بہار

محمد تقی نام تھا بہار تخلص کرتے تھے انکے والد مرزا محمد کاظم خراسان کے سربر آوردہ اشخاص

میں سے تھے- وہ اچھے شاعر بھی تھے- اور صبوری تخلص کرتے تھے- ملک الشعراء کا خطاب ان کو شاہان قاجار کے دربار سے عطا ہوا تھا- بہار کے دوسرے آباؤ اجداد میں سے خوش خصال صوفی اور الوالعزم لشکری گزرے ہیں- چنانچہ انہوں نے خود اپنے نسبی تعلقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

یک نیا عابد و عارف مشرب
یک نیا لشکری و دیوانی
پدرم شاعر و من زین سہ نسب
شاعر و لشکری و روحانی

بہار 1304ھ میں مشہد میں پیدا ہوئے- عربی فارسی میں علوم مشرقیہ اپنے وطن میں ہی حاصل کئے- فن شعر گوئی میں تربیت اپنے باپ سے حاصل کی- 1322ھ میں ان کے والد وفات پا گئے تو ادیب نیشاپوری سے اصلاح لیتے رہے- انہوں نے دوسرے اساتذہ کے حضور میں بھی اپنی تعلیم کو جاری رکھا- مشہد کے مشہور و معروف فلسفی اور ریاضی دان مرزا عبدالرحمٰن سے علوم عقلی حاصل کئے- آصف الدولہ غلام رضا خاں شاہ سون ایران کے بہت بڑے امیر اور بہار کی جوانی میں خراسان کے حاکم تھے- انہوں نے بہار کی طبع رسا کو بھانپ لیا اور اپنی شفقت اور عنایات سے نوازنا شروع کیا- اسی امیر کے توسط سے مظفرالدین شاہ کی جانب سے بہار کو ملک الشعراء کا خطاب عنایت ہوا اور سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا-

قدرت کی طرف سے بہار کو حساس دل عطا ہوا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ محض شاعر ہونے کی حیثیت سے طبع آزمائی کرتے رہیں اور سخن سازی میں ہی اپنی زندگی صرف کر ڈالیں- ایک سچے شاعر کی طرح اپنے ماحول سے غافل نہیں تھے- ان کا وطن سیاسی اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا- مطلق العنان بادشاہ اپنی عیاشیوں میں مگن تھا- حکام اور وزراء خود غرض اور عیاش تھے- عوام تباہ حال و پریشان تھے- دردمندوں کا دل حکومت کی بے نظمی اور لاقانونیت پر جلتا تھا- بہار وطن پرستی کے جذبات سے معمور تھے- انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی کو وطن کی آزادی اور ترقی کے لئے وقف کر دیں اور اپنی اس خداداد ذہنی استعداد اور طبع وقاد کو برادران ملت کی بیداری کے لئے وقف کر دیں-

سیاسی زندگی

1324ھ تک کا زمانہ ایران میں بڑے سیاسی ہیجانات اور انقلابات کا زمانہ تھا- بہار بھی ملک کی سیاسی زندگی میں شریک ہو گئے- انہوں نے جبل المتین' کلکتہ اور تہران اور باکو کے رسائل و

جرائد میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی گم نام انقلاب خیز مضامین و اشعار لکھے۔

مشروطیت کی تحریک شروع ہوئی تو وہ بھی مشروطہ طلبوں اور آزادی خواہوں میں شامل ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے مشہد میں تار گھر کے پناہ گزینوں کے سامنے مستبدین کے خلاف تقریر کی۔ چند ایک پرجوش اور روشن فکر نوجوانوں نے انجمن سعادت کی تشکیل کی۔ بہار بھی اس میں شامل ہوئے۔ اس انجمن کے جلسوں میں ان کی شخصیت ابھری اور انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جن کی وجہ سے وہ تھوڑے ہی عرصہ میں خاص و عام میں مشہور ہو گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے روزنامہ "حراسان' طوس اور خورشید" میں مقالات بھی لکھے اور پرجوش اشعار بھی شائع کئے۔ اسی دوران میں حیدر خان عمو اوغلی مجاہد سے ملاقات ہوئی جس نے ڈمکراٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1333 میں بہار ورگز اور کلات کی طرف سے مجلس شوریٰ ملی کے نمائندے منتخب ہوئے۔ مجلس کے تیسرے سے چھٹے دور میں ہر بار اپنے حلقہ سے رکن منتخب ہو کر آتے رہے۔

بہار اپنی سیاسی زندگی میں کئی مرتبہ حکومت کی سختیوں کا شکار ہوئے۔ قید و بند اور جلاوطنی کے مزے چکھتے رہے۔ وہ 1330 میں اپنے نو دوستوں کے ہمراہ مشہد سے تہران جلاوطن کر دیئے گئے اور ایک سال کے بعد ان کو مشہد واپس جانے کی اجازت ملی۔ 1333ھ میں وہ ہجرت کر کے جا رہے تھے کہ قم میں پہنچ کر ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا تہران میں واپس ہوئے تو انگریزوں اور روسیوں کے دباؤ کی وجہ سے پھر تہران سے نکالے گئے اور چھ مہینے تک بجنورد میں ٹھہرے رہے۔ سید ضیاء الدین کے دور حکومت میں وہ تین مہینے کے لئے شمیران کے کسی گوشے میں نظر بند رہے۔ سلطنت پہلوی کے آغاز میں ایک مہینہ کے لئے قید رہے۔ 1312 شمسی میں پانچ ماہ کے لئے تہران میں دوبارہ جیل میں نظر بند رہے اور اس کے بعد ایک سال کے لئے اصفہان میں اپنے کنبے سمیت جلاوطن رہے۔

صحافتی زندگی

شوال 1328ھ میں بہار نے مشہد میں نوبہار کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ یہ پرچہ ڈمکراٹ کے سیاسی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ اس میں ایرانی امور

میں حکومت روس کی دخل اندازی کے خلاف تیز و تند مقالات لکھے گئے۔ چنانچہ ایک سال کے بعد ربیع الاول 1329ھ میں روسیوں کے دباؤ پر یہ پرچہ بند کر دیا گیا۔ بہار نے ذی الحج 1329 میں ایک اور ہفت روزہ اخبار "تازہ بہار" کے نام سے جاری کیا' یہ بھی محرم 1330 میں بند کر دیا گیا اور بہار اپنے چند ڈمکراٹ پارٹی کے فعال کارکنوں کے ہمراہ تہران میں جلاوطن کر دیئے گئے۔ 1331ھ میں بہار پھر مشہد لوٹ آئے اور روزنامہ "نو بہار" کو پھر جاری کیا۔ نو مہینے کے بعد حکومت کی طرف سے پھر جبراً اس کی اشاعت روک دی گئی۔ 1333ھ میں جب وہ مجلس شوریٰ ملی کے نمائندہ ہو کر تہران گئے تو انہوں نے روزنامہ "نو بہار" کو پھر شروع کیا۔ لیکن وہ محرم 1334 میں بند کر دیا گیا۔ 1335ھ میں ایک روزنامہ "زبان آزاد" کے نام سے جاری ہوا۔ یہ اخبار "نو بہار" کے خریداروں کے نام بھیجا جاتا تھا۔ روزنامہ "نو بہار" فروردین 1336 تک چھ مرتبہ شائع ہوا۔پانچویں اور چھٹے دور میں اس کی حیثیت ادبی و تاریخی رہ گئی تھی۔ آخر کار صرف 34 شمارے نکل کر اسکی زندگی ختم ہو گئی۔ 1336 میں بہار نے "دانش کدہ" کے نام سے ایک ادبی و تاریخی مجلّہ جاری کیا۔ اس میں "دانش کدہ" کے مشہور استاد اور دوسرے ادیب تحقیقی مقالات لکھتے رہے اور اروپائی شعراء و مصنفین کی نگارشات کے ترجمے بھی شائع ہوتے رہے۔ یہ مفید اور علمی رسالہ صرف بارہ شمارے نکال کر 1297 شمسی میں بند کر دیا گیا۔

1296 سے 1299 شمسی تک یعنی تین سال کے لئے بہار اپنے بھائی محمد ملک زادہ کی معیت میں روزنامہ "رسمی ایران" کے مدیر بھی رہے۔

رضا شاہ پہلوی کی مستقل اور پائیدار حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کر لی اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک سال کے لئے دارا لمعلمین عالی میں درس بھی دیتے رہے۔

1315 شمسی میں تہران یونیورسٹی میں ادبیات فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ 1335 میں جب قوام السلطنت وزیراعظم ہوئے تو بہار کو وزیر تعلیم بنایا۔ 1327 میں بیمار ہو کر سوئٹزر لینڈ گئے۔ 1328 میں واپس آئے۔ اس کے بعد ان کی صحت بحال نہیں ہوئی۔ آخر 1330(1951ء) میں اجل نے آلیا۔

تالیفات و تصانیف

مندرجہ ذیل کتابیں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیں:

۱۔ مجمل التواریخ القصص

2- جوامع الحکایات عوفی
3- سیستان
4- رسالہ النفیس ارسطاطالیس، ترجمہ افضل الدین بامقدمہ مفصل
5- تاریخ بلعمی

تصانیف تحقیقی

1- تاریخ مختصر احزاب سیاسی یا انقراض قاجاریہ
2- تدوین رسالہ در احوال مانی
3- سبک شناسی یا تطور نثر فارسی 3 جلد
4- رسالہ در شرح حال حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی
6- تاریخ تطور نظم

ادبی

رمان نیرنگ سیاہ یا کنیزان سفید

مقالات تحقیقی و علمی

1- نقاشی و تذہیب کاری در ایران	روزنامہ طوفان ہفتگی
2- خط و زبان پہلوی در عصر فردوسی	در فردوسی نامہ
3- ادبیات ہند	سال چہارم مجلہ مہر
4- بازگشت ادبی	سال 1310، مجلّہ ارمغان

اس کے علاوہ دوسرے بے شمار ادبی، علمی، سیاسی اور اجتماعی مقالات جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

بہار تین سال پروفیسر ہر تسفلد الحانی کے پاس فارسی قدیم اور پہلوی کا مطالعہ کرتے رہے اور خطوط میخی، آرامی اور پہلوی بھی سیکھتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلوی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد یادگارز ایران کا ترجمہ فارسی نثر میں اور اندرز آذر پد مارسفندان کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا۔ دیگر پہلوی کتابوں کے ترجمے مندرجہ ذیل ہیں:

1- رسالہ مادیکان شترنگ و "چارش چترنگ"
2- اور تین شہ دھرام در چاوند (قصدہ دو از دہ ہجائی)
3- قطعہ دارک خرسندیہ
4- رسالہ ماتیکان ہپت امہرسپنت

دیوان

قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ ملا کر کل اشعار کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر نظمیں مجلات و جراید میں چھپ چکی ہیں۔ 1311 میں انہوں نے اپنا دیوان چھپانا چاہا تھا۔ لیکن پولیس اور محکمہ سنسر کی طرف سے حکم امتناعی جاری ہوا اور جتنے صفحے چھپ چکے تھے وہ بھی ضبط ہوگئے۔

شاعری

بہار سات سال کے تھے کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلا شعر انہوں نے شاہنامہ کے حاشیہ پر لکھا تھا:

تہمتن بپوشید ببربیان
بیامد بمیدان چو شیر ژیان

عید نوروز کے موقع پر یہ شعر کہا:

عید نو روز آمد و ماہ مبارک شد تمام

موسم شادی وعیش آمد زبہر خاص و عام

ناصرالدین شاہ کی وفات کے بعد بہار کے والد کا خیال تھا کہ اب شعرو شاعری بیکار مشغلہ ہو گا۔ اس کی قدر منزلت نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ بہار کو شعر کہنے سے منع کرتے تھے اور تجارت میں ڈالنا چاہتے تھے۔

باپ کی وفات پر جب مظفرالدین شاہ کی طرف سے انہیں منصب و لقب عطا ہوا تو انہوں نے رواج کے مطابق عید میلاد کے موقع پر سلام لکھا اور جس سے معاصرین میں ان کی فطری استعداد کا چرچا ہوا۔ ان کا پہلا قصیدہ جس کو سن کر حریف محو حیرت ہوئے وہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

آمد چو دو نیمه برفت از شب
آن ساده بنا گوش سیم غبغب

اس مشکل بحرو وزن میں شعر نکالنا استادانہ قدرت کے سوا نہیں ہو سکتا تھا اس کے بعد اس کی پختگی کلام کی دھاک بیٹھ گئی۔

بہار نہ صرف ایک بلند فکر شاعر' ایک قابل اخبارنویس اور عمدہ نثر نگار تھے بلکہ وہ ایک فدا کار انقلابی بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے قلم اور زحمت جسم و جان سے اپنے وطن کی ترقی اور برادران وطن کی آگاہی اور بیداری کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں اپنے کارہائے نمایاں کا احساس تھا اور انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں انہوں نے مبالغہ نہیں کیا:

دری زمن گشت نامجوی
یافت زمن شاعر و شعر آبروی
نظم من آوازه بکشور افگند
نثر من آئین کهن بر فگند
درس نوینی بوطن داده ام
درس نو این است که من داده ام

بہار ان بلند فکر مجددین میں سے ہیں۔ جنہوں نے شاعری کو پرانی اور فرسودہ روش سے ہٹا کر ایک روشن اور جدید نہج پرلا ڈالا۔ کلاسیکی ہیئت کو برقرار رکھا مگر روایتی مضامین فکر کو بالکل بدل ڈالا۔ بہار کی نظرمیں شعر کی ایک غایت ہے۔ شاعر کی قوت فکر محض لطیفہ سرائی۔ خوش گوئی اور

تعیش دماغی کے لئے صرف نہیں ہونی چاہئے ان کے خیال میں ایسی شاعری جو دماغوں کو ماؤف اور دلوں کو مدہوش کرے زہر قاتل ہے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دل درد آشنا ہو اور اپنے نور سخن سے دنیا کو اجالا بخشے۔ انہوں نے لکھا:

چو باشد دل شاعر سوخته
جهان گرد و از شعرش افروخته
خواهی کو شوی در هنر استاد زمانه
درمکتب دل عشق بیاموز

کسی دوسرے مقام پر قلم و شعر کی یوں توضیح کی ہے:

طبع تو چنگ است وخرد زخمه اش
شعر بلندت ازلی نغمه اش
ای قلمت هدیه پروردگار
هدیه ایران بپذیر از بهار

بہار شعر میں اخلاص و شوریدگی کے قائل تھے اور اس کے تاثیر کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اگر شعر میں یہ چیزیں نہیں تو وہ شعر نہیں بلکہ فقط نظم ہے ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے شعرو شاعر کے بارے میں اس نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے:

شعر دانی چیست مرواریدی از دریای عسل
شاعر آن افسون گری کاین طرفه مروارید سفت
صنف و وزن قوافی هست نظم و نیست شعر
ای بسا ناظم که **نظمش** نیست الا خرف مفت
شعر آن باشد که خیزد از دل و جوشد زلب
باز در دل **هانشیند** هر کجا گوشی **شنفت**
ای بسا شاعر که او درد عمر خود نظمی نساخت
وی بسانظم که او در عمر خود شعری نگفت

بہار شعر کی ملی حیثیت سے باخبر تھے۔ اب زمانہ آگیا ہے کہ عوام اس کی حمایت کریں اور سمجھیں کہ ان کی سیاسی' اجتماعی اور اقتصادی آزادی ادبیات کی رہین منت ہے۔ اور وہی مصنف یا شاعر مرغوب اور رائج ہو گا جس کا ہنر عوام کا غمخوار ہے اور ان کی حیات و حرکت کی طرف

رہنمائی کرتا ہے۔

بہار نے شاعری میں اپنے اسلوب کے متعلق خود لکھا ہے کہ ان کے والد سبک خراسانی ترکسانی میں لکھتے ہیں۔ خود انہوں نے درمیاں کے عرصہ میں مطبوعہ اور خطی نسخوں سے نظم و نثر کا غور سے مطالعہ کیا اور تقریباً بیس ہزار اشعار اپنی یاد داشتوں میں محفوظ کر لئے اور پھر خود سبک حراسانی کا تتبع کیا۔ متانت اور جزالت کے اعتبار سے ان کے قصاید پرانے استادوں کے برابر رکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سیاسی و اجتماعی مضامین کے لئے کلاسیکی طرز کے قصاید ناکافی شمار ہوتے تھے۔ اس لئے میں نے سبک معاصر کو بھی اپنایا اور سب عراقی کو بھی کام میں لایا۔ چنانچہ مستزادوں، مسمطوں یا قطعات و رباعیات اور عوام پسند مثنویوں اور غزلوں میں موضوع کے مطابق ہر سبک میں طبع آزمائی کی۔ علامہ دھمذانے لکھا تھا کہ:

"مرحوم ملک الشعراء بہار بزرگ ترین شاعر معاصر سبک خراسانی است و میتوان گفت کہ در طویل چہار پنج قرن اخیر شاعری باین قریحہ و ذوق در سبک نبودہ است۔"

بہار نے غزل قصیدہ اور مثنوی جو کچھ بھی لکھا ہے، مقاصد بلند کو اپنی نظر میں رکھا ہے اپنے افکار و خیالات کو وطن اور اہل وطن کے لئے درد بھرے دلکش انداز میں بیان کیا ہے ان کے قصاید جاہل اور فریبہ دل امراء کی ستائش میں نہیں لکھے گئے بلکہ وہ حسین اور پر کیف نظمیں ہیں جو ان کے دانشمندانہ سیاسی واخلاقی فکر سے معمور ہیں۔"پیام بہ سراو وارد گری، بث المشکوی، کیہان اعظم، قصیدہ حمانسی کہ در موقع حملہ محمد علی شاہ مخلوع سرودہ است" ان کے مشہور و معروف قصاید ہیں یہ وہ قصاید ہیں جو لطافت، فنی مہارت کے علاوہ اور سوز درونی کے اعتبار سے بھی دل آویز نظمیں شمار ہوتی ہیں۔ "قصیدہ دماوندیہ" تو مقابلے کے لئے پیش کیا گیا کہ جو شخص اس کے تتبع میں بہتر نظم لکھ سکے پچاس اشرفی انعام پائے بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی نظم بھی اسکے پایہ کو نہ پہنچ سکی۔

مجلّہ آیندہ میں فتح دہلی کے موضوع پر نظمیں لکھنے کا انعامی مقابلہ ہوا۔ اس میں بھی بہار کا قصیدہ اول درجے میں شمار ہوا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

دو چیز است شائستہ نزدیک من
رفیق جوان و رحیق کہن

مازند ران اور بہاریہ وہ قصاید ہیں جن میں قدرت کی رعنائیوں کی تصویریں ہیں۔ شاعر کی لطافت تخلیل اس کی حسین تشبیہوں سے ظاہر ہے۔ سوز دروں کی آمیزش نے نظموں میں

جان ڈال دی ہے اور وطن کی چاشنی بھی بڑی مرغوب ہے۔

"چہار خطابہ" کے عنوان سے دو سو شعر پر مشتمل بہار کی ایک مشہور مثنوی ہے جو رضا شاہ کبیر کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔ اس میں تاریخ ایران و مقام ایران بیان کر کے اصلاح امور کی ترغیب دی ہے۔ گویا ایک وطن پرست کا تڑپتا ہوا دل کاغذ پر نکال کر رکھ دیا ہے۔ مثنوی کے اشعار اپنی گہرائی اور پختگی کے اعتبار سے شاعر کی فنی مہارت پر دلالت کرتے ہیں۔

اپنے زمانے کے غزل گویوں میں بہار کا مرتبہ بلند ہے۔ پرانے انداز کی غزلوں میں تو وہی روایتی مضامین ہیں جو متقدمین کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان غزلوں میں بھی استادانہ مہارت جھلکتی ہے اور ہر غزل ان کے اپنے قول کے مطابق ہم آہنگ چنگ و سرود، نئے رنگ کی جو غزلیں ہیں، ان میں سیاسی و اخلاقی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان میں ظرافت کی ہلکی چاشنی، شگفتگی اور لطافت آگئی ہے۔ مثلاً یہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

دلفریبان کہ بکا بینہ جان جا دارند
مستبدانہ چرا قصد دل ما دارند

اور یہ شعر:

دلبران خودسر و ہر جائی و روسی صفتند
ورنہ در خانہ غیر از چہ سبب جا دارند

بہار نے ترانہ ملی اور تصانیف لکھنے میں کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے ان کے یہ ترانے بہت پسند کئے گئے اور خواص و عام میں مقبول ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر گراموفون ریکارڈوں میں محفوظ کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ دو تصانیف بہت دلکش ہیں۔ جن کے ابتدائی اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

زمن نگارم خبر ندارد
بحال زارم نظر ندارد
مرغ سحر نالہ سر کن
داغ مرا تازہ تر کن

مجموعی طور پر بہار کے اسلوب بیان کے متعلق مندرجہ ذیل رائے مناسب اور جامع ہے۔

"شعر ملک الشعراء درعین دوری از ہر گونہ تکلف و تصنع زیباست ودرعین زیبائی رسا و روان و فصیح۔ معانی تازہ و تشبیہات بدیع و توصیفات عالی و تمام باستعمال الفاظ اصیل و فصیح و ترکیبات

صحیح از مختصات شعری اوست۔ او دقت نظر و باریک اندیشی و لطف تخیل و زیبائی کم نظیر دارد و تنافر و تعقید در لفظ و معنی او نیست۔ جمال اسلوب را باکمال معنی در هم میا میزد۔"(i)

پروین اعتصامی

(ایک بالغ نظر شاعرہ)

پروین اعتصام الملک مرزا یوسف خان کی بیٹی تھی۔ یوسف اعتصامی ایران کے نامی گرامی فضلا میں سے تھے۔ جنہوں نے پریس، جرائد اور کتاب خانہ کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ پروین 1285 ش میں پیدا ہوئی اور بچپن میں باپ کے ساتھ تہران میں آ گئی۔ اپنے والد اور نجی طور پر دوسرے استادوں سے فارسی، عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ امریکائی دختران میں داخل ہو کر اس کا نصاب پورا کیا اور ہر سالانہ امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہوئی۔

1313 میں اس کی شادی ہوئی لیکن اڑھائی مہینے سے زیادہ کرمانشاہ میں اپنے شوہر کے ساتھ نہ رہی اور شاید نو ماہ بعد اس سے الگ ہو گئی۔ 1320 ش میں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر بارہ روز کے بعد وفات پا گئی اور قم میں مدفون ہوئی۔

تاریخ ادبیات فارسی میں شاعرات کا بھی ذکر آتا ہے۔ مگر پروین اعتصامی جیسی بالغ نظر پختہ گو اور لطیف بیان شاعرہ تو آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ جوانی میں ہی حکیمانہ نظر کا پیدا ہو جانا عطیہ خداوندی ہے۔ ایران کے لئے ایسی باکمال شاعرہ یقیناً قابل فخر ہے۔

پروین کا دیوان قصاید و مثنویات و قطعات مرتب ہو کر تیسری مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اشاعت اول میں ملک الشعراء محمد تقی بہار نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔

قصاید

قصاید مدحیہ نہیں بلکہ صرف ہیئت قصیدہ کی ہے۔ یہ قصاید عموماً ناصر خسرو اور سعدی کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔ سعدی کا اثر نمایاں ہے۔ پند و موعظت کا انداز بھی سعدی کا ہے یعنی یہ کہ دنیا ناپائیدار ہے زندگی فانی ہے اس دنیا پر بھروسہ کر کے عیش و نشاط میں عمر نہیں بسر کرنی چاہئے۔ حرص و آز کا شکار ہو کر شیطان کی راہ نہیں چلنا چاہئے۔ مندرجہ ذیل قسم کے اشعار پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ پروین دنیا کے ساز و سامان سے تمتع کرنے سے منع کرتی ہے اور معرکہ زندگی سے فرار کا سبق سکھاتی ہے۔

ای شدہ شیفتہ گیتی و دوارنش

دہر دریاست بیندیش زطوفانش
آنکس کہ چو سیمرغ بلی نشانست
از رہزن ایام در امانست

لیکن پروین کی نظر صرف مادی اسباب کی فنائیت اور بے ثباتی پر تھی۔ اس نے صرف انہیں اسباب مادی میں منہمک رہنے اور عاقبت کی فکر نہ کرنے کی مذمت کی ہے۔ یہ سبق نہیں دیا کہ زمانہ ناساز گار ہے اس لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پڑے رہو اور کام نہ کرو۔ اس کے اشعار میں جابجا کاہلی و غفلت پر سرزنش اور سعی و عمل کا پیغام موجود ہے۔ مثلاً:

می جوی گرچہ عزم توز اندیشہ برتراست
می پوی گرچہ راہ تو در کام اژدہا است

پروین کا انسان ایک مجسمہ اخلاق ہے جو درویش صفت، پاکباز، شریف اور خدمت گزار ہے۔ پروین کا پیغام امید، آرزہ، عمل، کسب کمال وہنر، نیکی، ہمت اور اغتنام وقت ہے۔

مثنویات و قطعات

اس دیوان کی اکثر مثنویاں اور قطعات سوال و جواب اور مناظرہ کی شکل میں ہیں۔ مناظرہ لکھنے کا رواج شعرائے متقدمین میں خصوصاً اسدی طوسی سے آغاز ہوا ہے اور پھر سعدی اور خواجوی کرمانی تک جاری رہا۔ اس کے بعد پھر گویا بات کہنے کا یہ انداز متروک ہوگیا۔ پروین کی نظموں میں کبھی تو دو آدمی آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور کبھی حیوان جیسے مرغ و ماہی، مور و مار اور کبھی جمادات و نباتات بھی مناظرہ پر اتر آتے ہیں مثلاً خاک و باد، ابروباراں، دام و دانہ اور چشم و مژگان وغیرہ، انسانوں کی گفتگو میں ڈرامائی انداز مضمون کو دلچسپ بنا دیتا ہے لیکن حیوانات اور جمادات کا آپس میں مناظرہ دقیانوسی زمانے کی یاد دلاتا ہے جب کلیلہ و دمنہ اور حکایات لقمان کا رواج تھا تو جانوروں کی کہانیوں اور تمثیلوں سے سیاسی نظامی اور معاشرتی سبق سکھائے جاتے تھے چونکہ انسانی فکر ارتقا پا چکی ہے اس لئے حیوانات اور جمادات میں گفتگو کا یہ انداز عجب سا معلوم ہوتا ہے لیکن عصر حاضر کا ہر شخص جو اپنے آپ کو دانا اور جہاندیدہ سمجھتا ہے اس کو براہ راست پندو موعظت کے اسباق پڑھانا شاید اتنا دور رس نتیجہ پیدا نہ کرتا۔ شاعرہ نے حسن تخیل اور لطافت بیان سے مکالمہ کی صورت دے کر تلخ نصیحتوں کو شیریں بنا دیا ہے۔ اس کے مخاطبین

نوجوان مرد عورتیں اور بچے ہیں اس لئے نصیحت کا یہ انداز دلچسپ اور مفید ہے۔

پروین "مادر دور اندیش" ہے وہ انسانیت دوست درد بھرا دل رکھتی ہے اسے اپنی بہنوں سے بچی ہمدردی ہے۔" زن در ایران" میں وہ بیرونی حجاب کی بجائے ان کو چشم و دل کا حجاب کرنے کی نصیحت کرتی ہے۔ اور زیور کے بجائے سادگی پاکی اور عصمت کے جواہر سے مرصع دیکھنا چاہتی ہے۔ بیواؤں پر اس کا دل پسیجتا ہے۔"شکایت پرزن" میں اس کا اظہار ہے وہ طفل یتیم پر خود بھی روتی ہے اور دوسروں کو بھی رلاتی ہے۔ وہ ظالموں اور جابروں پر بھی طنز و تعریض کے تیر برسا کر ان کو شرمسار کرتی ہے۔ اگرچہ پروین نے براہ راست وطن کی آزادی، ملی بیداری اور وطنی امور پر نظمیں نہیں لکھیں لیکن اس کی مثنویوں میں بالواسطہ حاکموں اور برسراقتدار لوگوں کی اخلاقی پستی کے نشانات ملتے ہیں۔ مثلاً:

چو زور مند شدیم از دہان مسکینان
بہ جبر لقمہ ربودیم و در گلو کردیم
زرشوہ اسب خریدیم و خانہ و دہ باغ
باشک بیوہ زنان حفظ آبرو کردیم

ایک سرکاری ملازم کی بیٹی ہوتے ہوئے اس کی یہ جرات تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ علانیہ بدکردار وزراء اور امراء اور بادشاہ کا نام لے کر ان کے خلاف لکھے لیکن اس کا حساس دل اپنے ماحول سے غافل نہیں رہا اور وطن پر جو تباہی و بربادی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بادشاہ کو بھی باخبرو تنبیہہ کرنے سے نہیں رک سکی۔ مثلاً

بترس زآہ ستمدیدگان کہ دردل شب
نشستہ اندکہ نفرین بہ پادشاہ کنند
چو شاہ جور کند خلق در امید نجات
ہمی حساب شب و روز و سال و ماہ کنند

پروین نے کوئی غزل نہیں لکھی اور اگر لکھی ہے تو دیوان میں شامل نہیں کی۔ یہ تو شاید نہ کہا جا سکے کہ اس کے دل میں عشق و محبت کے جذبات نہیں تھے یا اس کو کسی سے محبت نہ تھی لیکن اگر وہ غزل کے روایتی انداز میں زلف و رخسار، وصل و فراق، رشک و حسد کی فرضی داستانیں بیان کرتی تو یہ طریق اس کی پاکباز شخصیت کے منافی ہوتا اس کو انسان سے عشق ہے جو سچے اور پر خلوص جذبات سے معمور ہے اس لئے وہ شخصیت اور واقعیت پر مبنی خیالات و افکار

کا اظہار کرتی ہے۔

پروین کی زندہ و پابندہ نظموں میں سے جو عارفانہ نکات کی حامل ہیں اور ادبیات فارسی میں عالی مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ سفر اشک' کعبہ دل' روح آزاد' دیدہ و دل' گوہر و سنگ' حدیث مہر وغیرہ۔

سارے دیوان کا ایک دھیما توازن اور متین اسلوب بیان ہے۔ تخیل واضح اور قطعی ہے۔ افکار کی شاعرانہ شوخی اور رعنائی نہیں ہے۔ جوش کم ہے۔ صداقت واخلاص زیادہ ہے۔ نصیحتیں بے لطف اور بے اثر معلوم نہیں ہوتیں۔ قصاید میں تکرار' خیالات اور بحور کی یکسانیت کی وجہ سے دل بستگی کچھ کم ہو گئی ہے۔ لیکن مثنویات اور قطعات تنوع مضامین کی وجہ سے دلچسپ ہیں۔

ملک الشعراء بہار نے پروین اعتصامی کے متعلق بڑی جچی تلی رائے کا اظہار کیا ہے جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"از چند قرن ببعد، یعنی بعد از فتنہ مغول تا امروز' زنی بہتر از پروین اعتصامی شعر نگفتہ است باین سبک دردش و با این ہمہ افکار روشن و احساسات صادق در است و مفید..... پروین اعتصامی دارای طبع طبیعی و خداداد بود و بقوہ طبع و قریحہ ذاتی شعر گفت! نہ از راہ تربیت و خدمت استاد' از روی تتبع و تصنع و مطالعہ در قطعات و مثنویات مختصر اوست شخصیت او در قطعہ ہا زیاد تر پدیدار است۔"

عارف قزوینی

(تصنیف ساز)

عارف کا نام ابوالقاسم تھا۔ 1300ھ قزوین میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملا ہادی وکیل تھے۔ عارف نے اپنی خود نوشت داستان حیات میں اپنی بدبختیوں کا موجب اپنے باپ کو ٹھہرایا ہے۔ عارف نے یہ بھی لکھا ہے کہ والدین میں سخت ناچاقی رہتی تھی اور وہ ببر شیروں کی طرح آپس میں غراتے اور دست و گریبان ہوتے تھے۔ اس قسم کے خانگی ماحول میں بچوں کی تربیت میں بڑا زہر ناک اثر پڑا۔ عارف پیشہ وکالت کو بھی بدترین پیشہ سمجھتے تھے کیونکہ وکیل بددیانتی اور خیانت

کرنے سے نہیں چوکتے۔ انہوں نے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ ان کے والد نے ان کی ماں سے یتیموں کا وہ متروکہ مال جو ان کو اپنے ماموں سے "ونیتا" کے حوالہ سے ملا تھا' قانونی چالاکی سے ہتھیا لیا اور وہ یتیم بچے صحیح تربیت سے محروم رہ گئے۔

عارف نے مروجہ تعلیم قزوین میں ہی حاصل کی۔ جوان ہوئے تو غم و الم کی زندگی شروع ہو گئی۔ چند ایک ہونہار مخلص اور بچپن کے دوست جو ان کو بھائیوں سے زیادہ عزیز تھے' جنگ آزادی میں ایک ایک کر کے مارے گئے تو ان کو بڑا رنج ہوا۔ عبدالرحیم خان اس کے ایک عزیز دوست نے خودکشی کر لی تو ان کا غم جنون کی صورت اختیار کر گیا چنانچہ وہ معالجہ کے لئے اپنے چچا حیدر خاں کے پاس بغداد گئے۔

عارف نے حسن خط میں بھی مشق بہم پہنچائی اور قزوین میں ہی حاجی صادق خاں فرازی سے چودہ مہینوں تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ قدرت نے عارف کو لحن داؤدی بھی عطا کیا تھا اس لئے باپ نے ان کو روضہ خوانی یا نوحہ خوانی پر لگا دیا۔ دو تین سال یہی شغل رہا۔ باپ کی وفات کے بعد اس کی میت کو کربلا بھیجا اور اس کی وصیت کے خلاف کہ باقی ماندہ مال کو روضہ خوانی میں صرف کیا جائے' عارف نے جذبہ انتقامی کی وجہ سے خورد برد کیا اور وہ باغ جو اس مقصد کے لئے وقف ہوئے ان کے انگوروں سے شراب بنائی۔ خود پی اور دوسروں کو پلائی۔

عارف نے اپنے پہلے عشقیہ رومان کا بیان بڑے پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ شیخ علی شال اس کے معلم ہمسائیگی میں ایک حاجی رضا خاں رہتے تھے ان کی خوبصورت بیٹی سے محبت ہوئی اور چپکے چپکے اس سے نکاح کر لیا۔ مگر اس زمانہ کی سخت رسمی پابندیوں کے پیش نظر ماں باپ نے لڑکی کو گھر میں ہی بند رکھا۔ عارف خود سماج کی لعن و ملامت اور تعصب و استبداد سے گھبرا کر ایک سال تک رشت میں مقیم رہے۔ واپس آئے تو گھنٹہ بھر کے لئے خفیہ ملاقات ہوئی لیکن ازدواجی زندگی کا کوئی راستہ نہ نکل سکا۔ لڑکی کے باپ کو خبر ملی تو اس نے لڑکی کو دور دہات میں بھیج دیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے پھر ملاقات کی تو اس کو جان سے مار ڈالا جائے گا۔

1316ھ میں عارف صدر الاسلام کی معیت میں قزوین سے تہران گئے اور ان کی وساطت سے امراء وزراء کی مجلس میں باریابی ہوئی۔ وثوق الدولہ نے عارف کی دل سوز آواز سے متاثر ہو کر ان کو اپنی ملازمت میں رکھنے کی فرمائش کر دی۔ عارف کو ایک سال تک بادل ناخواستہ وثوق الدولہ کی مصاحبت میں رہنا پڑا۔ اس دوران میں مرزا علی اصغر خاں اتابک اعظم سے تعارف ہوا۔ انہی کی وساطت سے بادشاہ کی مجلس میں رسائی ہوئی۔ عارف نے دو غزلیں گا کر سنائیں تو پانچ سو

تومان مرحمت ہوئے اور فراشی خلوت کی خدمت متعین ہوئی۔ عارف کو یہ پابندی سخت ناپسند تھی نائب اگالصدر عارف کے مشیر' دوست اور محسن تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق عارف ان کے گھر بیمار پڑ گئے۔ وثوق الدولہ ان کی حاضری پر مصر تھے تو نائب صدر نے ان سے کہا۔

"یہ بے چارے بیمار اور دکھیا ہیں۔ ایک لڑکی سے خفیہ بیاہ کیا ہے باپ نے لڑکی کو قید کر رکھا ہے اور سخت مجبور ہے۔ حاکم قزوین کے نام فرمان بھیجا جائے تاکہ اس کی منکوحہ اس کے سپرد کی جائے تاکہ وہ مطمئن ہو کر آپ کی خدمت بجالا سکے۔"

نائب الصدر نے خود وعدہ کیا کہ وہ اپنے مکان کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا مکان اور خادمہ مہیا کرے گا۔ چنانچہ وثوق الدولہ کی وساطت سے فرمان حاصل ہوا لیکن قزوین جا کر عارف نے ارادہ بدل لیا۔ سوچا میں آوارہ شرابی اور بے زر ہوں۔ جب لڑکی والے مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں تو دوسروں کا محتاج اور زیر احسان رہ کر کب تک زندگی بسر کر سکوں گا۔ اسی کشمکش میں اس نے جی کڑا کر کے نائب الصدر کو اطلاع دیئے بغیر لڑکی کو طلاق نامہ بھجوایا۔ بعد میں لڑکی کا باپ مر گیا اور عارف سے کہہ گیا کہ رجوع کر لو مگر اس کی خود داری نے گوارا نہ کیا۔ کیونکہ لوگ کہیں گے کے باپ کا متروکہ مال حاصل کرنے کے لئے اب یہ کام کیا ہے۔

عارف ایک اور حسینہ کے عشق میں بھی گرفتار ہوا۔ وہ ساحرہ ہرجائی تھی۔ جس امیر درباری یا حاکم کی نظر پڑتی وہی سوجان سے فدا ہو جاتا اور کسی نہ کسی ترکیب سے حاصل کر کے داد عیش دیتا۔ عارف نے بھی اس کے ہمراہ عیش کی گھڑیاں گزاریں۔ آخر وہ مرزا مسعود قزوینی کے گھر میں پڑی تھی اور چھپے چوری عارف سے بھی ملاقات کرتی تھی۔ مرزا مسعود کو معلوم ہوا تو اس نے موقع پا کر اس کو اور اس کی بہن کو قتل کروا کر کنوئیں میں پھینکوا دیا۔

عارف کا عشق و شہوت بھرا دل حسن کا شیدائی تھا۔ اس کا لحن داؤدی حسینوں کے دلوں میں جذبہ الفت ابھارنے میں اس کا معاون تھا اور ناصرالدین شاہ کی دو بیٹیاں افتخار السلطنت اور تاج السلطنت بھی اس کے دام عشق میں گرفتار ہو گئیں۔ یہ دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور اپنے ہرجائی شوہروں سے ناخوش۔ مگر عارف بیچارے غریب کی رسائی ان تک کیسے پائدار رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ان شاہزادیوں سے محبت کی داستانیں ہنگامی واقعات بن کر رہ گئی۔ عارف نے افتخار السلطنت کے متعلق لکھا ہے۔

افتخار همه آفاقی و محبوب منی
شمع جمع همه عشاق دہر انجمنی

اور تاج السلطنت کے متعلق لکھا ہے:

خوشم که فقر بمن تاج سلطنت بخشید
وزین ببعد شهنشه گدای من شده است

1342ھ میں عارف بہت بیمار ہو گئے۔ آٹھ نو مہینے تک بروگرو میں رہے پھر ہمدان میں کافی عرصہ بے حال و بے کس پڑے رہے۔ ان کو اپنی فلاکت اور کس مپرسی کا شدید احساس تھا۔ اپنے ایک نادیدہ دوست آقا محمد رضا خاں ہزار کو طویل خط میں لکھتے ہیں۔ تین وفادار کتوں کے سوا اس شدت کی سردی میں میرا کوئی ساتھی نہیں۔ میں شکستہ اور بوڑھا ہو گیا ہوں۔ برادران ملت کی غفلت اور قدر ناشناسی نے مضمحل کر دیا ہے وطن دوستی اور آزادی خواہی میں جان ہلکان کرنے والوں کو ملامت کرتے ہیں۔ ان کی مخالفت میں مقالات لکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ سرود ملی لکھنے والے شہرت کے بھوکے ہیں۔ ایسے کلمات پڑھ کر دل افسردہ ہوتا ہے۔ میں خودستا نہیں ہوں۔ لیکن یہ جاننا چاہئے کہ مادر ایران صدیوں میں ایسا سپوت پیدا نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ قدرت نے جو چار پانچ چیزیں مجھے عطا کی ہیں ان کا ایک فرد میں جمع ہونا بہت نادر ہے مثلاً یہ کہ ایک شخص استاد موسیقی بھی ہو' بے نظیر گویا بھی ہو' ساتھ ہی آہنگ ساز اور شعر ساز ہو اور سب پر طرہ کہ اپنے وطن کے لئے اس قدر شیفتہ ہو کر اس کی راہ میں سب کچھ قربان کر کے بھی مقام و مرتبہ کی آرزو نہ رکھتا ہو۔

عارف طویل علالت کے بعد 2 بہمن 1312 شمسی (1352ھ) ہمدان میں وفات پا گئے۔

عارف شروع جوانی سے ہی محب وطن' حساس اور مخلص انسان تھے۔ وطن کی خوش حالی میں خوشحال اور وطن کی بدحالی میں بدحال تھے۔ جب ایران میں مشروطیت کا آغاز ہوا تو پکار اٹھے۔

بیار باده که یک ملتی بهوش آمد

لیکن بادشاہ کا استبداد ریاکاروں' خائنوں اور وطن فروشوں کی بدعنوانیاں دیکھیں تو دل جل بھن گیا۔ وطن پرستوں کی خونریزی دیکھ کر عارف نے کہا:

یوسف مشروطه زچه برکشیدیم
آه که چون گرگ خود او را دریدیم

جنگ عظیم شروع ہوئی تو اتحاد دول اسلامیہ کا چرچا ہوا۔ وطن پرست ہجرت کر کے مغربی ممالک کو چلے گئے۔ عارف بھی استانبول گئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ دربدری محض خواری ہے۔ اپنے ملک میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن ایران میں بھی برا حال تھا۔ وطن روس و انگلیس کی

سیاسی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس آوارگی سے متاثر ہو کر عارف نے کہا:

عمرم گہی بہ ہجر و گہی در سفر گزشت
تاریخ زندگی ہمہ در درد سفر گزشت

آزادی آذر بائیجان اور تحریک خراسان کا آغاز ہوا تو عارف کی ہمدردیاں بھی آزادی خواہوں سے وابستہ رہیں۔ کرنل محمد تقی خاں جیسے جان باز سپاہی کے قتل پر عارف نے زندہ جاوید رباعی لکھی جو شہید کی پیشانی پر باندھی گئی۔

این سرکہ نشان سرپرستی است
آز اد و رہاز قید ہستی است
بادیدہ عبرتش بہ بیبید
کاین عاقبت وطن پرستی است

1906ء سے لے کر 1922ء تک کا زمانہ ایران کے لئے سراپا آفات و آلام کا زمانہ رہا۔ اس زمانہ کے متعلق عارف کے اشعار غم و اندوہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ شاعر کا غم زدہ دل حزن ویاس کے نغمے گاتا ہے۔

عارف صرف ایران میں ہی روشناس نہ تھے بلکہ ترکیہ' قفقاز اور بین النہرین میں بھی لوگ ان کے بہت قدر دان تھے اور اپنے وطن کے لئے ان کی خدمات جلیلہ کو سراہتے تھے۔ ایران میں لوگ ان کو بدبین سمجھتے تھے۔ خاص طور پر بادشاہ پرست حکام اور برسراقتدار طبقہ تو ان کا دشمن تھا۔ بہار نے تاریخ مختصر احزاب سیاسی میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عارف کے اشعار جریدہ ناہید میں شائع ہوئے۔ علماء اور سیاسی رہنما آتش زیرپا ہوئے اور اس کی تکفیر کرنی چاہی۔ لیکن مرحوم مدرس کے اثر و رسوخ سے ایسا نہ ہوا اور ناہید بند کر دیا گیا۔ عارف نے مخالفت سے بے پروا وطن دشمنوں اور استبداد پرستوں کے عیوب کو آشکار کیا اور عوام کو عبرتناک انداز میں آزاد و مستقل حکومت قائم کرنے کے لئے ابھارا۔ اپنے ملی ترانوں اور خداداد دل سوز آواز سے ان کو غفلت سے بیدار کیا اور ان کے احساسات ملی کو ٹھونکا دیا۔ جب رضا شاہ پہلوی کا زمانہ آیا تو عارف نے اس شاہنشاہ کے قومی و ملی کاموں کو سراہا۔ اس خیال سے کہ لوگ طعن کریں گے کہ اب بادشاہ کے جبر و قوت سے گھبرا کر تملق و خوشامد پر آیا ہے۔ شاہنشاہ کی حمایت میں چھوٹا سا مضمون لکھ کر آقا محمد رضا خاں ہزار کو وصیت کی کہ یہ چند سطریں اس کی وفات کے بعد شائع کی جائیں۔

عارف نے بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سعدی کی اکثر غزلیں ان کو زبانی یاد تھیں۔ ان کے تتبع میں انہوں نے اکثر غزلیں لکھی تھیں۔ لیکن ان کی کوئی نقل محفوظ نہ رکھی۔ عارف نے لکھا ہے کہ ان کے تلف ہو جانے کا مجھے افسوس نہیں' جب سے عشق وطن میں شعر کہنا شروع کیا ہے۔ البتہ یہ افسوس ضرور ہوا ہے کہ کیوں وطنی اور ملی اشعار کے علاوہ کچھ لکھتا رہا۔ دیوان میں جو غزلیں سعدی و حافظ کی تقلید میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ان میں **تکلفات** شعری کا التزام کیا ہے۔ اور بعض جگہ نامانوس تراکیب بھی آگئی ہیں۔ لیکن جن غزلوں میں عارف نے اپنا سادہ اور بلیغ طرز اختیار کیا ہے وہ بیان و معانی کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ عارف چونکہ موسیقی سے آشنا تھے۔ اس لئے ان کے قصاید اور غزلیات میں نہایت شیریں اور رواں دواں موزوں کلمات اور تراکیب ملتی ہیں۔ ایک ایک شعر خوش نوا آہنگ سے بھرپور ہے۔

عارف کی سب سے زیادہ شہرت اس کے ملی ترانوں اور تصانیف پر ہے۔ تصنیف ایسی نظم ہے جو مختلف بحروں میں لکھی جاتی ہے اس کی کوئی خاص وضع یا ہیئت نہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ساز و آہنگ کے ساتھ گائی جاتی ہے'۔ ابتدا میں مقامی بولیوں میں اس کا رواج رہا ہے۔ عموماً ہجویہ یا مذاحیہ انداز کے مضامین تصانیف کا موضوع سخن ہوتے رہے ہیں۔ علی اکبر شیدا (متوفی 1346ھ) نے اس کو منظم شکل دی اس میں عشق و محبت کے مضامین شامل کر کے اس کو تنوع بخشا اور اپنے مخلص درویشانہ ذوق سے اس میں جوش و سوز کا اضافہ کیا۔ چونکہ وہ خود باکمال سہ تارزن تھے اس لئے راتوں کی تنہائیوں میں موسیقی سے ہم آہنگ کر کے لکھتے تھے۔ عارف پہلا شخص ہے جس نے تصنیف کو قومی و ملی انداز بخشا اور اپنے احساسات آزادی اور جذبات انقلابی کو ایسے پر لطف اور پر سوز نغموں سے بھرپور کر کے پیش کیا کہ ایران کا گوشہ گوشہ اس کے نغموں سے گونج اٹھا۔ اچھی تصنیف کا کمال یہ ہے کہ جس آہنگ میں مصنف نے اس کو لکھا ہے اسی انداز میں گائی جائے۔ عارف کی زندگی میں شکراللہ' حبیب اللہ اور نائب اسد اللہ جیسے باکمال تارزن اور لے زن موجود تھے۔ جنہوں نے مصنف کی روح کو زندہ رکھا لیکن بعد میں اکثر ہر شخص اپنے لے میں پڑھتا کیونکہ ایران میں موسیقی لکھنے کا طریق رائج نہیں تھا۔ اس لئے اکثر حالتوں میں اصلی موسیقی قائم نہ رہ سکی۔

عارف کی تصانیف نہایت پر اثر اور پرسوز ہیں۔ پہلی وہ ہے جو جنگ آزادی کے آغاز میں نوجوانوں کی قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھی تھی اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

از خون جوانان وطن لالہ دمیدہ

دوسری تصنیف شوستر امریکائی کے نام پر ہے۔ مورگن شوستر وہ شخص تھے جنہوں نے ایران کی اقتصادی اور مالی اصلاح کے لئے نہایت مفید تجاویز پیش کی تھیں۔ لیکن وہ سیاسی سازش کے نتیجے میں ایران چھوڑنے پر مجبور کئے گئے۔ تصنیف کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

ننگ آن خانہ کہ مہمان زسر خوان برود

تیسری تصنیف کرنل محمد تقی خاں کی شہادت پر لکھی گئی تھی۔ تقی خاں بڑے جاں باز اور مخلص سپاہی تھے۔ جنہوں نے آذربائیجان، رشت اور خراساں کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور شہید کر دیئے گئے اس تصنیف کا آغاز یوں ہے:

گریہ کن کہ گر سیل خون گری ثمر ندارد

احمد کسروی ایران کے مورخ و محقق نے عارف کے بارے میں لکھا ہے۔

"عارف ایک آزاد منش مخلص غیرت مند اور دلیر آدمی تھا۔ اسے مال و دولت کی پروا نہیں تھی۔ تکلیف اٹھاتا مگر کسی کا احسان نہ لیتا۔ کبھی جھوٹ نہ کہتا۔ منافقت سے سخت بیزار تھا۔ جو دل میں ہوتا وہی کہتا۔ جسے جائز اور صحیح سمجھتا وہی کرتا۔"

عارف نے اپنے متعلق کہا:

"ممکن ہے میں نے ایران، ادبیات اور موسیقی کے لئے کوئی خدمت انجام نہ دی ہو لیکن جب میں نے تصنیف وطنی، لکھی اس وقت ہزار میں سے ایک ایرانی بھی وطن کے معنی نہیں جانتا تھا۔"

ایرانی موسیقی کے لئے سب سے بڑی کم نصیبی یہ ہے کہ وہ لکھی نہیں جاتی۔ شیدا کا بنایا ہوا آہنگ "در دل شب پیدا کردہ" یادوں سے محو نہ ہو جاتا۔ ممکن تھا۔ یہ حقیقت ہزار سال بعد زندہ رہتی اور اس کا نام زندہ رہتا۔

اس نے اپنے متعلق محمد ہزار شیرازی کو لکھا:

"قدرت نے چار پانچ چیزیں مجھے عطا کی ہیں۔ خیال ہے کہ گزشتہ شاید ہوں کسی کو ملی ہیں اور آئندہ کسی کو ملیں۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص استاد موسیقی ہو۔ بے نظیر مغنی ہو۔ نغمہ ساز ہو اور شاعر بھی ہو۔"

رضا زادہ شفق نے عارف کے بارے میں لکھا تھا:

"عارف میں آزادگی، صمیمیت اور حساسیت بدرجہ اتم موجود تھیں۔ عارف نے "سفارشی اور فروشی" اشعار نہیں لکھے۔ وہ ہمیشہ آزادی خواہی کے ساتھ قدم بقدم چلا ہے۔"

عشقی

(ایران کا ایک باغی شاعر)

عشقی کا نام میر محمد رضا تھا۔ اس کے والد حاجی سید ابوالقاسم کردستانی تھے۔ عشقی ہمدان میں 1312ھ (1893ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسوں میں حاصل کی۔ مدرسہ الیانس میں فرانسیسی بھی پڑھی مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے کہ فرانسیسی تاجر کے ساتھ مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس لئے ان کو فرانسیسی لکھنے بولنے کی خوب مشق ہو گئی۔ ابتدائی عمر سے ہی بے قرار طبیعت پائی تھی۔ اس لئے سکول کی زندگی میں خاص لگاؤ سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ پندرھویں سال میں اصفہان چلے گئے وہاں سے تہران۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو واپس ہمدان آ گئے۔

جن دنوں پہلی جنگ عظیم برپا تھی عشقی ہمدان میں تھے۔ انہوں نے ترکی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جس وقت ہزاروں ایرانی ہجرت کر کے اسلامبوں کی طرف گئے تو عشقی بھی ان کے ہمراہ قسطنطنیہ گئے۔ اس سفر سے پہلے وہ جرمنوں کے ہمراہ بیجار اور کردستان بھی گئے تھے۔ قسطنطنیہ میں دارالفنون باب عالی میں ان کو فلسفہ اور اجتماعیات پر لیکچر سننے کا موقع ملتا رہا۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ کسی خاص شعبہ علوم میں مہارت حاصل نہ کی اور نہ کسی مضمون میں ان کی معلومات جامع تھیں لیکن بڑا ذہن رسا پایا تھا اور اجتماعی تاریخی مطالب بہت جلد سمجھتے تھے۔

مہاجرت کے دوران میں عشقی کا گزر بغداد اور موصل میں سے ہوا۔ انہوں نے مدائن کے کھنڈرات سے متاثر ہو کر "اپرای رستاخیر سلاطین ایران و خرابہای ایران" لکھا جو ایرانیوں اور خاص کر پارسیوں میں بہت مقبول ہوا۔ تہران کے پارسیوں نے بڑے احترام سے عشقی کو چاندی کے گلدان پیش کئے۔ نوروزی نامہ، بھی استامبول میں لکھا۔ استامبول سے واپس آ کر

ہمدان میں ٹھہرے اور پھر تہران چلے آئے۔ عمر کے آخری سال تہران میں ہی بسر کئے۔ کفن سیاہ' ایدال مرد دہقان اپنے شاہکار تہران میں ہی لکھے۔ ان کے اکثر سیاسی مقالات' قرن بیستم' شفق سرخ' سیاست اور دوسرے مقامی جراید میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ وہ وطن دشمنوں کے خلاف بڑی بیباکی سے تنقید اور تعریض کرتے تھے۔ وثوق الدولہ اور قوام **السلطنته** جو یکے بعد دیگرے ایران کے وزارائے اعظم تھے' ان کے متعلق ایک مضمون میں لکھا۔

"کاریکہ برای مادر حدود امکان است' این است کہ پائے معلم اول و دوم الفبائی اخلاق را از ایران ببریم یعنی **نگنایم** وثوق الدولہ دیگری روی ایران را بہ بیند و قوام **السلطنته** را ہم بفر **سنینم** درخدمت برادر مکرمتان تاہواری اروپا تنفس فرمایند"۔

1919ء میں جب وثوق الدولہ وزیراعظم کی وساطت سے انگریز اور ایرانی حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں انگریزوں نے مالی امداد اور **مستشار** بھیجنے کا ذمہ لیا تھا تو عشقی نے نظماً" نثراً اس کی پر جوش مخالفت کی اور اپنی آتشیں تقریروں سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہوں نے کہا اس معاہدہ سے تو ایران ایک مستعمرہ کی حیثیت اختیار کر جائیگا۔ مالی امداد کی وجہ سے وسائل رزق انگریزوں کے پاس گرو پڑ جائیں گے وزارت جنگ اور وزارت داخلہ کے تمام امور انہیں کے مشورے سے انجام پائیں گے اس شدید مخالفت کی بنا پر حکومت وقت نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

1339 ہجری (1920ء) میں انہوں نے قرن **بیستم** کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ مگروہ صرف چھ شمارے نکال کر بند ہو گیا۔ 1341ھ (1922ء) میں اس نام سے یہ اخبار پھر جاری کیا۔ اس مرتبہ ہفتہ میں دو یا تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ صرف اٹھارہ شمارے نکال کر اس کی اشاعت رک گئی۔ چار مہینوں کے تعطل کے بعد تیسری مرتبہ پھر شائع ہوا صرف ایک شمارہ نکلا اور یہی تاریخی شمارہ ان کی موت کا سبب بنا۔ اس شمارے میں ان کا مقالہ آدم جمہوری' اور ان کی نظمیں جمہوری سوار' مظہر جمہوری اور نوحہ جمہوری شائع ہوئیں۔ ان نظموں کے ہنگامہ خیز اشعار سے گھبرا کر حکومت کے اشارے سے دو شخصوں نے ان کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ گولی پیٹ میں ہی رہ گئی اور وہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ 12 تیر ماہ 1303 ہجری شمسی (1925ء) کے روز ہسپتال میں ہی جان دے دی۔ عشقی نے خود قاتلوں کا نشان بتایا تھا۔ ہسپتال میں ایک گرفتار شدہ قاتل ابوالقاسم کی شناخت بھی کر لی تھی لیکن پولیس نے اس کو تو رہا کر دیا اور محمد خاں کو جس نے اس کو بھاگتے ہوئے گرفتار کیا تھا جیل میں بند کر دیا۔ دوسرے قاتل کو دانستہ گرفتار کرنے سے گریز

کیا۔ بعد میں یہ دونوں شخص پولیس سے ماہانہ وظیفہ حاصل کرتے رہے۔ اس جواں مرگ پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ چونکہ عشقی مجلس شوریٰ ملی کے حزب اقلیت کا ہم نوا ہو چکا تھا۔ اس لئے ملک الشعراء بہار نے مجلس میں اس بے گناہ آدم کشی کی طرف حزب اکثریت کی توجہ دلائی لیکن پہلے پہل ان کو تقریر کی اجازت نہ ملی۔ ہنگامہ برپا ہو جانے کے خوف سے حزب مخالف کے تمام اخباروں کو بند کر دیا گیا۔ ان کے ایڈیٹر قید وبند کے خوف سے مجلس کے ایوان میں پناہ گزین ہوئے عشقی کا جنازہ اٹھا تو اس کے ساتھ مسجد جامع تک جاتے جاتے سارا شہر امنڈ آیا۔ عشقی کی خون آلود قمیض جنازہ پر ڈالی ہوئی تھی۔ عشقی تہران میں اجنبی تھا۔ اس کی نہ ماں تھی اور نہ بہن لیکن ان کی خوش خلقی اور نیک سیرتی نے تمام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس کی موت کے دن ہمسائے محلے والے کیا ارمنی اور کیا مسلمان چھوٹے بڑے عورت مرد اس کے گھر جمع ہوئے اور اس کے لئے اشک حسرت بہاتے رہے۔ ملک الشعراء بہار نے لکھا کسی شاعر اور مصنف کی موت نے اس کے ہم وطنوں کو عشقی کی موت کے مانند غمناک نہیں کیا اور اتفاق سے عشقی جیسا کوئی ایسا بدنصیب اور مظلوم شاعر نہیں گزرا جس کو اس قدر بے رحمی سے قتل کیا گیا ہو۔

اخبار جرائد میں اس کی وفات پر حسرت و افسوس کا اظہار کیا گیا۔ شاعروں نے نظمیں لکھیں۔ بہار نے لکھا:

شاعری نو بود و شعرش نیز نو
شاعر نو رفت و شعر نو بمرد

حایری نے لکھا:

خورشید بر فروغ کمال و ہنروری
از آسمان علم و ادب ناپدید شد
رفت از میانہ نابغہ شعر و شاعری
یعنی کہ میر زادہ عشقی شہید شد

روزنامہ سیاست نے پیش گوئی کی یہ وہ شاعر ہے کہ ملت ایران اس کے مجسمے بنائے گی اور یہ وہ شاعر ہے جس کی سرشار طبیعت جس کے اہم افکار اور جس کے عجیب نظریئے یقین طور پر تاریخی حیثیت اختیار کر جائیں گے۔

عشقی ذاتی طور پر نیک سیرت' خوش اخلاق اور قناعت پسند آدمی تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ باپ یا رشتہ دار یا دوست جو کچھ مالی امداد کر دیتے اس پر ہی گزارہ ہو جاتا۔ چند مرتبہ گرینڈ

ہوٹل میں اس کے اوپیرا اسٹیج کئے گئے توان سے بھی آمدنی ہوئی۔

عشقی نے اپنی تنگ دستی کے زمانہ میں بڑی خود داری سے کام لیا۔ معظم السلطنت کا بیان ہے، جو حکومت کی طرف سے ترکی میں سفیر کی حیثیت سے مقیم تھے، عشقی اپنی مہاجرات کے بعد استامبول میں پہنچے تو ساتھیوں نے اس کا زاد سفر چھین کر اس کو خالی ہاتھ کر دیا۔ وہ شہر کے ایک باغ میں خستہ ماندہ اور غمناک پڑا رہتا تھا۔ معظم السلطنت اس کو کونسل خانہ میں اپنے ہمراہ لے گئے۔ لیکن جنگ عظیم کے ان ایام میں ایران سے مالی امداد پہنچنا رک گئی تھی اس لئے دونوں تنگ دست تھے۔ اسی زمانے میں ابوالحسن شیخ الرئیس کا چھوٹا بیٹا اپنے باپ کی وفات پر برلن سے تعلیم چھوڑ کر استانبول میں واپس آیا تاکہ کچھ رقم حاصل کر کے تہران میں واپس جائے۔ معظم السلطنتہ اس کے لئے کچھ انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ عشقی نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک قصیدہ لکھ کر اس تیرہ سالہ لڑکے کو محمد شاہ شہنشاہ ایران کی کی خدمت میں بھیجا۔ شہنشاہ بھی ان دنوں اسلامبول میں مقیم تھا۔ خان بابا صاحب جمع نے اس کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ قصیدہ سن کر اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اس لڑکے کا ہی کلام ہو گا لیکن خان بابا کے یقین دلانے سے اس نے تین سو تومان صلہ دیا یہ رقم لے کر وہ لڑکا عشقی کے پاس آیا کہ اپنی بدحالی دور کرے کے لئے وہ بھی اس رقم میں سے کچھ قبول کرے لیکن اس نے قناعت و استغنا" سے یہ کہا کہ میں نے یہ انعام تمہیں بخش دیا تھا اور بخشی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاسکتی۔

عشقی کی زندگی تلخ کامیوں میں گزری۔ وہ جوانی میں مرگیا وہ زمانے کا شکوہ گزار تھا۔ فلک کج رفتار سے اس نے گلہ کیا وہ جوانی میں اپنی موت کا خواہاں تھا۔ اس نے لکھا:

پیرپسند ای عروس مرگ چرائی
منکہ جوانم چہ عیب دلدم بی پیر

اس نے اپنی غیر طبعی موت کے متعلق خود پیش گوئی کی تھی:

من آن نیم بمرگ طبیعی شوم ہلاک
یک کاسہ خون بہ بستر راحت ہدرکنم

عشقی دہشت پسند تھا اس کا نظریہ یہ تھا کہ جس طرح بندوق اور گھڑی کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے تیل اور صفائی کی ضرورت ہے اسی طرح حکومت کی مشیعری کو صاف اور چلتا رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سال میں ایک مرتبہ وطن کے خائنوں کی صفائی کر دی جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے تجویز کیا کہ عوام جمع ہو کر جلوس کی صورت میں فائن کے گھر پر ہجوم کریں اور

اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ پھر دیکھئے سال بھر کے لئے عوام کس اطمینان سے زندگی بسر کریں گے۔ عشقی نے اس نظریہ کو "پنج عید خون" کے نام سے روزنامہ 'شفق سرخ' میں شائع کیا تھا اس نے لکھا:

این تعدیست بر حقوق بشر
از پی دفع این جراحت باش
عید خون گیر پنج روز از سال
سہ صد و شصت روز راحت باش

عشقی سراپا جوش تھا۔ اس کو وطن سے والہانہ محبت و شیفتگی تھی۔ وطن سے خیانت اور غداری کرنے والوں کے لئے سوائے خونریزی کے اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اس نے لکھا اس طریق خونریزی کو اس طرح رائج کرنا چاہئے کہ عورتیں اپنے شوہروں سے حق مہر کے عوض ایک پلید اور خائن کے خون کا مطالبہ کریں۔

اینکہ بنی آید از گفتار عشقی بوی خون
از دل خونین این گفتار می آید برون

عشقی اپنے اندر ایک درد مند دل رکھتا تھا جو سرفروشانہ جذبات سے معمور تھا۔ تڑپ اور سوز اس کا شعار تھا۔ اس نے اپنے متعلق لکھا تھا:

من عاشقم گواہ من این قلب چاک چاک
در دست من جز این سند پارہ پارہ نیست

عشقی مشروطیت کا حامی تھا اور آزادی خواہ تھا۔ وطن کے نام پر ہر قربانی دینے کو تیار تھا مگر وہ ایسی جمہوری حکومت کو جس میں استبداد اور جبر ہو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے کہا۔

جمہوری نقل و **پشکل** است این
بسیار **فشنگ** و خوشگل است این
ارتجاع و استبداد در لباس جمہوری
آمدو نمود حیلہ بار نود

جس جمہوریت میں مجبوری ہو۔ مزدوری ہو اور بے کاری ہو وہ جمہوریت کیا۔ ایران میں جمہوریت تو ہوئی لیکن مستبد حکمرانوں کے ہاتھوں اس کا جنازہ بھی نکلتا رہا۔ عشقی نے کہا:

آہ کہ جمہوری ما شہ فنا

پیرہن لاش خوران شد قبا

اور اس کے ساتھ ہی وہ طنزیہ انقلاب خیز نظم لکھی جس میں رجعت پسند اخباروں کو چوہے بلی، الو، گدھا اور سانپ کی شکل میں پیش کر کے ان کی زبان سے ان کے کردار کے مطابق کلمات کہلوائے ہیں اور آخر میں اپنے اخبار "**قرن بیستم**" کی زبان سے فغان و فریاد کی ہے۔ یہ نظم عشقی کے جدت پسند اور طوفانی افکار کا آئینہ ہے۔ اس نظم کا انداز یاد رکھنے کے قابل ہے ایک بند کا ایک ایک شعر دیکھئے:

سانپ:

من افعی پیچانم آمنا صدقنا
من دشمن ایرانم آمنا صدقنا

الو:

من چند نوا خوانم بربام توقو قوقوقو
کردست مرا فربہ اطعام توقوقوقوقو

چوھا:

من موشک **مسکینم** پابند تو جیرجیرجیر
کردست مرا سرمست لنجند تو جیرجیرجیر

کتا:

من تولہ **تغلیسم** عف عف اخوی عف عف
ہم مکتب ابلیسم عف عف اخوی عف عف

اب صرف قرن **بیستم** کا پورا بند ملاحظہ کیجئے۔

من مظہر جمہوری ھی ھی جبلی قم قم
جمہوری مجبوری ھی ھی جبلی قم قم
تاکی پی مزدوری ھی ھی جبلی قم قم
یکچند نما دوری ھی ھی جبلی قم قم
من مرد مسلمانم آمنا صدقنا

عشقی بڑا تلخ نوا تھا۔ اپنے دشمنوں کو ذلیل کرنے کے لئے فحش و بدکلامی پر اتر آتا تھا اور بڑی بے خوفی سے ان کی ہجوو تضحیک کرتا تھا۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

از دروو موتمن الملک .مجلس گاہی
احتراماً بسر رہگذارش باید رید

وحید دستگردی کے متعلق لکھا ہے:

ای شیش خور شیخ یا وہ گوشندر پندری
ای نداوہ امتیاز شعر باگندہ دہنی

اپنی مذہبی آزادی کی وجہ سے عشقی نے علماء کی مخالفت بھی مول لی۔ مگر چونکہ وہ بے باک قسم کا آدمی تھا ہر چیز کو واقعیت اور قطعیت سے دیکھنے کا عادی تھا اور اپنی عقل و بصیرت پر اعتماد کرتا تھا۔ اس لئے بعض مذہبی روایات اسے قصہ کہانی نظر آتی تھیں وہ حیات بعد الممات کا قائل نہیں تھا اور قصہ آدم و حوا کو بھی جھوٹ سمجھتا تھا جیسا کہ اس کے مندرجہ ذیل اشار سے واضح ہے:

منکرم من کہ جہانی بجز این باز آید
چہ **کنم** درک نمودہ است چنیں او را کم
قصہ آدم و حوا دروغ است دروغ
نسل میمونم وافسانہ بود از خاکم

عشقی جدت پسند تھا اس کا خیال تھا کہ ایرانی ادبیات دنیا بھر میں قابل ستائش رہی ہیں لیکن زمانہ کے تغیر و انقلاب کے ساتھ ساتھ شعر و سخن میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ مثنوی، قصیدہ، مسدس وغیرہ کی پرانی اور فرسودہ اصناف سخن کو ترک کر کے نئی ہیئتوں میں تجربات کرنے چاہئیں اور عالمی ادب کی تقلید میں بحور و اوزان میں نئی صورتیں ایجاد کرنی چاہئیں۔ عشقی کا یہ بھی خیال تھا کہ جو لوگ محض مغرب کی تقلید میں پرانی اصلیت کو کھو دینا چاہتے ہیں وہ قابل سرزنش ہیں۔ عشقی نے بعض جگہ دانستہ قوافی کی بیجا اور پیچیدہ پابندیوں کی پروا نہیں کی۔ نوروزی نامہ، ایدآل یک نفر پیر دہقان اور کفن سیاہ، اس کی نئی طرز کی نظمیں ہیں۔

رستاخیز، فارسی، زبان کا پہلا اوپیرا ہے جو ایران میں سٹیج کیا گیا۔ شاعر سلاطین ایران کے دارالسلطنت، مدائن کے کھنڈرات سے گزرا تو اپنے وطن کی پرانی عظمتوں کے نشانات دیکھ کر اس کا دل ہل گیا۔ چنانچہ وہ عالم خواب میں خسرو شیریں، نوشیرواں اور زردشت کی روحوں کو دیکھتا ہے

جو محزون و غمناک چہروں کے ساتھ حسرت ناک لہجہ میں موجودہ ایران اور ایرانیوں کی زبوں حالی پر افسوس کرتی ہیں۔ نظم میں موسیقی کے مختلف اثرات کے لئے مثنوی، غزل، مخمس اور ترجیع بند کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس اوپیرا کو ڈرامہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نہ اس میں کہانی ہے نہ پلاٹ اور نہ کردار نگاری، ہمارے سامنے اس کی ترتیب شدہ موسیقی بھی نہیں۔ اس لئے رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ اصوات موسیقی کے لحاظ سے یہ اوپیرا کہاں تک کامیاب ہوا۔ اس کا تاریخی پس منظر اور **سٹیجی** مناظر اوپیرا کے لئے موزوں معلوم ہوتے ہیں اوپیرا کی فضا غمناک ہے۔ اس لئے یہ نظم اپنے سوز واثر کی وجہ سے کامیاب ہے۔ کفن سیاہ بھی اس سے ملتا جلتا نمائش نامہ ہے رستاخیز کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔ خسرو دخت بول رہی ہے:

هاں اے پسر تاجور غم زده خسرو
خیز از لحد باخبر ازکشور خود شو
سرای هم گورست
همه اہل قبور است
مرده بروں از مزارند
زنده و زندگی ندارند
این خراب قبرستان نه ایران ماست
این خرابه ایران نیست ایران کجاست

"اید آل یک نفر پیر مرد دہقان" ڈرامائی انداز کی ایک طویل نظم ہے جو اپنے اسلوب کے لحاظ سے بے مثال ہے یہ ایک مخمس ہے جس کے ہر بند کا پانچواں مصرعہ ہم قافیہ ہے۔ شاعر نے محمد علی شاہ قاچار کے زمانہ استبداد اور برطرفی مشروطہ کے دوران میں آزادی خواہوں کی مظلومیت، حکام کی لاقانونی اور جبرو ستم، عوام کی بدحالی، امراء کی عیش کوشی پر بیباکی سے تنقید کی ہے اور ایک ستم دیدہ کسان کی زبان سے اپنا سیاسی مطمح نظر پیش کیا ہے تاکہ ایران میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا جائے جو ان ظالموں اور ان مردہ شویوں کی حکومت کو درہم برہم کر دے۔ یہ نظم تین مناظر میں منقسم ہے اور اپنی تخیلی ترکیب کے لحاظ سے متوازن اور متناسب ہے۔ عشقی نے خود تمہید میں لکھا ہے کہ اس قسم کی نظموں میں ادبیات فارسی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ اس نظم میں مناظر کی تصویر کشی بھی دلکش ہے۔ ایک بند دیکھئے تاکہ ہیئت، و اسلوب کا اندازہ ہو جائے۔ جوان عاشق اپنی محبوبہ کو شراب پینے کی دعوت دیتا ہے اور محبوبہ اس کو جواب دیتی ہے:

(جوان) بخور عزیز دل من
(مریم) نمی خورم واللہ
(جوان) بخور ترا بخدا
(مریم) نہ نمی خورم بخدا
(جوان) بخور بخور ده بخور
(مریم) ای دلم بکن آقا

خودت بنوش ازین تلخ بادہ ننگین
ترا قسم بدل عاشقان افسردہ
بہ غنچہ ی سحر ناشگفتہ پژمردہ
بمرگ عاشق ناکام نوجوان مردہ
بخور بخور ده بخور نیم جرعہ یک خوردہ
ہزار مرتبہ **گفتم** نمی خورم من از این

"بچہ گدا دکتر نکوکار" ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ یہ ایک مقصدی تمثیل ہے جس میں عشقی نے ایرانی عوام کی بے علمی جہالت اور فساد اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے اور مذاحیہ انداز میں ان کی چوری، عیاری اور رذالت کو نمایاں کیا ہے۔ آخری منظر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر طبیعی استعداد کو اچھے کاموں میں صرف کیا جائے تو اچھے نتائج کی امید کی جا سکتی ہے طنز و تعریض سے کام لے کر حاضرین پر افسوس و ندامتی کا احساس طاری کرنے کا خیال کار فرما ہے۔ تمثیل میں حرکت ہے اور پلاٹ بھی دلچسپ ہے۔

عشقی کی اکثر نظموں کا موضوع وطن یا سیاست ہے یا اس کے متعلقات ہر نظم شاعر کا گداز روح لئے ہوئے ہے۔ شاعر اپنے سوز دعشق سے خفیہ بخت ایرانیوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ ہر بات کو علانیہ کہتا ہے۔ تیزی و تندی اس کا شعار ہے۔ اکثر نظمیں ایک سلسلہ افکار لئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اپنی جامعی حیثیت سے تاثیر کی حامل ہیں۔ کلام میں روانی ہے۔ پختگی کم ہے شاعرانہ **تکلفات** بھی کم ہیں۔ اس نے شاعرانہ تربیت حاصل نہیں کی اس کے بعض اشعار فصاحت سے عاری کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس کا فطری جوش اور طبعی ذوق اس کو شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے اس کو اپنے ان نقائص کلام کا علم تھا اگرچہ ہمیں سعدی و حافظ کی شیرینی و لطافت تو

اس کے کلام میں نہیں ملتی لیکن وہ تجسم احساسات میں بے نظیر ہے مقصد و موضوع کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہے۔ عشقی موسیقی سے آشنا ہے اس لئے آہنگ اور توافق صدا کو خوب سمجھتا ہے۔ اس کے اوپیرا موسیقی کی تانوں پر ہی تو قائم ہیں۔ اس کے کلام میں جوش اور شوریدگی موجود ہے۔ اس کا تخیل واضح ہے اس کے نغموں میں جابجا عصر حاضر کی شخصیتوں اور واقعات کی طرف اشارات ملتے ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ وہ فرانسیسی کے مروجہ الفاظ بھی آزادی سے استعمال کرتا ہے۔

عشقی میں غزل و رومان بہت کم ہے۔ اول تو غزلیں بہت تھوڑی لکھی ہیں اور جتنی لکھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجی زندگی میں اسے محبت سے واسطہ نہیں پڑا۔ کم سے کم اس کے اشعار سے تو ہوس و عشق کے جذبات کا اظہار نہیں ملتا۔ اس کے قطعات رباعیات اور غزلیات و قصاید میں سب جگہ درد وطن کی باتیں ہیں۔ سیاست اور اس کے مسائل کا ذکر ہے۔ وطن فروشوں اور غداروں کے خلاف شعلہ خیز ہنگامہ ہے۔ ایک ایک شعر میں اس کے اپنے رنج و کرب کا اظہار ہے۔ غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

ضائع مساز رنج و دوای خودای طبیب
دردیست درد ما کہ مداوانمی شود
ای دل از کار من و بلبل چہ میپرسی برد
مادوتن شوریدہ را کاری بجز فریاد نیست

رباعی کا نمونہ دیکھئے:

این ملک یک انقلاب می خواہد وبس
خونریزی بے حساب می خواہد و بس
امروز ، دگر درخت آزادی ما
از خون من و تو آب می خواہد و بس

ابوالقاسم لاہوتی

(کمیونسٹ شاعر)

ابوالقاسم لاہوتی 1885ء میں شہر کرمان میں پیدا ہوئے ان کے والد الہامی ایک آزادی پسند شاعر تھے اور کافی جائیداد کے مالک بھی تھے۔ لاہوتی کی ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق ہوئی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی ان کو شعر گوئی کا شوق تھا اور وہ لاہوتی تخلص کرتے تھے۔ 1909ء سے 1910ء میں رونامہ "ایران نو" میں پہلی مرتبہ ان کے اشعار شائع ہوئے تو ان کو بڑی خوشی ہوئی ان کو شروع سے ہی اپنے ملک کی ویران و پریشان حالت کا علم تھا وہ سمجھتے تھے کہ ان کا عزیز وطن غیر ممالک کی سیاسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وطن فروش اپنے مفاد کی خاطر اپنے وطن سے غداری کرنے پر تلے ہیں۔ ان کی پرجوش روح کو یہ حالت دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر شعر لکھتے تھے اور ہم وطنوں کو غفلت سے بیدار کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا:

ای مادر وطن پسرانت نمردہ اند
آسودہ باش گول اجانب نخوردہ اند
وطن خواہاں وطن ویرانہ گردید
وطن منزلگہ بیگانہ گردید

وطن ویرانہ از یا رست یا اغیار یا ہر دو
مصیبت از مسلمانہاست یا کفار یا ہر دو
تو راردزی بکشتن میدہد ناچار لاہوتی
زبان راست گو یا طبع آتشبار یا ہر دو

ابتداء میں وہ پرانے استادوں کی روش کی ہی تقلید کرتے تھے لیکن ان کی سرکش طبیعت کو سکون نہ ملا۔ وہ صرف شاعری میں ہی اپنی زندگی کو نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ انہوں نے علوم دینی حاصل کرنے میں بھی کافی وقت صرف کیا لیکن ان کے اعزا نے ان سے ملٹری پولیس میں (ژاندرمی) ملازمت اختیار کرنے کو کہا چنانچہ 1906ء میں وہ اس محکمہ میں داخل ہوئے۔ 1912ء میں اپنی ذاتی لیاقت کی بناء پر سلطانی کے منصب پر پہنچے لیکن یہ منصب پاکر بھی وہ خوش نہیں تھے

کیونکہ دوسرے صاحب منصب اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بڑے بڑے کاموں پر مامور ہوجاتے۔ لاہوتی اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھتے اور ان کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انہوں نے لاہوتی کو ایک سخت گیر افسر مشہور کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ان پر الزام لگایا کہ وہ قم اور کاشان سے مفت میں زبردستی مال حاصل کرتے ہیں لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک شخص سید ابوالفضل نے جھوٹے خط لکھ کر ان کو بدنام کرنا چاہا ہے۔ لاہوتی نے اس شخص کو قید کردیا۔ بعد میں وہ شخص بھاگ کر حضرت معصوم کے مزار میں پناہ گزین ہوا۔ لاہوتی نے وہاں سے نکلوا کر اس کو قتل کروا دیا۔ "بست" کی اس عہد شکنی پر ملاؤں نے احمد شاہ سے شکایت کی۔ مرکز سے تین افسر تحقیق کیلئے آئے لیکن لاہوتی نے اپنے تین معتمد سپاہیوں کی مدد سے راستے میں ہی ان تینوں کو گولی کا نشانہ بنادیا۔ اس کے بعد مرکز سے ایک اور کمیشن بھیجا گیا جس کے حکم سے لاہوتی کو زندان میں ڈال دیا گیا لیکن وہ پہرہ دار کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے اور کرمان شاہ اپنے گھر پہنچے۔ چوری چھپے 1914ء میں حلب موصل ہوتے ہوئے استامبول نکل گئے وہاں جاکر ترکی زبان سیکھی اور کتاب فروشی کی دوکان کھولی۔ چھ سال تک وہیں مقیم رہے۔ استامبول میں ہی کمیونسٹ عقائد کا ان پر اثر ہوا اور وہ کمیونزم کے سخت حامی ہوگئے۔ بادکوبہ میں مختلف نمائندوں کے ہمراہ بلشویکوں کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ 1921ء میں ان کو تہران سے خط آیا کہ ان کی سزا معاف کردی گئی ہے اور وہ اپنے عہدہ پر واپس آسکتے ہیں۔ ایران میں واپسی پر اکتوبر 1921ء میں منصب 'یاوری' پر تبریز میں ان کا تقرر ہوا۔ یہاں انہوں نے رضا خاں کی مخالفت کی اور حزب کمیونسٹ کیلئے ممبر بنانا شروع کئے اور بادکوبہ میں روسی حکومت کو اپنی کاروائیوں کی اطلاع دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنے ہمراہیوں کے توسط سے تبریز پر قبضہ کرکے آزادی کا اعلان کردیا اور سرخ جھنڈا لہرا کر نئی حکومت قائم کرلی لیکن سرکاری فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ آخر وہ تین چار ساتھیوں کے ساتھ دریائے ارس کو عبور کرکے **نجخوان** پہنچ گئے۔ جب وہاں سے ان کو بادکوبہ بھیجا گیا تو ان کی جلد بازی اور روسی حکومت کی ہدایت کے بغیر حکومت قائم کرلینے پر ملامت کی گئی۔ آخر لاہوتی کو تاشقند میں نظری اور عملی تعلیمات کیلئے روسی مدرسہ میں بھیجا گیا۔ وہاں انہوں نے مارکسی تعلیمات تاریخ، فلسفہ، مادیت اور عملی انقلابی تحریک پر تعلیم و تربیت حاصل کی اور ایران سے آئے ہوئے خطوں کو فارسی اور روسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوگئے ایران اور دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ جماعتوں کی نگرانی کے محکمہ میں ان کو کام کرنا پڑتا تھا۔ 1925ء سے 1926ء تک لاہوتی ازبکستان اور تاجکستان میں سوشلزم کو فروغ

دینے اور ان چھوٹے چھوٹے علاقوں کو روسی جمہوریہ کے ساتھ مدغم کرنے کیلئے بھیجے گئے۔ وہاں انہوں نے حالات کا جائزہ لیکر مرکز کی ہدایت کے مطابق علم کیا اور پھر ماسکو واپس آگئے اور محکمہ امور خارجہ میں کام کرتے رہے۔ ان کی لیاقت اور استعداد کی بناء پر 1952ء میں ان کو **کمنترن** کا رکن منتخب کیا گیا۔ روسی جمہوریت میں یہ بہت بڑا اعزاز شمار ہوتا تھا۔ اجرائیہ کمیٹی کے صدر نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ازبکستان میں جاکر اپنے مطلب کی رفیقہ حیات بھی ڈھونڈلے چنانچہ لاہوتی نے 44 سال کی عمر میں ایک سترہ سالہ خوبصورت لڑکی سے شادی کرلی۔ 1938ء میں بغاوت اور خیانت کے الزام میں بڑے بڑے فوجی افسروں، لیڈروں اور وزیروں پر مقدمے چلا کر ان کو پھانسی یا ج س دوام کی سزائیں دی گئیں۔ لاہوتی کی بیوی شاید کسی اور سے میل ملاپ بڑھا رہی تھی۔ اس نے نجی طور پر خفیہ ادارہ کو یہ اطلاعات فراہم کیں کہ لاہوتی بھی ازبکستان کے رئیس کے ساتھ حکومت خود اختیاری قائم کرنے میں شریک و معاون تھا۔ ایک دوست کے واسطہ سے اس قسم کی اطلاع پاکر لاہوتی نے خود اس کے خلاف ایک رپورٹ لکھی جس کی بنا پر بیوی کو نامعلوم مقام پر قید یا گم کردیا گیا۔ اس کے بعد لاہوتی نے اس کی شکل تک نہ دیکھی اور پھر دوبارہ شادی بھی نہ کی۔ 1938ء کے بعد لاہوتی اکثر ماسکو میں ٹھہرے رہے ایک دفعہ مصنفین کی کانفرنس میں شریک ہونے کیلئے پیرس بھی گئے چونکہ لاہوتی تاجکستان کے شاعر ملی مشہور ہوچکے تھے اور رئیس اکادمی کا عہدہ بھی ان کے ذمہ تھا۔ اس لئے تاجکستان اور ازبکستان میں بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں شمالی ایران میں بھی آتے رہے۔ ماسکو میں وہ ایران کے حزب کمیونسٹ کے نمائندہ بھی شمار ہوتے تھے۔ ایران میں کمیونسٹ پروپیگنڈہ کرنے اور ا[illegible] سرزمین میں ارضی یا صنعتی انقلاب برپا کرنے میں مشورے دیتے رہتے تھے۔ جنگ عظیم دوم میں گیلان اور آذربائیجان پر روسی تسلط کے سلسلے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔

روس میں قیام کے دوران میں لاہوتی نے بڑے بڑے انقلابات کا زمانہ دیکھا۔ کمیونسٹوں کے طرز عمل کو بھانپا۔ ان کے دام جاسوسی، سخت گیری اور اپنے مفاد کی خاطر انسانی جانوں کی ناقدری کو بھی دیکھا۔ ایران کے خلاف خود ایرانیوں کو آلہ کار بنتے بھی دیکھا اپنی غداری کا بھی ان کو کئی مرتبہ احساس ہوا اور اپنی جان کو بھی خطروں میں گھرا ہوا پاتے رہے۔ آخر وہ اپنے درد مند دل کے احتجاج کے سامنے نہ رک سکے۔ اور 1952ء میں اپنی جائیداد کو بیچ کر جواہرات میں تبدیل کیا اور ازبکستان سے چوری چھپے بھاگ کر افغانستان میں داخل ہوگئے اور وہیں مقیم ہوگئے۔ وہاں

انھوں نے اپنی داستان حیات یعنی "شرح زندگانی من" کے نام سے کتاب لکھی۔ اس میں کمیونسٹوں کی تمام ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا راز فاش کردیا اور ان لوگوں کے نام بھی بتائے جنھوں نے اندرونی طور پر ایرانی حکومت کے خلاف کام کیا تھا۔ 1952ء کے بعد ان کے متعلق کوئی خبر نہیں آئی۔

لاہوتی کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ رباعیات و قطعات کا پہلا مجموعہ استامبول میں "لالی لاہوتی" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "ادبیات سرخ" کے نام سے ترکستان میں چھپا اور تیسرا مجموعہ "آثار منتخب" کے نام سے 1946ء میں ماسکو میں چھپا۔ آخر الذکر دیوان کے متعلق لاہوتی نے خود اپنی خود نوشت داستان میں لکھا ہے کہ **کمنترن** کے ادبی ادارہ نے مجھے اشعار جمع کرنے اور ان کے ساتھ توضیحات لکھ کر ماسکو بھیجنے کیلئے کہا۔ بعد میں اپنے مفاد کے مد نظر اشعار منتخب کرکے دیوان شائع کردیا اور اس میں بہت سے خشک ثقیل اور پر تصنع اشعار شامل کردیئے ہیں جن کو دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ (ص 115)

چوتھا مجموعہ "سرود ہای آزادی و صلح" کے نام سے 1954ء میں ادارہ نشریات بزبانہای خارجی کے اہتمام سے ماسکو میں شائع ہوا۔

"شرح زندگان من" میں اس قدر جزئی تفصیلات درج ہیں کہ ان کے سچے ہونے پر شبہ نہیں ہوتا اور جن واقعات اور جن شخصیتوں کی طرف ان میں اشارات پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح ہیں لیکن ان کے کلام کا مجموعہ 1954ء میں ماسکو سے شائع ہوا ہے۔ اس میں 1953ء کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ "پاسخ بہ اغواگراں" کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں جنوری 1954ء درج ہے۔ اس میں "شرح زندگانی من" کے متعلق تردید کی ہے۔ نظم کا ایک بند یہ ہے۔

ز شخص معتبر بہ شنید دشمن
کہ چون من من بدم!
بہ آہ و زاری شدم
از کشور شوری فراری
بہ پاکستان اول رو نمودم
واز انجا راہ ہندوستان کشودم
کتابی گویَا نبوشتم آنجا

ز تہمت پر بہ ضد ملک شورا

1335 ش میں لاہوتی کا ایک ڈرامہ "کاوہ آہنگر" بھی تہران میں شائع ہوا۔

لاہوتی 1958ء میں فوت ہوئے۔ لاہوتی ایک ذہین شخص تھے۔ ان کی نظر وسیع تھی انھوں نے فرانسیسی اور روسی زبان پر بھی قدرت حاصل کی۔ تاریخ و سیاست کے نظریوں کا غائر مطالعہ کیا۔ وہ ایک بے عمل شاعر نہیں تھے خود اقرار کیا ہے کہ وہ خود غرض اور جاہ طلب تھے لیکن حساس دل رکھتے تھے۔ انہیں وطن کے نالائق اور بے کار وزراء اور حکام سے نفرت تھی۔ اس لئے وطن کی بہتری کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے تھے انھوں نے وطن دوستی کی خاطر دربدری اور جلا وطنی کو قبول کیا۔ استامبول جانے سے پہلے انھوں نے شاعری کو خاص وقعت نہیں دی تھی۔ ان کی پہلی غزلیات میں پرانا مقلدانہ رنگ ہے۔ نظموں میں حب وطن، احترام انسانیت، توحید معرفت کائنات کے احساسات ملتے ہیں۔ اسلوب میں دھیما پن اور توازن ہے اخلاص ہے شوریدگی اور جوش نہیں۔ تفکر اور سنجیدگی غالب ہے وطن سے باہر جاکر ان کے خیالات میں سختی اور تلخی آگئی ہے۔ جوش اور شوریدگی میں اضافہ ہوگیا۔ استامبول میں پہنچ کر انھوں نے لکھا۔

ہر آنکہ در بدرم کرد از آشیانہ خویش
خدا کند کہ شود دربدرز خانہ خویش

لاہوتی کی شاعری کا کمیونسٹی دور شاعر کے حق میں برا نہیں ہوا۔ انہیں انسانی نفسیات کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملا۔ عقل انسانی کی عیاریاں، غریبوں کی مظلومیت، زبردستوں کا جبرو تحکم، نظریات کا تخالف و تضاد، فریب و مکر، گناہ اور عیش کی دنیا ان کے سامنے سے گزری جس نے شاعر کے دل و دماغ میں ایک ہیجان پیدا کیا۔ اس زمانے میں ان کے قلم سے بہترین اشعار نکلے ہیں جن میں کراہتی ہوئی انسانیت کیلئے ایک تڑپ اور سوز موجود ہیں۔ ان کے اکثر اشعار میں کمیونسٹی عقائد و افکار کی جھلک یقینی طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری مجبوراً بالشویکی سیاسی افکار کی نشرواشاعت کی نظر ہوگئی لیکن اس زمانہ کی شاعری میں عالمگیر جذبات و احساسات کے آثار بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مذہبی تعصب، امراء کی عیش کوشی اور حکام کی دست برد کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ کسان و مزدور کی حمایت اور آزادی و خود مختاری کیلئے پرجوش ولولہ ہے۔ ان کی شاعری میں استقلال اور اُمید کا سبق ہے۔ اس نے مزدور کو مخاطب کرکے لکھا:

تو بنا کنندۂ عالٰی تو تمام معنی آدمی

تو معزز می تو مکری ہمہ چیز بی تو بود فنا

اپنی آزادی کو برقرار اور زندہ رکھنے کیلئے انہوں نے لکھا:

زندگی آزادی انسان و استقلال اوست
بہر آزادی جدل کن بندگی درکار نیست

وہ صحیح معنوں میں ملی شاعر تھے۔ انہوں نے قوم کی ہمنوائی میں اشعار کہے اور عوام کے دلوں میں یک جہتی ہم کاری اور اتحاد کے جذبات ابھارے۔ اپنے ترانوں سے اکٹھے مل کر کام کرنے کیلئے جوش دلایا۔ اپنے نغموں میں رقص و سرور کا آہنگ دیکر ان کے دست و دل میں آہنگ پیدا کیا۔ "سرود آہنگراں اور سرود پنبہ چینی ہا"۔ ان ترانوں کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان کے جنگی ترانے سپاہیوں میں ولولہ، تڑپ، مٹ جانے اور مٹا دینے والے جذبات کو ابھارتے ہیں:

وقت راحت نیست۔ یاراں، من . بمیدان می روم
ہمت کنید ای دوستان دشمن بہ میدان آمدہ

ان جنگوں ترانوں کی بہترین مثالیں ہیں

لاہوتی شعر کی قوت تاثیر سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کہا:

شعر تو لاہوتیا کشندہ ظلمت
این اثر البتہ یک سپاہ ندارد

دشمن کو نیچا دکھانے کیلئے وہ قلم کے ساتھ خنجر سے بھی کام لینے کے حامی تھے۔

بردل صنف تو نگرز خمہای پی بہ پی
گہ بنوک خامہ گاھی بادم خنجر زدم

روس کے مصنف شاعر اور دوسرے اہل فن ان کی قوت شعر کے قائل تھے۔ کمنترن کی اجرائیہ کمیٹی کے صدر کی زبانی لاہوتی نے ان کی رائے کو قلمبند کیا ہے۔

"اشعار شمارا خواندہ اند۔ ادغان کنند کہ در اشعارش یک لطافت و زیبائی خاص است کہ خوانندگان را مفتون می کند۔ کلمات شما مثل سوزی است کہ ازدل بری خیزو وبدل فرومی رود"

ص 68 شرح زندگانی من

لاہوتی اگرچہ روس کے دوران قیام میں حکومت ایران کی مخالفت کرتے رہے اور اپنی آبائی سرزمین میں اراضی یا صنعتی انقلاب برپا کرنے میں ساز باز کرتے رہے اور اہل وطن کی نگاہوں میں غدار بنے رہے لیکن ان کا دل رہین ستم ھائی روزگار رہتے ہوئے بھی اپنے وطن کی یاد سے

غافل نہیں رہا۔ حکومت جمہوریہ روس نے انہیں سبز باغ دکھا رکھا تھا کہ جونہی حکومت ایران کا تختہ الٹا ان کو وزیراعظم بنا دیا جائے گا۔ بعد میں ان کے ضعیف العمر ہوجانے کی وجہ سے وزیراعظم کے بجائے وزیر تعلیم بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اقتدار اعلیٰ کی جانب سے تعلیمات کا دستور العمل بنانے کی بھی ان کو تاکید کی گئی تھی لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ کیمونزم پر ان کا اعتقاد کمزور ہوتا جارہا تھا اور وہ کیمونسٹوں کے عملی اقدامات سے متفق نہیں تھے۔ انہیں اپنے وطن سے بیگانگی اور مخالفت کا شدید تر احساس ہورہا تھا اور وہ اپنے دل میں شرمندہ تھے۔ 1919ء میں انہوں نے لکھا تھا:

زفقر زارع و دل سختی مالک بود روشن
کہ ایران می شود ویران زاستبداد می نالم
خیانت ھای شاہ و جہل ملت راچو می بینم
کہ ملت عاجز است از دفع این بیداد می نالم

اور 1943ء میں بھی انہوں نے ایران سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

اولین الہام بخش و آخرین پیان من
طبع من تاریخ من ایمان من ایران من

لاہوتی کی غزلیات اپنی سادگی نغمگی اور اخلاص کی وجہ سے قابل قدر ہیں۔ ان کی غزلوں میں افکار کی گہرائی نہیں اور نہ کسی فلسفہ فکر کا اظہار ہے بالکل سیدھے سادھے انداز میں ایک محبت کرنے والے دل کے جذبات و احساسات اظہار ہے جو اپنے خلوص اور سوز کی وجہ سے دوسرے کے دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے ان میں جاذبیت اور لطافت ہے۔ ان کی یہ غزلیں ملاحظہ کیجئے:

2- چہ کردہ ام کہ زجانان خود جدا شدہ ام
3- پر کردہ ام از مہر تو پیانہ دل را
4- نکردی رحم و رفتی خوب۔ تاہرا کجا بردی؟
زدل آسائش و ازدیدہ خوابم راکجا بردی؟
5- عاشقم عاشقم بہ رویت گر نمیدانی بدان

1945ء کے بعد کی شاعری میں لاہوتی کا انداز تبلیغانہ ہوگیا ہے۔ ان کی نگاہ دنیا جہان کی وسعت لئے ہوئے ہے۔ بین الاقوامی حالات ان کی نظر کے سامنے ہیں وہ کوریا کی جنگ آزادی

سے متاثر ہو کر کوریا کے جوانوں کو ابھارتے ہیں- ترکی اور اس کے بہادر نوجوانوں کو کوریا کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ملامت کرتے ہیں- امریکہ اور انگریز کے خلاف جا بجا ان کے قلم سے اشعار نکلے ہیں- عالمگیر صلح کی فضا پیدا کرنے کیلئے وہ حکومتوں کو مشورے دیتے ہیں- عام انسان کی فلاح و بہبود یاد دلا کر ان کو خونریزی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں-

تاکی نار جنگ

سوز اند جہان

تاکی غرق خون

جسم کو دکان

برخیز بہر صلح

ای نوع بشر

خلق ہر کشور

اہل ہر زبان!

روس میں راحت و آسائش کی زندگی گزارنے کے باوجود وہ ایران کی یاد سے غافل نہیں رہے- اپنے بچپن اور جوانی کے مناظر انہیں بار بار یاد آتے ہیں- وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی خوش حالی اور آزادی کیلئے تڑپتے ہیں اور انہیں پنجہ استبداد سے باہر نکلنے کیلئے ابھارتے ہیں-

ایرانیان، ایرانیان

یاری کیم، یاری کنیم

زخمی شدہ جسم وطن

خیزید وغمخواری کنیم

ای شیران ترک

ای گردان کرد

ای مردان فارس

از بزرگ و خرد

دوستانہ یکدیگر دست دہید

ارد دی ستم راشکست دہید

لاہوتی نے ڈرامائی نظمیں لکھنے کی طرف بھی توجہ کی ہے یعنی ایک قصہ یا واقعہ نظم کرتے

ہیں- بیان کے دوران میں کردار قصہ سوال و جواب کرتے ہیں یا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں- قصہ کی رفتار کے مطابق بندوں میں اشعار کی تعداد بھی کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ہی وزن اور بحر بھی بدلتی جاتی ہیں- "یک صفحہ افتخار اور پری بخت" اسی قسم کی نظمیں ہیں- پری بخت ایک طویل نظم ہے- پری بخت سے مراد آزادی، تندرستی اور خوشحالی وغیرہ ہے-

ایک شخص پری کی تلاش میں نکلتا ہے- اس کے گاؤں والے راستے کی دشواریوں سے اس کو ڈراتے ہیں- دیو ستم اس کی منگیتر کو ہرن کی شکل میں تبدیل کردیتا ہے اور اس کو بھیانک جنگلوں میں گمراہ کردیتا ہے- وہاں حامی بخت یا بخت شناس سے ملاقات ہوتی ہے- بخت کے تلاش کرنے والے دوسرے اشخاص بھی اپنی اپنی داستان سناتے ہیں- یہ دہقان مزدور اور ستم رسیدہ علاقوں کے لوگ ہیں- مصنف خود اپنی زندگی کے واقعات اور بچپن اور جوانی کا طویل قصہ بیان کرتا ہے- آخر بخت شناس کی وساطت سے پری مل جاتی ہے- محبوبہ اپنی اصلی شکل میں تبدیل ہوجاتی ہے- دیو کے پنجہ میں گرفتار انسان آزاد ہوجاتے ہیں- مقصد یہ کہ روس کی پر زور قوت دیو بیداد و استبداد کو ختم کردیتی ہے اور پری بخت یعنی آزادی خوشحالی اور راحت کو پھیلاتی ہے- یہ نظم تقریباً تمام کی تمام مثنوی میں ہے لیکن کہیں کہیں سوال و جواب میں صرف ڈرامائی عنصر قائم رکھنے کیلئے نظم عاری سے کام لیا گیا ہے- مثلاً ان ٹکڑوں کو دیکھئے- شاگردا جو پری کی تلاش میں جارہا ہے- اس کی منگیتر سنبل اسے جانے سے روکتی ہے اور کہتی ہے:

سنبل:

رہت سنگ است و پایت لوچ، میسوزم

بحال تو

اگر درماندہ گردی کی شود یارت

شاگردا:

خیال تو!

سنبل:

سلاحی داری؟

شاگردا:

آری- مہر تو

سنبل:

سرمایہ ات؟
شاکدا:

امیر
سنبل:
کہ ہمراہت شود؟
شاکدا:
شب ہا ستارہ' روز ہا خورشید
شاکدا:
سفر نا کردہ ای تو' رہنمایت کی شود
شاکدا:
پیان!
سنبل:
چہ آری ارمغان از این سفر
خوش بختی جانان

یہ نظم ڈراما تو نہیں بن سکتی۔ البتہ ایک فیچر سا بن گئی ہے۔ مختلف افراد اپنی داستان بیان کرتے ہیں اور تقریریں کرتے ہیں۔ نظم کی ہیئت میں تصنع موجود ہے لیکن شاعر کے خلوص جذبات میں شبہ نہیں ہوتا۔ خطابت اور تبلیغ کا انداز ساری نظم پر چھایا ہوا ہے۔

فرخی یزدی

(وہ شاعر جس کے ہونٹ سی دیئے گئے)

محمد ان کا نام تھا۔ فرخی تخلص تھا۔ باپ کا نام محمد ابراہیم۔ 1306 ہجری یزد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر یزد کے انگریزی مشنری مدرسہ میں داخل ہوئے ابھی پندرہ برس کی عمر تھی کہ درد ملت و درد وطن جاگ اٹھا تھا۔ عیسائی مدرسہ کی مذہبی تبلیغ کے خلاف ایک نظم لکھ ڈالی چنانچہ مدرسہ والوں نے ان کو سکول سے نکال دیا۔ نظم کا ایک بند یہ ہے۔

سخت بستہ باما چرخ عہد ست پیمانی
دادہ او بہرپستی دستگاہ سلطانی
دین زدست مردم برد فکر ہای شیطانی
جملہ طفل خود بروند درسرای نصرانی
ای دریغ ازین مذہب' داد ازین مسلمانی

سکول سے نکلے تو محنت مزدوری کرکے اپنی معاش کا سامان پیدا کرنے لگے لیکن ساتھ ساتھ اپنے تیز ذہن اور بیباک طبیعت سے اشعار لکھتے رہے اور سناتے رہے مشروطیت کا زمانہ آیا اور ڈیموکریٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو وہ بھی اس پارٹی میں شریک ہوئے اور آزادی خواہاں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ انہوں نے لکھا:

قسم بہ عزت و قدر و مقام آزادی
کہ روح بخش جہانست نام آزادی

ان دنوں رواج تھا کہ عید نو روز کے موقع پر شعراء قصائد لکھ کر پڑھا کرتے تھے۔ 1326ھ میں فرخی نے مدحیہ قصیدہ کے برخلاف بادشاہ کو شاہان قدیم کی یاد دلا کر اس کو مشروطیت اور قانونی حکومت قائم کرنے کی ترغیب دی اور حاکموں کو بھی فرض شناسی کی طرف توجہ دلائی اس نظم کا ایک شعر یہ تھا:

لیک فرزندان او قدر را نشناختند
جسم پاکش نذالکد کوب اجانب ساختند

ضیغم الدولہ تشقائی حاکم یزد نے اس نظم پر غضب ناک ہوکر فرخی کے ہونٹ سینے کا حکم دیا

اور ان کو قید میں ڈلوا دیا۔ فرخی نے جیل سے ہی ایک نظم لکھ کر تہران کے آزادی خواہوں کے نام ارمغان کے طور پر بھیجی اور اس وحشی سزا کے متعلق توجہ دلائی:

شرح ایں قصہ شنو از دولت دوختہ ام
تابسوز دولت از بہر دل سوختہ ام

دو تین مہینوں کے بعد فرخی جیل سے بھاگ کر تہران آگئے۔ جیل کی دیوار پر کوئلے سے یہ شعر لکھا ہوا پایا گیا:

بزندان نگر دو اگر عمر طی
من و ضیغم الدولہ و ملک ری

تہران میں آکر انہوں نے بڑے زور کے مقالات لکھے اور اپنے پر ولولہ اشعار سے تمام قوم پرستوں کی توجہ مبذول کرالی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ہجرت کرکے عراق چلے گئے انگریزوں نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ بغداد سے کربلا اور وہاں سے موصل ہو کر چھپتے چھپاتے ننگے پاؤں ایران واپس گئے۔ تہران میں تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہوں گے کہ قفقازیوں نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا مگر وہ بال بال بچ گئے۔ وثوق الدولہ وزیراعظم ہوئے تو فرخی نے معاہدہ 1919ء کی مخالفت کی اور وثوق الدولہ کے خلاف اشعار لکھے اس بنا پر قید کردیئے گئے۔ 1299 خورشیدی (1921ء) کی بغاوت کے دوران میں پھر گرفتار ہوگئے۔ "حکومت فشار" کے نام سے ایک مقالہ لکھا جس کی پاداش میں کرمان میں جلا وطن ہوئے اور وہیں قید کردیئے گئے۔ پھر سردار معظم تیمور تاش کی سفارش سے دو ماہ کے بعد رہا ہوئے۔

1347- 1349ھ یعنی مجلس شوریٰ ملی کے دورہ ہفتم میں یزد کی طرف سے نمائندہ منتخب ہوئے اس مجلس میں ان کے اور ایک دوسرے شخص کے سوا سب حکومت کے حامی تھے۔ انہوں نے استبداد اور ڈکٹیٹر شپ کی مخالفت کی اور اس بنا پر دوسرے نمائندوں سے کئی مرتبہ گالیاں بھی سنیں اور ایک مرتبہ ڈنڈے بھی کھائے آخر جب ہر طرف سے ناکہ بند ہوا تو بوریا بستر لپیٹ کر مجلس کی عمارت میں ہی پناہ لے لی لیکن ایک رات چپکے سے غائب ہوگئے اور ماسکو جاکر سر نکالا۔ وہاں سے برلن پہنچے۔ وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ مجلہ پیکار میں مستبد حکومت کے زور و جبر کے خلاف زور کے مقالات لکھ مارے سفیر کبیر ایران کی طرف سے مقدمہ بھی چلا لیکن بچ نکلے۔ پھر "نہضت" کے نام سے ایک اخبار نکالا اس کے دو تین شمارے نکلے تھے کہ ایرانی حکومت کے ایما پر ان کو برلن سے نکال دیا گیا۔

1311 ش میں تہران آئے معاشی تنگیوں میں گرفتار تھے۔ ایک سال نہیں گزرا ہوگا کہ 3000 ریال کی ایک رقم کی ادائیگی کے عوض جیل میں بند رہے۔ وہاں بھی ان کی بیقرار طبیعت بند نہ رہ سکی اور وہ تیزی و تندی سے حکومت کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر حکام نے انہیں زندان شہربانی میں منتقل کرکے سختی شروع کردی۔ فرور دین 1316 ش کی ایک رات انہوں نے کافی مقدار میں افیون کھا کر خودکشی کرنا چاہی لیکن وقت پر پتہ لگ جانے سے ڈاکٹر آن پہنچا اور ان کی جان بچ گئی۔ اس جرم کی بنا پر انہیں پہلے 27 ماہ پھر بعد میں تیس ماہ کی سزا ہوئی۔ انہوں نے اپنی صفائی پیش نہیں کی۔ صرف کہا تو یہ کہا کہ آخری فیصلہ قوم کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دن زندان شہربانی میں تھے کہ اونچی آواز سے تقریر شروع کردی اور دوسرے قیدیوں کو اپنی حالت زار سے آگاہ کیا۔ ان کو تنگ و تاریک اور مرطوب کوٹھڑی میں رکھا ہوا تھا۔ آخر ان کو خوب مار پیٹ کر کے چپ کرا دیا اور وہاں سے تبدیل کرکے زندان قصر میں منتقل کردیا۔ سردی کی راتوں میں ان کیلئے غذا و لباس میں ہر ناراحتی کا سامان پیدا کیا اور ان کی باغی روح کو کچلنے کی کوشش کی وہاں بھی انہوں نے مقابلہ کیا اور لکھا:

پیش دو شمن سپر افگندن من ہست محال
در رہ دوست گر آما جگہ تیر شوم

جاسوسوں نے شکایت کی کہ وہ باغیانہ اشعار سنا سنا کر قیدیوں کو برانگیختہ کر رہا ہے اس وجہ سے ان کو وہاں سے نکال کر زندان موقت میں بھیج دیا اور وہاں سے ایک تنگ کوٹھڑی میں ڈال دیا اور آسائش کے تمام دروازے بند کردیئے۔ فرخی اب جانکنی کے عالم میں تھے اور ہر وقت موت کی آرزو کرتے تھے۔ یہاں بھی حکومت کا بس نہ چلا تو ان کو ہسپتال لے جاکر کوئی زہریلی دوا دیکر مار ڈالا۔ وفات کی تاریخ 25 مہر 1318 شمسی ہے۔

فرخی نے خود بھی ایک روزنامہ "طوفان" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو سات سال تک وقفوں کے بعد نکلتا رہا اور سولہ مرتبہ حکومت نے اسے بند کیا۔ طوفان اپنے وقت کے بہترین اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں سیاسی اور ملی موضوعات پر بڑے تیز و تند مقالات شائع ہوتے تھے۔ ہر شمارہ میں سر مقالہ ایک رباعی اور آخر میں ایک غزل ہوتی تھی۔ آٹھویں سال طوفان کو ہفتہ وار کردیا تھا وہ بھی ایک سال کے بعد جاری نہ رہ سکا۔

فرخی کا دیوان شاہ حسین مکی کی وساطت سے شائع ہوچکا ہے۔ اس میں 186 غزلیں 376 رباعیات اور چند مسمطات کے علاوہ کچھ قطعات اور کچھ نظمیں ہیں۔

عشقی اور فرخی کی زندگی میں کافی مشابہت ہے وہ بھی جواں مرگ مرے، ازدواجی زندگی میں شریک نہ ہوسکے۔ انہوں نے "قرن بیستم" کے نام سے ایک روزنامہ نکالا تھا اور حکومت کے خلاف تیز و تند مقالات لکھتے تھے۔ وہ بھی مہاجرت کی قید و بند میں رہے حکومت کے استبداد کا نشانہ بنے۔ فقر و دربدری کی زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر حکومت کی ایما پر ہی قتل کروا دیئے گئے۔ دونوں نے آزادی کی حمایت اور استبداد کے خلاف زندگی وقف کردی تھی۔ دونوں کے اشعار میں اشتعال خیز تیزی پائی جاتی ہے۔ عشقی فن کے لحاظ سے فرخی سے برتر ہیں کیونکہ انہوں نے شعر کی نئی ہیئتوں پر تجربے کئے اور ایرانی شاعری میں پہلی مرتبہ اوپیرا لکھا۔ فرخی نے اکثر سعدی، خواجہ اور حافظ کے انداز میں غزلیں اور رباعیاں لکھیں۔ چند ایک مسمطات ہیں۔ مربع مخمس اور مسدس کو بھی اپنایا ہے۔

فرخی نے طبع خداداد پائی تھی۔ اس لئے طبعی طور پر روان و موزوں شعر کہتے تھے۔ سادہ روز مرہ کے الفاظ میں چلتی پھرتی آسان بحروں میں غزلیں نکالی ہیں۔ کہیں کہیں تجانس، مراعات لفظی اور ابہام سے بھی کام لیکر کلام میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تکلف و تصنع نہیں پایا جاتا۔ مثال کیلئے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

تجانس حروف

شیخ و شباب و شاہ و شاہد شحنہ وشبر وشدند
متفق بر آزادی و استقلال ما
مادر ایران نشد از مرد زائیدن عقیم
زان زن فرخندہ را فرزانہ فرزندیم ما

مراعات لفظی اور ایہام

کمل از سرخی خون روی سفید ندولی
ہیچ ملت بسیہ بختی ایران نیست
چو در بستم و مست ازمی تابش کردم

ماہ اگر حلقہ بدر کوفت جوابش کردم

فرخی کے کلام کی روح رواں اس کا جوش و اخلاص ہے۔ اس کا دہکتا ہوا دل اس کے اشعار میں دھڑکتا نظر آتا ہے وطن کی آزادی کیلئے کٹ مرنے کی آرزو ہے جو اس کو نڈر بناتی ہے اور بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر کھا جانے سے نہیں روکتی۔ ان کی تقریباً ساری زندگی کرب و اضطراب کی زندگی رہی۔ انہیں کبھی بھی گھر کی آسائش نصیب نہیں ہوئی۔ جوں جوں حکومت کے جور و ستم کا تیل ان کے شعلوں پر پڑتا رہا اور وہ بھڑکتے رہے اور وہ اپنے کلام میں تیز تر ہوتے گئے۔ ان کو اپنی اس تند نویسی کا اعتراف تھا۔ انہوں نے لکھا:

نوک کلک حق نویس تیز و تند فرخی
باطرفداران خارج ذوالفقاری میکند
طوفان خون پدید کند کلک فرخی
آن سرسریدہ تاشدہ مانوس انقلاب

فرخی کی آواز میں ایک جوش و ولولہ ہے۔ وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے لوگوں کو ابھارتا ہے۔ عزم پیدا کرتا ہے۔ بلند ہمتی کی تلقین کرکے یقین پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

روزگار او را لنساز و پست ہمچون فرخی
ہر کہ باطبع بلند و ہمت مردانہ بود
گویند لب ببند چوبنی خطا زما
راہیست ناصواب کہ تکلیف میکند

ان کے اشعار میں دشمنوں کی صفیں الٹا دینے اور غاصبوں سے حقوق چھین لینے کا پیغام ہے۔ کہیں کہیں بغاوت کی بو بھی آتی ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار تھے جن کو سن کر مستبد حکمران تاب نہ لاسکے اور تاریخ ادب میں ان کو بے مثال سزا دی گئی۔ یعنی ان کے ہونٹ سی دیئے گئے وہ بھی زمانہ تھا کہ بادشاہ شعراء کے منہ جواہر سے بھر دیتے تھے ان کے یہ اشعار نمونہ کے طور پر دیکھئے۔

در کف مردانگی شمشیر میباید گرفت
حق خود را از دہان شیر میباید گرفت
بہر مشتی سیر تاکی یک جہانی گرسنہ

انتقام گرسنہ از سیر میاید گرفت

○

باداس و چکش کن محو این خسرو و دیوانرا
چون کوه کنی ہر روز باتیشہ بناید کرد
کشور نلپاک کی گردو زلوث خائنین
تانریزد خون نلپاک از در و دیوارھا

ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جمہویت کی روح کو پالیا تھا وہ چاہتے تھے کہ حکومت عوام کی فلاح و بہود کیلئے کام کرے۔ اس کو عوام کے جذبات و افکار کا احساس ہو۔ عوام جسے چاہیں اپنے میں سے حاکم منتخب کریں۔ انہوں نے لکھا:

در پیش گاہ اہل خرد نیست محترم
ہرکس کہ فکر جامعہ را محترم نداشت
ہر بنای کہ تنہا دند بر افکار عموم
بود گرز آہن او پایہ و بنیاد نداشت
قسم بہ عزت و قدر و مقام آزادی
کہ روح بخش جہانست نام آزادی

ان کی رباعیات سیاسی اور صحافتی انداز لئے ہوئے ہیں۔ اکثر رباعیاں' انتخابات وثوق الدولہ' متوفی الممالک' قوام السلطنتہ اور سردار سپہ کی وزارتوں کی تشکیل اور تخریب کے بارے میں ہیں۔ سیاست خارجہ اور داخلہ پر تنقید ہے۔ بعض میں اپنی زندگی کے متعلق تاثرات ہیں۔ اور بعض میں ہنگامی حالات پر تبصرے ہیں۔ روح وہی آزادی و استقلال کی روح ہے کہنے کا انداز سادہ و رواں ہے۔ باکمال رباعی وہ شمار ہوتی ہے جس میں پہلے دو مصرعے متوازن ہوں۔ تیسرا مصرعہ ذرا بلند ہوجائے اور چوتھے یعنی آخری مصرعہ پڑھنے میں آواز گر جائے اور مطالب کی ادائیگی سامعین میں تعجب و تحسین کا احساس پیدا کرے۔ فرخی کی رباعیاں اس معیار پر کم اترتی ہیں۔ بعض رباعیاں تو الگ الگ دو شعر معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً:

رسم و رہ مستوفی اگر خوب نبود
نزد ہمہ کس ایں مہ محبوب نبود
ہنگام زما مداری او باید

از داخلہ و خارجہ مرعوب نبود

○

آنانکہ پریر قلب مارا خستند
دیروز قرار با اجانب بستند
دوشینہ یگانہ عضو دولت بودند
امروز نمائندیگا دولت ہستند

فرخی کی ایک نظم "اوضاع داخلہ" اپنے مطالب کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اشعار میں طنز کا استعمال بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ صور اسرافیل میں دھخدا نیر میں طنز لکھتے رہے ہیں لیکن اشعار میں صحافتی انداز کی طنز شاید فرخی نے ہی شروع کی اس لحاظ سے یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر مستبد حکمران کے عہد سلطنت میں اوضاعی ابتری کا حال بیان کرنا چاہتا ہے لیکن خاص طور پر خرابی احوال کا ذکر نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ سب جگہ امن و امان ہے۔ راحت ہے خوشحالی ہے لیکن جاننے والے سمجھتے ہیں کہ حقیقت یہ نہیں ہے مثلاً اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے:

للہ الحمد کہ تہران بود آزرم بہشت
ملت از ہر جہت آسودہ چہ زیبا وچہ زشت
مشفق وبا عاطفہ وپاک سرشت
فقراء را نبود بستر و بالین از خشت

الغرض از سلم وجور اثری نیست کہ نیست
خیر انیست کہ اینجا خبری نیست کہ نیست

نیمایوشیج

شعرنو کے بانی

ان کا اصلی نام علی ہے باپ کا نام ابراہیم۔ اسفند یاری قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبرستان میں ایک چھوٹے سے گاؤں "یُوش" میں پیدا ہوئے اسی لئے اپنے آپ کو یوشیج لکھتے ہیں۔ طبری زبان میں یج فارسی کی نسبتی کے برابر ہے۔ یعنی یوشی۔ 1300 شمسی سے انہوں نے اپنا نام نیما رکھ لیا۔ نیما طبرستان کے ایک مشہور سپہ سالار کا نام ہے۔ نیما کا بچپن اپنے گاؤں میں ہی گزرا۔ پہاڑی لوگوں کی سادہ زندگی چراگاہوں اور گرم و سرد مقامات میں گردشوں کی زندگی سے آشنا رہے۔ اپنے گاؤں میں ہی مسجد کے ملا سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے بھاگا کرتا تھا اور درخت پر لٹکا کر ڈنڈوں سے پیٹتا تھا کہ میں ان مروجہ خطوط کو زبانی یاد کروں جو گاؤں کی روزمرہ کی زندگی میں لکھنے کے کام آتے ہیں۔ ان کے باپ بڑے کس بل کے کسان اور گلہ دار تھے۔ نیما کی والدہ ان کو ہفت پیکر نظامی کی کہانیاں اور حافظ کی غزلیات سنایا کرتی تھیں۔ جب تہران آئے تو فارسی زبان سیکھنے کیلئے مدرسہ حاج حسن رشیدیہ میں داخل ہوئے۔ بعد میں فرانسیسی زبان سیکھنے کیلئے "مدرسہ سن لوئی" میں داخلہ لیا لکھنے پڑھنے میں تو خاص ترقی نہ کی۔ البتہ وہاں شعری ذوق کی تربیت ضرور ہوئی۔ استاد نظام وفا جیسے معلم کی تشویق اور سرپرستی نے ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ انہوں نے اسی طالب علمی کے زمانہ میں وفا کے نام ایک نظم لکھی تھی۔ جس کے حاشیہ پر استاد نے لکھا۔ "روح ادبی شما قابل تعالی و تکامل است۔ من مدرسہ را بہ اشتن چون شما فرزندی تبریک میگویم"۔

نیما نے جوانی میں قدم رکھا تو عشق نے بھی سر نکالا۔ ایک غیر مذہب کی حسینہ کو دل دے بیٹھے لیکن مذہبی بیگانگی کی وجہ سے محبت مناکحت کے درجہ تک نہ پہنچ سکی۔ مایوس ہوئے تو یوش کے کوہستانی حسن نے ان کا دل کھینچا۔ وہ صفورا کی بے تاب نگاہوں کے شکار ہوئے۔ ان کے والد نیما کی ازدواجی زندگی کیلئے رضامند تھے لیکن وہ پہاڑوں اور بیابانوں کی رہنے والی دوشیزہ شہر کی تنگ فضا میں آنے کیلئے رضامند نہ ہوئی۔ 1308 ش میں نیما کے والد وفات پا گئے اور کنبہ کی ذمہ داریاں بھی آپڑیں۔ اسی سال عالیہ جہانگیر سے شادی کرلی۔

1309 میں وہ آستارا گئے اور دبیرستان حکیم نظامی میں ادبیات فارسی پڑھاتے رہے۔ 1311 میں

تہران آکر یوش لوٹ گئے اور گھر بار کے کام سنبھالتے رہے۔ 1317 سے 1320 تک مجلہ موسیقی کے ادارہ تحریر میں شامل رہے۔ کئی سالوں تک انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی۔ 1328ھ سے وہ پھر مطبوعاتی کاموں میں مشغول ہوئے اور اسی سال سے وزارت تعلیم میں ادارہ اشتہارات میں کتب کی تنقید و تحقیق پر مامور رہے۔ آخر 1338 میں وفات پاگئے۔ نیما بہت تنہائی پسند تھے۔ کم بولتے، کافور پیتے، کھوئے کھوئے سے رہتے۔ نظامی اور رومی کو خوب پڑھا۔ کشکول شیخ بہائی کا مطالعہ ان کا مشغلہ تھا۔ فرانسیسی ادبیات سے بھی خوب واقف تھے۔

ان کا کلام اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے اور کچھ **منتخبات** میں بھی شامل کیا جاچکا ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل نظمیں الگ کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہیں۔

قصہ رنگ پریدہ 1299 ش۔ افسانہ 1301_ خانوادۂ سرباز 1304 اور نثر میں "دونامہ" 1329 میں شائع ہوئی۔ ان کی رباعیات خط شین پر توکا ہے اور دوسرا ان کا۔ مازندانی زبان میں "روجا" کے نام سے ان کی رباعیات کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ 1334ھ میں ابوالقاسم جنتی نے "نیما زندگانی و آثار او" کے نام سے ان کی مشہور نظموں کو اکٹھا کرکے یکجا شائع کردیا ہے۔ ان کی اور کتاب "ارزش احساسات" کے نام سے دکتر جنتی نے 1335 میں شائع کی ہے یہ وہ طویل مقالہ ہے جو انہوں نے مجلہ موسیقی میں لکھا تھا۔ مانلی ان کی ایک اور طویل نظم ہے جو دکتر جنتی نے 1336 میں شائع کی۔

شروع شروع میں وہ قدماء کے رنگ میں ہی لکھتے رہے۔ وہی پرانی فکر اور پرانی تشبیہات، درد ہجراں، غم دوراں، ناپائیداری زمانہ وغیرہ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ نوجوانی کا کلام ہے۔ **محمد ضیاء ہشترو ناى** نے 1342ھ میں "**منتخبات اشعار**" کے نام سے جو مجموعہ شائع کیا۔ اس میں پہلی مرتبہ نیما کی مندرجہ ذیل نظمیں شامل کی گئیں۔ اقتباس از قصہ رنگ پریدہ، چشمہ کوچک، خروس و روباہ، بہ رسام ارژنگی، بزملا حسن مسئلہ گو، روزگار کود کی گذشت، گل تازہ دار وغیرہ۔

"افسانہ" نیما **یوشیج** کی وہ طویل نظم ہے جو پانچ پانچ مصرعوں کے 128 بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا اور تیسرا۔ دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے پانچواں مصرعہ آزاد ہے یہ نظم ان کی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس میں انہوں نے قدیم طرز سے ہٹ کر تجدد کی راہ نکالی ہے۔ جنتی نے لکھا ہے کہ یہ نظم نیما کے پہلے عشق میں ناکامی اور حسرت کا نتیجہ تھی لیکن اس کی دوسری محبوبہ یوش کی وہ صاحب ذوق کوہستانی صفورا تھی جس نے شاعر کو الہام بخشا۔ وہ پھر

قدرتی مناظر میں جاکر اپنے دل کی تسکین ڈھونڈنے لگا۔ پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور چراگاہوں کی یادیں تازہ ہوئیں۔ یہ نظم عاشق نامراد اور حسن و عشق سے بھرپور افسانہ کی گفتگو ہے۔ اس میں بعض نہایت عمدہ اچھوتی تشبیہیں اور استعارے ہیں اور بعض بیانیہ شاعری کے جاندار دلنشین ٹکڑے ہیں۔ شاعر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ شکوہ سنج ہے۔ بابا طاہر کی طرح اپنے دل سے نالاں ہے اس کا یہ بند ملاحظہ کیجئے کس قدر سچی پکار سنائی دیتی ہے:

ای دل من، دل من، دل من
بینوا، مضطرا، قاتل من
باہمہ خوبی و قدر و دعویٰ
از تو آخرچہ شد حاصل من
جز سرشکی برخسارہ ی غم

عاشق کی مایوسی اور حسرت کا اندازہ کرنا ہو تو یہ بند پڑھئے:

رو افسانہ! کہ ا-لنہا فریب است
دل زوصل و خوشی بی نصیب است
دیدن و سوزش و شادمانی
چہ خیالی و وہمی عجیب است
بی خبر شاد و بنیا فسردہ است

اور پھر یہ شعر:

قلب من نامہ ہای آسما نہاست
مدفن آرزو ہاو جانہا است

اور اس پر ناکام عاشق کے تاثرات:

عشق، ہذیان بیماری ی بود
یا خمار می ناب بودہ
ہمرہا! این چہ ہنگامہ ی بودا

اس نظم سے دوسرے نامی گرامی شاعر متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کی تقلید میں نظمیں لکھیں۔ عشقی کی "سہ تابلوی مریم" اور "اید آل مرد دہقان" اور شہریار کی "ہذیان دل" اس کی پیروی میں لکھی گئیں۔ "افسانہ" نیما کی جوانی کا شاہکار ہوتی ہے۔

افسانہ کے بعد نیما کی ایسی نظمیں شائع ہوتی رہیں جن میں سادہ عروضی وزن تھے۔ لیکن مضامین تازہ تھے اور وہ آہستہ آہستہ شعر آزاد و نظم عاری کی طرف آرہے تھے بعد میں ان کی مشہور نظمیں مجلہ موسیقی میں شائع ہوتی رہیں۔ ان میں سے بعض موزوں اور سبک قدیم کی پابند ہیں۔ بعض نئے انداز کی ہیں اور بعض نئے اور پرانے اسلوب کی آمیزش سے وجود میں آئی ہیں۔ ان نظموں میں بھی شاعر اپنے اندرون کی کیفیات غم و الم کا اظہار کرتا ہے۔ اندوہناک شب' غراب' مرغ غم' **ققنوس** اور شمع کرجی ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ مجلہ موسیقی کی اشاعت بند ہوجانے کے بعد مجلہ سخن' مردم' اندیشہ نو' خروس جنگی اور کویر وغیرہ میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔

نیما شعر میں خلوص کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر زندگی سے وابستہ ہو۔ اس کا شعر زمان و مکان سے بالا نہ ہو۔ وہ شاعر اپنے پیش رووں سے زیادہ اچھا ہے جس نے اپنے زمانے کا رنگ اپنایا۔ اس کا احساس شخصی ہو اور اس کا احساس درد بھی نیا ہو۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیا نئی چیز لکھی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ دیکھو کہ میں زندگی کے کن نئے دردوں میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے "دونامہ" میں بتایا ہے کہ شاعر زندگی کے مشاہدات پر غور کرتا ہے۔ زندگی سے اسے خام مواد ملتا ہے وہ اپنے ذہن خصوصی میں اس کو پکارتا ہے اور پھر اپنی ہنرمندی سے اس کو ایک نئی شکل بخشتا ہے وہ صرف وہی بیان نہیں کرتا جو وہ دیکھتا ہے بلکہ وہ ایک نیا نقش تولید کرتا ہے اس نئے نقش کو وجود میں لانے کیلئے اسے اوزاروں کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے وہ ہیئت کے نئے ڈھانچے سوچتا ہے اور اپنے فکر نو کے اظہار کیلئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ نیما سمجھتے تھے کہ معنی تو بیان کرنے کیلئے کلمہ کی ضرورت پڑتی ہے پھر کلمہ کی ترکیب جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ کس طرح معانی کے اظہار کیلئے موزوں ہوسکتا ہے اس کے صوتی اثرات اور صرفی و نحوی ضرورت کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ آخر میں وزن و قافیہ اور شکل و ہیئت کا مسئلہ پیش آتا ہے لیکن یہ سب چیزیں اسباب و وسائل ہیں جو کسی حاکم نے مقرر نہیں کئے بلکہ ان کا اصل حاکم شاعر کی خود زندہ طبیعت ہے۔ کلمہ' جملہ' وزن اور قافیہ معنی کے اظہار کیلئے ہیں۔ شعر وزن اور قافیہ نہیں ہے بلکہ معنی کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔

نیما کی شاعری میں یہ تحول فرانسیسی زبان و ادبیات سے آشنائی کے بعد واقع ہوا۔ شعر آزاد اور نظم عاری تو اروپائی ادبیات میں ایک کامل صنف سخن شمار ہوچکی ہیں۔ مون سرکیسان نے ژورنل

دو تہران مورخہ بہمن 1319 میں نیما کے متعلق لکھا تھا کہ وہ فرانسیسی شاعر مالارمہ کا مرید ہے اور اس کے افکار و احساسات "پل والری" اور آنادو نوائی سے بھی مشابہت رکھتے ہیں۔

فارسی شاعری میں اس نئے تحول کے متعلق نیما نے خود توضیح کی ہے۔ ان کے خیال میں شعر کیلئے وزن ضروری ہے خواہ وہ کلاسیکی انداز میں ہو یا شعر آزاد کے طریق میں۔ کلاسیکی انداز میں وزن یک رنگ ہوکر رہ گیا ہے کیونکہ وہ موسیقی کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ نیما نے لکھا ہے کہ میری کوشش یہ ہے کہ میں وزن کو اس قید سے نکال دوں اور اس کو قدرتی (DECLAMATION) کے طور پر اشعار کے مختلف مطالب کے اظہار کیلئے وجود میں لاؤں کیونکہ جب لوگ شعر سنتے ہیں تو وہ ایسے آہنگ بھی چاہتے ہیں جس میں وہ خود ان اشعار کو گاکر پڑھ سکیں۔ ہم آج شعر کو ایک فنائی موضوع کی طرح کام میں نہیں لاتے بلکہ اجتماعی مطالب کے اظہار کیلئے کام میں لاتے ہیں۔ وزن ہمارے احساسات کیلئے ایک مناسب پوشاک ہے جس طرح ہم باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح شعر بھی چاہئے کہ ان احساسات کو بیان کرے۔ اس طرز بیان کیلئے ہم مجبور ہیں کہ مصرعوں کو چھوٹا یا لمبا کریں۔ ایک مصرعہ یا ایک شعر وزن پیدا نہیں کرسکتا۔ بلکہ چند مصرعے اکٹھے ملکر ایک وزن پیدا کرتے ہیں۔

نیما نے وزن میں ہارمونی (توافق) پیدا کرنے کیلئے کافی آزمائشیں کی ہیں۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں اپنی بعض نظموں میں وزن کی غلطیاں محسوس کرتا ہوں۔ ان کی اپنی نظر میں مندرجہ ذیل نظموں میں وزن بڑے سلیقہ سے درست ہوگیا ہے۔

قوقولی قوقو' خروس میخواند' ای آدمہا' وای برمن' مرغ آئین اور مہتاب۔ عروضی اور غیر ضروری اشعار کی بحث دیر سے چلی آتی ہے۔ قدامت پسندوں نے نیما پر بھی اعتراضات کئے۔ انہوں نے خود بھی قدیم اوزان و بحور میں اشعار لکھے ہیں انہوں نے بتایا ہے کہ سامعین میں احساسات کو ابھارنے اور ان میں جوش پیدا کرنے کیلئے میں نے نئے اوزان پیدا کئے ہیں۔ ان کی اصل بھی وہی قدیم بحور ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بحور عروضی ہم پر مسلط نہ ہوں بلکہ ہم اپنے مختلف رجحانات و حالات کے مطابق بحور پر مسلط ہوں۔ مثال کے طور پر صرف ایک بند ملاحظہ کیجئے۔ نئی مرکب تشبیہ اور تخیل ادا کرنے کیلئے قدیم قافیے اور مصرعے ایک ہی وزن اور بحر میں کس قدر ناکافی ہیں۔

قوقولی قو' خروس میخواند
ماز درون نہفت خلوت دہ

از نشیب رہی کہ چون رگ خشک
در تن مردمان در اند خون
می تند بر جدار سرد سحر
میتر اود بہر سوی ھامون

نیما نے اس طرز نو کو ایک تھیوری کی صورت میں بیان کیا ہے اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ بہت سے نوجوان اس کی پیروی کرتے ہیں مگر یہ مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ نیما کو ادبیات نوین کا بانی کہا جاتا ہے۔

نیما شاعر غم ہے اس نے خود بتایا ہے کہ "مایہ اصلی شعر من رنج من است۔ بہ عقیدۂ من گوینده واقعی باید آن مایہ را داشتہ باشد۔ من برای رنج خود و دیگران شعرمی گویم۔"

انہیں زندگی میں دکھ نظر آتا ہے ان کا دل خود درد آشنا ہے اس لئے وہ دوسروں کے درد میں شریک ہیں۔ جہاں وہ اپنے غمزدہ دل کی کیفیات بیان کرتے ہیں۔ وہاں فقیروں' بے نواؤں اور دکھیا ماؤں کا حال بیان کر کے رلاتے ہیں اور امیروں' خوشحالوں اور بے فکروں کو ان کی حالت زار سے آگاہ کرتے ہیں۔ افسانہ' خانوادۂ سرباز' ای آدم ہا' کارشب پا اور دوسری بے شمار نظموں میں کراہتی ہوئی دکھیا انسانیت ملے گی۔ نمونہ کیلئے دو مثالیں دیکھئے۔

بردم د ہکدہ مردی تنہا
کولہ بارش بردوش
دست او برور میگوید باخود
غم این خفتہ چند
خواب در چشم ترم میش کند

پاسبان کا خیال

بچہ ہای تو دو تای ناخوش
دست در دست تب وگر سنگی دادہ بجا میسوزند
آن دوبی مادر و تنہا شدہ اند
مرد

مرد آنجا بسراغ آنہا
در کجا خوابید
بکجا پاشدہ اند

اور پھر شاعر کا انتباہ

پشم می ریسد' رخت می شوید
یک زن اینگو نہ رزق می جوید
شرمستان نباید کہ شما بیکار
شاد و خندانید' یک زن غمخوار
با ہمہ ایں رنج گرسنہ ماند
دربدر خواند

ان افکار کی بدولت نیما شاعر مردم ہے اور انسان دوست نیما کا تخیل باریک و لطیف ہے۔ اس کے تخیل میں گہرائی ہے وہ علامات کے ذریعے سوچتا اور اظہار کرتا ہے اس لئے پیچیدہ ہے اور اس کا سمجھنا دشوار بھی ہے۔ اس کی تشبیہات باریک اور تعجب انگیز ہیں لیکن حقیقت سے دور نہیں۔ مثال کیلئے ناقوس کا ایک ٹکڑا دیکھئے:

بانگ بلند دلکش ناقوس
در خلوت سحر
بہ شگافتہ است خرمن خاکستر ہوا
وز راہ ہر شگافتہ' با زخمہ ہای خود
دیوار ہای سرد سحر را
ہر لحظہ میدرد

ان کی بعض نظموں کے ترجمے روسی' فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں ا ر ان کو ادبات نو کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔

جلال آل احمد لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے ضیاء ہمشترودی نے نیما کی قدر و منزلت پہچانی۔ شہ یار نے بھی اپنی

منظومات "ہذیان دل" اور "رثاء مادر" میں اس کا اثر قبول کیا۔ اگر ہم کہیں کہ تو للی، نادر نادر پور اور شاملو بھی اس کی پیروی پر نازاں تھے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ اخوان ثالث نے تو من و عن اس کی پیروی کی ہے اور بہت سے نام آور اور بے نام شعراء ہیں جو نیما کی راہ پر چلے ہیں یا چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

حسین منزوی شاعر معاصر نے لکھا ہے:

"نیما بزرگ ترین شاعر معاصر ماہست، کامل ترین شعرہای معاصر را در دفترہای شعر نیما می توان پیدا کرد۔"

"شعر می ترادد مہتاب۔ می درخشد شبتاب، بہ نظر من یکی از زیبا ترین شعرہای معاصر است نظر فرم، زبان و وزن و مثالہامی دیگر۔"

نادر نادر پور نے لکھا ہے:

"کسی کہ برای نخستین بار بینش تازہ ای بہ شعر داد نیما یوشیج بود۔ او بود کہ اقتصادی زبان را دریافت و دانست کہ محتوای تازہ قالب ہای تازہ می طلبد و زبان نومی خواھد و برآوردن این حوائج را مردانہ بعہدہ گرفت۔"

نیما کے مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے نثر و نظم شائع ہو چکے ہیں۔

یادداشتہا و مجموعہ اندیشہ۔ 1348 ش

آب در خوابگاہ مورچگان 1351_ حرف ہای ہمسایہ 1351_

حکایات و خانوادۂ سرباز 1353_ دنیا خانہ من است 1350_

ستارہ ی در زمین۔ شعر من۔ چاپ چہارم 1356_

شہر شب و شہر صبح 1355_ قلم انداز۔ چاپ دوم 1353_

کشتی و طوفان 1351_ ماخ اودر۔ چاپ دوم 1351_

مانی و خانہ ی سریلویلی 1352_ ناقوس 1355_

1- نامہ ہای نیما بہ ہمسرش عالیہ 1351_ نمونہ ہای از شعر نیما یوشیج 1352_

2- دنیا خانہ من۔

3- کشتی و طوفان۔

4- ستارہ ای در زمین۔

5- نامہ ہای نیما یوشیج (رسالہای 1328 تا 1329 ش)

سرمد

(شاعر ملی ایران)

سید محمد صادق نام اور سرمد تخلص ہے۔ 1335ھ میں تہران میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید محمد علی اہل علم و فضل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سرمد نے ابتدائی تعلیم تہران کے جدید مدرسوں میں ہی حاصل کی لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وکیل عدالت کے ساتھ منشی کا کام کرتے رہے بعد میں خود قانون کی تعلیم حاصل کر کے وکیل بن گئے چونکہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو ہو ہی چکا تھا پریس سے بھی ان کی وابستگی قائم تھی۔ 1940ء میں جب جنگ عالمگیر پھیل گئی تو سرمد نے ملک کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور اسی سال "صدائے ایران" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا جو 1946ء تک شائع ہوتا رہا۔ اسی دوران میں ان کی سیاسی اور ادبی حیثیت معتبر اور ممتاز ہوتی گئی۔ وہ حوادث زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات کو نظم میں بھی لکھتے رہے اور ملی افکار و خیالات کی ترجمانی کرتے رہے۔

وکلاء میں صداقت و لیاقت کے لحاظ سے بھی ان کی خاصی شہرت تھی۔ محمد رضا شاہ شہنشاہ ایران کی قدر شناس نگاہوں نے ان کو وکیل و مشیر قانون خاص دربار مقرر کیا اور آخر تک وہ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ 1944ء میں انہوں نے اخبار نویسوں کی معیت میں انگلستان اور فرانس کا بھی سفر کیا۔ 1950ء میں شہنشاہ ایران کی معیت میں ملک الشعراء کی حیثیت سے پاکستان میں بھی تشریف لائے اور پھر 1955ء میں ہیئت فرہنگی ایران کے ہمراہ دو بار پاکستان آئے۔ انہوں نے پاکستان اور یہاں کی شخصیتوں کے متعلق جو نظمیں لکھی تھیں وہ بہت مقبول ہوئیں۔ دوسری مرتبہ جب وہ پاکستان آئے تو انہیں نظموں کا مجموعہ "درای کارواں" کے نام سے شائع کر کے ہمراہ لائے تھے۔ اسی سال وہ ایک اخبار نویسوں کی جماعت کے ہمراہ ترکیہ گئے اور مختلف موقعوں اور

تقریبوں پر انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان کو بھی "نغمہ کمال" کے نام سے شائع کیا ہے۔

سرمد نے تاسیس پاکستان قائداعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں قصاید اور دیگر منظومات لکھ کر ایران و پاکستان میں یک جہتی اور یگانگی پیدا کرنے میں عمدہ کردار ادا کیا۔

1960ء میں خرابی معدہ کا آپریشن کرانے کیلئے وہ لندن گئے، وطن واپس آئے لیکن صحت بحال نہ ہوئی اسی سال وفات پاگئے۔

سرمد نے طالب علمی کے زمانہ سے ہی شاعری شروع کردی تھی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے اشعار میں لفظی و معنوی محاسن پیدا کرکے مقتدر شعراء میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ وہ مدتوں سے انجمن ادبی ایران کے ممبر رہے۔ شعرو شاعری کے مقابلوں میں انہوں نے متعدد و انعامات حاصل کئے۔ وہ ایران میں "شاعر ملی ایران" کے لقب سے معروف ہوئے۔

سرمد کا شمار ان شعراء میں ہوسکتا ہے جنہوں نے ہیئت و معانی دونوں میں نئی راہیں پیدا کیں اور پرانی روش کو بھی قائم رکھا۔ اگر ہیئت پرانی رہی تو اس میں نئے افکار و خیالات کا اظہار کیا۔ ان کا خیال ہے کہ پرانی لکیر کو پیٹتے رہنے اور محض رسمی طور پر پرانے استادوں کی تقلید کرتے رہنے سے کلام میں تازگی اور پائیداری نہیں رہتی چنانچہ انہوں نے کہا:

بہ تقلید گویند گان کہن
نکردم گنہ گر **نگفتم** سخن
کہن ہرچہ شد ناروا میشود
دگر نو نگر دو فنا میشود

انہوں نے غزل میں جو نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ اس کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ غزل کیا ہے ایک مرصع مسدس ہے۔

آن قد و آن قوارہ
از راستی **نیفتد**
و آن لطف بیشمارہ
در کاستی **نیفتد**
اصلت خلل نگیرد
حسنت بدل نگیرد
نوشد زمانہ سرمد

از نو حدیث سرکن
ہجو ترانہ سرمد
طرز غزل دگرکن
باشد کہ جالب **افتد**
مقبول غالب **افتد**

سرمد اقدار شعر سے آگاہ ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ شعر اپنے ماحول سے بیگانہ نہ ہو۔ صداقت اور واقعیت کا آئینہ دار ہو۔ وہ اپنے ملک و ملت کے احساسات کا ترجمان ہو:

سخن گوی باشد زبان زمان
کہ حال زمان را شود ترجمان

وہ شعر کی اس خصوصیت کے بھی علمبردار ہیں کہ کلام ایک سرور اور لذت بھی بخشے اور اس سے روح میں مسرت کا ایک احساس ہو اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ شعر شاعر کے اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلے اور تکلف و تصنع پر مبنی نہ ہو یا مال و دولت اپنے اور انعام وصلہ حاصل کرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو:

ہنر نبود کہ با زور زرشاہ
رسائی قبہ خرگاہ برماہ
ہنر باشد کہ بی تشویق ممدوح
سخن گوئی کہ گردد شاد از آن روح

جب سے سرمد ملک الشعراء کی حیثیت سے دربار شہنشاہی سے وابستہ ہوئے اور شہنشاہ کے متعلق جشنوں اور تقریبوں میں قصاید لکھنے لگے۔ ان کے اشعار میں بنی تکلف و تصنع کا اضافہ ہوا۔ شاعرانہ تخیل اور لطافت بیان بھی کم ہوگئی۔ خیال ہوتا ہے کہ خیالات کو محض نظم کردیا گیا ہے۔

سرمد کی نظر وسیع ہے۔ قوموں کی بلندی و پستی اور عروج و زوال پر اس کا مطالعہ ہے وہ تقدیر امم کو سمجھتا ہے اس کا خیال ہے کہ جو قومیں اپنی آزادی و استقلال کیلئے جدوجہد کرتی ہیں اور اپنی ترقی اور پائندگی کیلئے قربانی کرتی ہیں۔ وہی ان نعمتوں سے مالا مال ہوتی ہیں۔ قانون خداوندی بے کاروں قسمت کے شاکروں اور غیبی امداد کی امید پر جینے والوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ انہوں نے کہا:

پیدائش ململ نہ بخت است و اتفاق

کس ملک بی وسیله فراہم ندیده است

اور پھر بتایا کہ خدا انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرتے ہیں:

مشیت ازلی برمراد ملتہا است
کہ در ارادۂ ملت حق این مشیت کرد

ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک مرد حق آگاہ- مردہ اور بے روح قوم کو زندہ کر سکتا ہے ان کی نظروں میں قائداعظم اور سر اقبال کی شخصیت نمایاں تھی- انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں اپنے اس اعتقاد کی وضاحت کی ہے:

حیات مرد خدا اور حیات ملتہا است
کہ مرد حق سرد جان در حیات ملت کرد
قیام مرد حق کمترز قیامت نیست
کہ بعث ملت و دولت کند باستعجال

سرمد اپنے دین پر پختہ یقین رکھتے ہیں- وہ ان کو محض رسوم و عبادات کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ:

دین علم و دین عدل و دین عقل و دین' برہان سمجھتے ہیں اور بے دین دشمنوں کو اپنے دین کی حق و صداقت کا یقین دلاتے ہیں- یورپ میں جو وطنیت کی ہوا چلی ہوئی ہے کہ قومیت کا انحصار ہم وطنی پر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو وطن کے دشمن جان کہ مغایرت اور نفرت پیدا کرتے ہیں- علامہ اقبال کی طرح سرمد کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ملتیں وطن سے نہیں بنتیں بلکہ ملت کی بنیاد ہم خیالی اور ہم دینی پر منحصر ہے:

گر ملل را وحدت اوطان فزاید براخوت
وحدت اوطان کجاتا وحدت آمال اخوان؟

سرمد کو فن شعر میں بھی خوب مہارت ہے زبان تو ان کی اپنی ہے لیکن پھر اس قدر ماہرانہ دسترس حاصل ہے کہ جس طرح چاہتے ہیں الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال سے بیان میں لطافت پیدا کرتے ہیں وہ ضائع بدائع سے بھی کام لیتے ہیں خاص طور پر تجنیسات مراعات لفظی اور ایہام کے استعمال میں ان کو بڑی قدرت حاصل ہے- تصنع کے داخل ہوجانے سے ان کے بیان میں گرانی پیدا نہیں ہوتی اور روانی میں فرق نہیں پڑتا- محمد رضا شاہ پہلوی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حرم میں آئینہ کاری کرائی- حرم کے بیرونی دروازے پر کتبہ کے طور پر سرمد

نے جو رباعی لکھی ہے وہ لطافت خیال اور صنعت لفظی میں مہارت کی بہترین مثال ہے وہ رباعی یہ ہے:

گر در حرمت آئینہ کاری کردم
کاری نہ سزای شہریاری کردم
تاجلوۂ حق بہ بینم از طلعت تو
در پیش رخت آئینہ داری کردم

ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی اور ایسی موزوں طبیعت پائی تھی کہ جب قلم اٹھاتے ڈھلے کے ڈھلے اشعار نکلتے آتے- سفر پاکستان اور ترکیہ میں انہوں نے ارتجالاً کئی قطعات' غزلیں اور رباعیاں کہی تھیں جو شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کیلئے بے حد کیف و لذت کا سرمایہ ہیں- اس قسم کی کئی معنوی یادگاریں وہ دوستوں کی بیاضوں اور ملاقات کے دفتروں میں چھوڑ گئے تھے- ان کے کچھ فی البدیہہ اشعار "درای کارواں" اور "نغمہ کمال" میں بھی محفوظ کر دیئے گے ہیں- وہ فارسی شاعری کے ظفر علی خان ہیں- انہوں نے خود اپنے آپ کو الہامی شاعر کہا ہے- ان کی درازی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں متانت' وقار بلند نگاہی اور وسعت آتی گئی-

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے سرمد کے نام سے ان کا کلام جمع کردیا ہے اور ان کے احوال زندگی کے ساتھ ان کی شاعری کے محاسن کو اجاگر کیا ہے- کتاب فارسی میں لکھی گئی اور تہران میں 1341 ش میں شائع ہوئی-

شہریار

محمد حسین نام- شہریار تخلص پہلے بہجت تخلص کرتے تھے- ان کے والد حاج میر آقا آذربائیجان عدلیہ میں وکیل تھے- 1285 شمسی تبریز میں پیدا ہوئے- ابتدائی اور متوسط تعلیم تبریز میں ہی تمام کی- اس کے بعد تہران میں آکر مدرسہ دارالفنون سابق میں تحصیلات کی تکمیل کی- بعد میں دانش کدہ طب میں داخل ہوئے لیکن آخری سال میں تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے- ظاہری وجہ تو یہی معلوم ہے کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کرنے میں ناکام رہے اور ان کے حساس دل و دماغ پر اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ اپنی جوجہات کو مطالعہ کی طرف مبذول نہ کر سکے-

آج کل گوشہ نشینی اور قناعت کی زندگی بسر کر رہے ہیں گردش زمانہ کے ہاتھوں نالاں ہیں اور اپنی افسردہ روح کے ساتھ بیوی اور بچی کے ہمراہ دن گزار رہے ہیں- فقط موسیقی اور شعر وشاعری مشغلہ ہے دانش کدہ ادبیات میں انہیں استاد بننے کے لئے کہا گیا تھا لیکن انہوں نے اس قید تدریس کو قبول نہ کیا-

انکے مجموعہ کلام میں سے 1309 شمسی میں "روح پروانہ" کے نام سے ایک مثنوی شائع ہوئی- 1310ھ میں ان کا پہلا دیوان شائع ہوا- ملک الشعراء بہار' سعید نفیسی اور پژمان بختیاری نے دیباچے لکھے اور ان کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کیا- دوسری جنگ عظیم کے موقعہ پر ان کی ایک نظم "صدای خدا" کے نام سے چھپی- اس پر بہار نے مقدمہ لکھا اور کہا کہ "شہریار نہ تنہا افتخار ایران بلکہ افتخار عالم مشرق است-" 1330 میں ان کا مجموعہ کلام دو جلدوں میں شائع ہوا-اس کے علاوہ ترکی زبان میں "حیدر بابایہ سلام" کے عنوان سے بھی ان کی ایک نظم شائع ہو چکی ہے-

شہریار فارسی' عربی اور ترکی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے ہیں- وہ سہ تار خوب بجاتے ہیں اور خوب گاتے بھی ہیں اس لئے نغمہ موسیقی سے انہیں دلی لگاؤ ہے- ایران میں عصر حاضر کی مغنیہ خانم دلکش کی آواز انہیں مرغوب ہے- بہار جوانی میں مشہور مغنیہ پروانہ پر دل و جان سے فدا تھے- اس کی سوزناک آواز کے ساتھ انہیں گہرا عشق تھا- "روح پروانہ" اسی کی یاد میں مثنوی لکھی ہے- اس کے مطالب سے عیاں ہے کہ اس کو ایک بے جوڑ شوہر سے باندھ دیا گیا تھا اور آخر کرب و اضطراب کی زندگی میں اس نے جان دے دی اور ساتھ ہی شہریار کے خرمن زندگی پر بھی بجلی گرا دی اور سوز حرماں کے شعلوں سے ان کے دل کو جلا دیا- یہ مثنوی ان کی شاعری

کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس کو پڑھ کر ادباء اور شعراء شاعر نو کی روح سے آشنا اور اس کی قوت گویائی کے معترف ہوئے- سعید **نفیسی** نے لکھا- "از ہر سطر نالہ ای واز ہر کلمہ ای بانگ شکوہ آمیز د خروش درد انگیز برمیخاست" عشق کی ناکامی کا یہ صدمہ ہی تھا جس نے ان کو سوز بخشا- آج وہ ہمہ تن مجوب روح شوریدہ خاطر کے سوا اور کچھ نہیں رکھتے- شعران سرشت میں خمیر کیا ہوا ہے- مندرجہ ذیل نظم ان کی اپنی **شخصیت** کی آئینہ دار ہے-

این هنر دوست مردم شیدا
شہر یارا نمی شود پیدا
اہل دردی کہ حال من برسد
مرد باشد بدرد ما برسد
نگزارد کہ من حرام شوم
بیجهت سوزم و تمام شوم
بوریائی و شمع بالینی!
کاسہ و کوزہ ی سفالینی
کف نانی و کوزہ آبی
بیدی و چراغ مہتابی
سخنی نغز و نغمہ ای موزون
نہ ازین ساز ہای بی قانون
چون غزلہای شیخ داروی جان
چون غزلہای خواجہ جاویدان
سخنی برق دیدگان افروز
برق غیرت فروزو خرمن سوز
سخنی خفتگان بہوش آور
بہ تن مردہ خون بجوش آور
کار غیر ہنر نہ کار من است
ہر کسی مرد کار **خویشتن** است
چکنم شاعر آفرید ستم

کار دیگر نیاید از دستم

شہریار کے اپنے نقطہ نظر میں شعر کا سرمایہ وہ لطیف ارتعاش ہے جو بلا ارادہ انسان کے اعصاب پر نمودار ہوتا ہے- یہی ارتعاش یا تاثیر شعر میں ڈھل کر دوسروں کے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے وہ شعر ہی نہیں جس میں روح نہ ہو- یہ روح موہبت خداوندی ہے اور تصنع سے پیدا نہیں ہو سکتی- حقیقی شاعر اسی روح سے پہچانا جاتا ہے- روح کا بدن جملہ یا کلام ہے- تناسب اعضاء کلام کی عمدہ ترکیب و ترتیب ہے اور اس کی شکل یا ہیئت (غزل، قصیدہ، مثنوی) لباس ہے- صرف شکل و لباس کی تبدیلی سے انسانی روح یا سیرت تبدیل نہیں ہوتی- شعر کا اپنا ایک مسلک اور ہدف ہے جس پر عمل کرنے سے اخلاق و آداب میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے-

شہریار کی نظر میں شعر کامل کا نمونہ حافظ کا کلام ہے اسی لئے وہ سب سے زیادہ حافظ سے متاثر ہیں اور بہت سی غزلیات اس کے تتبع میں لکھی ہیں- جابجا اسی کی ترکیبیں اپنالی ہیں- اس نے خود لکھا ہے-

ہر چہ دارم ہمہ از دولت حافظ دارم

مندرجہ ذیل غزلیں اپنی اسی روح کی بدولت اپنے اندر گداز روح اور ارتعاش رکھتی ہیں اور جو جذبہ و احساس رکھنے والے ہر صاحب ذوق کو متاثر کرتی ہیں- اس لئے اکثر زبان زد خاص و عام ہیں:

نالم از دست تو ای نالہ کہ تاثیر نکردی
گرچہ اور کرد دل از سنگ تو تقصیر نکردی
جوانی شمع رہ کردم کہ جویم زندگانی را
بہ ختم زندگانی را و گم کردہ جوانی را
بروای ترک کہ ترک تو ستمگر کردم
حیف از آن عمر کہ در پای تومن سرکردم

امشب ایماہ بدرد دل من **تسکینی**
آخر ای ماہ تو ہمدرد من مسکینی

شہریار نے ابتدائے جوانی سے دکھ اٹھائے ہیں- ظلم سہے ہیں- حسرتوں کا خون پیا ہے- شرمندگیاں اٹھائی ہیں- نامرادیوں کا منہ دیکھا ہے- دوستوں کی بے وفائیاں ملاحظہ کی ہیں-

جنگلوں میں پناہ لی ہے۔ تنہائیوں میں بیٹھ کر روئے ہیں اور شعر لکھے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ واردات کے دقیق سے دقیق نکات بیان کئے ہیں۔ ان کی موجودہ شاعری میں ابھی تک پرانے رنج و قلق کی روح موجود ہے وہ اپنے نامساعد زمانے کے شکوہ سنج اور اپنے بخت کے گلہ گزار ہیں۔

تیرہ گون شد کوکب بخت ہمایوں فال من
واژ گون گشت از سپہر واژ گون اقبال من
بہ تیرہ بختی خود کس ندیدم و نشیندم
زبخت تیرہ خدایا چہ دیدم چہ کشیدم

نامرادی' یاسیت زندگی سے بیزاری اور جانسوز درد اس کے مندرجہ ذیل اشعار سے نمایاں ہے:

دست طمع کشیدہ ام از خوان زندگی
برچیدہ باد سفر احسان زندگی
بستم زو ہراز پس یکعم گریہ چشم
ہرگز ندیدہ صورت خندان زندگی

در انتظار دوزخ' دیگر چہ مسخرہ است
خود زندگی بس است بہ تاوان زندگی!

شہریار کے اشعار سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ناساز گاری زمانہ کے باوجود انہوں نے اپنی روحانی شکست نہیں مانی۔ وہ کسی کے پاس دست سوال دراز کرنے نہیں گئے اور نہ کسی کی خوشامد کی ہے اپنی سرکش طبیعت کو بلند رکھا ہے اور قناعت اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کیا ہے۔

از سرکشی طبع بلند ست شہریار
پای قناعتی کہ بدامن کشیدہ ام

اور یا:

شہریار از خاکساری پادشاہی یافتی
ای بلند اختر مبارک بادت این تاج و سریر

شہریار کا کلام محض ذاتی عشق اور وارفتگی کی داستان نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ان کا درد وسیع ہو

کر دوسروں کے درد میں بھی شریک ہو تا گیا۔ ہر ناہمواری' ہر ستم گری اور ہر بے راہ روی پر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے وہ انسان دوست ہیں۔ بنی نوع انسان کی بہبود کے لئے سوچتے ہیں۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا" صدائی خدا" ہے۔ جنگ عظیم ثانی کے متعلق اپنی مثنوی میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی انسان دوستی اور خلوص درد کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے لکھا:

آدمیان زندہ بیک دیگرند
دست و دل و دیدہ و پاوسرند
آدمی از نوع جدا زندہ نیست
برگ بشاخ است گرش زندگیست

انہوں نے عالمگیر برادری کی حمایت میں شروع جوانی میں لکھا تھا کہ اصل فتنہ و فساد کا منبع دین وطن ہے۔ انسان کو ان کے تعصبات سے بالا تر ہونا چاہئے۔

وطن کجاست فردھل فسانہ وطن من
یکیست کیش رہا کن حدیث مسلم و ترسا
جہان مراست وطن' مذہب من است حقیقت
چہ کافر و چہ مسلمان چہ آسیا چہ اروپا

انہیں اپنے وطن سے بھی محبت ہے۔ انہوں نے لکھا:

اے وطن مہر تو بیرون نرور از دل من
مگر آنروز کہ روح از بدن آید بیرون

لیکن وہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ بے نواؤں کا براحال ہے امیر اپنے حال میں مست ہیں عدالتیں بے پروا ہیں۔ حق و صداقت کی قدر نہیں۔ اونچے طبقے والے غریبوں کو لوٹتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی باز پرس نہیں کرتا ان کو بڑا دکھ ہوتا ہے وہ غاصب کو تنبیہہ کرتے ہیں:

بہ عزت چوں بخشیدی بذلت می ستانیدت
چرا عاقل نیندیشد ہم از آغاز' پایان را

شہریار کی شاعری غزلیات کی شاعری ہے۔ وہ متقدمین میں سے سعدی و حافظ کے پیرو ہیں۔ ان انداز بالکل قدماء کا ہے۔ کلمات و تراکیب پرانے ہیں۔ تشابیہ واستعارات بھی مستعمل ہیں۔ علامات و اشارات وہی گل و بلبل' شمع و پروانہ' گل و نرگس' سرود و سنبل' ساقی ومیخانہ' شیریں و

فرہاد اور لیلیٰ مجنوں تک محدود ہیں لیکن شعری لطافتیں نئی ہیں۔ شعر میں روانی، گہرائی اور توانائی موجود ہے۔ مقبولیت کی اساس شاعر کا سوز ہے اور جذبہ و احساس کی شدت ہے جس سے پڑھنے اور سننے والوں کے دل متاثر ہوتے ہیں۔ وہ آذربائیجان میں بہت مقبول و مرغوب ہیں۔ لوگ سڑکوں، دکانوں یہاں تک کہ اپنے بچوں کے نام شہریار کے نام پر رکھتے ہیں اور اپنے شاعر ملی کی قدر کرتے ہیں۔

نادر نادر پور

نادر نادر پور 1308ش/ 1929ء میں پیدا ہوئے۔ دبیرستان تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کئی سال فرانس اور اٹلی میں رہے اور یورپی ادب سے آشنا ہوئے۔ 1331ش/ 1952ء میں واپس ہوئے۔ ان کے مندرجہ ذیل مجموعہ اشعار شائع ہو چکے ہیں۔

(1) چشمہا و دستہا، 1332 ش۔(2) دختر جام، 1334 ش
(3)شعر انگور، 1337 ش(4) سرمہ خورشید، 1348 ش
(5) از آسمان تا ریسمان، 2536 شہنشاہی
(6) شام باز پسین، 1356 ش (7) گیاہ و سنگ نہ آتش، 1356 ش

چشمہا و دستہا میں در در ہر شب، دیوانہ، یاد بودھا اور پردہ ناتمام میں ندرت آمیز اور دلچسپ مضامین ہیں۔ شاعر نے مناظر فطرت بیان کرنے کے لئے لطیف سے لطیف شبیہ استعمال کی ہے۔ برف و خون، تکہ رخت، ویرانہ قرون، یاد دوست، دیگر نماندہ ہیچ۔ دو در میں اس نے اپنے نفسیاتی تاثرات بڑے غمناک اور دردناک لہجے میں بیان کئے ہیں۔ فریدون تو للی کہتے ہیں کہ میں نادر نادر پور کو معاصر شعرا میں ارجمند ترین اور بزرگ ترین سمجھتا ہوں۔ کلام کے دروبست میں کم ہی شعرا اس کے برابر ہیں۔

نادر نادر پور 1331 ش کو فرانس سے لوٹے۔ ایک طرف وہ فرانسیسی شعراء سے متاثر تھے۔ دوسری طرف ایران کی رومان پرور فضا دیکھی۔ زن و زیبائی کے مناظر دیکھے تو اسی رنگ میں شعر کہنے لگے لیکن تھوڑی مدت بعد غم واندوہ، خوف و تاریکی اور سکوت و مرگ کی لپیٹ میں

آگئے۔

دیگر نمانده هیچ به جز وحشت وسکون
دیگر نمانده هیچ به جز آرزوی مرگ
خشم است و انتقام فرومانده در نگاه
جسم است و جان کوفته در جستجوی مرگ
تنها شدم که مرگ اگر همتی کند
شاید مرا رہائی ازین بندگی دهد (چشم ہا و دست ہا' ص 169-170)

نادر نادر پور کا دوسرا مجموعہ دختر جام ہے۔ جس میں 1332 سے 1333 کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ یہ بھی غم نامہ ہے۔ اس میں بھی وہ ناامیدی اور رنج و تعصب کا ذکر کرتا ہے۔ زندگی میں اس کے لئے نشاط نہیں وہ اپنے آپ کو گناہ مادر سمجھتا ہے۔

بر   چنگ   من   نماند   سرودی
کند   مرگ   و   غم   نشانه   ندارد

اس کا تیسرا مجموعہ شعر انگور 1336 ش میں شائع ہوا۔ اس میں بھی آرزوئی بھی مرگ کی جھلک نمایاں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہ زندگی سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہے۔ اکثر قطعات میں وہ زندگی سے لطف اٹھانے کی باتیں کرتا ہے اس کا کلام عورت سے کام روائی اور جنسی تلذذ سے لبریز ہے۔ عطش نگران جیسی نظمیں اس کی زندہ مثالیں ہیں چند ایسے قطعات ہیں جن میں معشوقہ سے محرومی اور حسرت کا اظہار کیا ہے مثلاً تشنگی' فریاد' بی جواب' چشم در راہ۔

ڈاکٹر خانڈی لکھتے ہیں۔ کہ شاعر اپنے شخصی احساسات اور جذبات کو بیان کرتا ہے تغزل کے علاوہ اس مجموعے کے اکثر قطعات کا موضوع مرگ ہے۔ لیکن مرگ ناامیدی کا نتیجہ نہیں اور خوف و ہیجان سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ پڑھنے والے کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرتی ہے۔ بلکہ یہ مرگ لطیف شیریں ہے اور زندگی سے وابستہ ہے اور شاعر کے ساتھ رہتی ہے اور ہر جمالی رنگ میں جلوہ انداز ہے اور اس کی "ہمزاد جاودانہ" ہے اس کے احساسات و جذبات میں جذب اور شور موجود ہے۔ ان کے بیان کرنے میں اس نے نئے اور اچھوتی تشبیہات اور نئے استعارات استعمال کئے ہیں۔ نادر نادر پور عصر جدید میں صف اول کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں شعر نو کے بہترین نمونے ہیں۔

1339 ش میں اس کا چوتھا مجموعہ "سرمہ خورشید" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں

شاعر کے افکار میں تحول آگیا ہے۔ اس کے کلام میں اب نہ غم واندوہ و آرزوئے مرگ ہے اور نہ عورت سے جنسی تلذذ یا عشق و شہوت سے محرومی کا ذکر ہے۔ اس میں انسانی زندگی سے رابطہ ہے۔ جدید نسل کے خوف و ہراس' سرکشی و انتقام کا بیان ہے۔ شاعر خود کو نئی نسل کا نمائندہ کہتا ہے نسل وہ جو شکست خوردہ ہے۔ جس کی سب تدبیریں مات پڑ گئی ہیں۔ حوادث نے اسے اکھاڑ پھینکا ہے۔ اور وہ جسمانی و روحانی خرابیوں کی اصلاح چاہتی ہے۔ لیکن خود اس میں گرفتار ہے۔

نادر نادر پور اپنے تین مجموعوں یعنی گیاہ و سنگ نہ آتش' از آسمان تاریسمان اور شام باز پسین کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ میری سولہ سالہ شاعری کا حاصل ہے۔ میں نے ان میں آج کل کی زندہ زبان استعمال کی ہے۔ صرف و نحو کے قواعد اور قدما کے تجربوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تعقید و ابہام پر روانی اور صراحت کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے۔ میں ابتدائی کلام میں تصویر سازی سے زیادہ کام لیتا تھا۔ کیونکہ اس وقت طبیعت میں جوش تھا۔ اب کے جو تصاویر میں نے پیش کی ہیں۔ وہ معانی کے لحاظ سے چند ابعاد کی حامل ہیں۔ میں اکثر عروض نیمائی پر کاربند ہوتا ہوں۔ میں نے نیما سے براہ راست اثر قبول نہیں کیا۔ میں اس کی تجاویز پر عمل کرتا ہوں لیکن اس کے شیوہ بیان کی تقلید نہیں کرتا میں نے شعر بے وزن کی حمایت نہیں کی۔ نابرابر مصرعوں میں وزن سے ہم آہنگی اور قوافی کی ہم صدائی روز مرہ محاورہ اور نثر سے قریب لے آتی ہے۔ اس لئے میں پرانے اصناف سخن کی پابندی نہیں کرتا۔

مہدی اخوان ثالث نادر نادر پور کے بارے میں لکھتے ہیں۔ نادر پور موجود زمانے میں درجہ اول کے نوپرداز شاعر شمار ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے قدیم ثروتمند سرمایہ شعر پر تسلط رکھتے ہیں لیکن یہ کلام ان پر اس قدر اثر انداز نہیں کہ ان کا احساس اپنا نہ ہو اور تعبیر و بیان اپنا نہ ہو۔ دختر جام کے تمام قطعات فصیح و دلنشین ہیں۔ ہمزاد' آفرین فریب' بیگانہ نامہ بہترین نظمیں ہیں۔ امیر فیروز کوہی نے کہا ہے۔ نادر پور شاعر حساس و ادراک خیال ہے۔ پژمان بختیاری کہتے ہیں کہ "شعر او لطیف و متین است"۔

حسین منزوی نے کلام کے تجزیہ کے بعد لکھا ہے کہ "نادر نادر پور خیلی باحرارت شعر می گوید۔ از نظر کمیت خیلی پرکار است۔ از نظر کیفیت ہم برحال شاعر جستجوگری است نادر نادر پور کلمات را باوقت تمام استخدام کند و رعایت تناسب کلمات با ایجاد اوتباط بین کلمات را کہ از لوازم شاعری است' رعایت کند۔"

"از نظر پرباری و پرکاری از ارزندہ ترین و خلاق ترین شاعران ماست"

نادر پور کا کلام مثنوی مضامین کے ساتھ پختہ افکار کا حامل ہے- نیما یو شیج کی روش میں لکھنے والوں میں سے وہ سر بر آوردہ شمار ہوتے ہیں- وہ اکثر فکر و فن کے لحاظ سے نیما سے بھی آگے ہیں- چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے- قدیم و معاصر ایران و جہان کے اسالیب شعر کا مطالعہ کیا ہے- اس لئے شعر پر ناقدانہ نظر رکھتے ہیں- شعر امروز کے متعلق شعر انگور' کے دیباچے میں جن ناقدانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہیں ان کا خلاصہ' جدید شاعری کے ضمن میں نقل کر دیا گیا ہے:

اپنے شعر کے متعلق ایک جگہ اپنا نقطہ نظریوں بیان کیا ہے:

شماہم ای خریداران شعر من
اگر در دانہ ھای نازک **لفظم**
و یاد در خوشہ ہای روشن شعرم
شراب و شہدمی **ببینید** غیراز اشک و خونم نیست

ہوس اور جنسی تلذذ سے متعلق اشعار کا ایک نمونہ یہ ہے:

می گزیدم باہ دو دندان گونہ اش
سرفرو بردم بہ جام سینہ اش
یک نفس بوئید مش نوشیہ مش
سائیہ خود را بر او انداختم
از نگاہ آسمان پوشیدہ مش

اس کے وصفی اشعار کی ایک جھلک دیکھئے- جن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اشعار ذیل میں موجود ہیں-

آفتاب اندام مارا می کمید (شعر انگور 5)
کوچہ ھا پر بود از عطر بہار
گرد **شینم** در ہوا پاشیدہ بود (شعر انگور 66)
وقتی کہ نسیم شود دریا ھا
کف ھای سفید آب را بوئید (شعر انگور 86)

نادر نادر پور فلسفہ **لایعنیت** سے متاثر نظر آتے ہیں جیسا کہ ذیل کے قطعہ سے ظاہر ہے:

زمین و من دو غضبناکیم

لب از خروش فروبستہ
زگیرودار عبث رنجور
زپیچ و تاب عبث خستہ

فریدون تو للی

فریدون شیراز میں 1298ش/ 1919ء میں جلال تو للی کے ہاں پیدا ہوئے- ان کی والدہ بھی خاصی لکھی پڑھی تھیں اور شعر کہتی تھیں- فریدون نے مدرسہ نمازی اور بعد میں مدرسہ شاہ پور میں تعلیم حاصل کی- سکول کی زندگی میں ہی غزلیں لکھتے تھے- بچپن سے ہی باغی روح اور پرجوش دل پایا تھا- اپنی حساس **طبیعت** کی وجہ سے ناگوار و ناہنجار بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے- اس لئے سکول میں ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور باہر نکال دیئے جاتے- شیراز میں کوئی سکول نہیں تھا جہاں سے انہیں باہر نہ نکالا گیا ہو- آخر انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دبیرستان یعنی انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کیا- پھر تہران گئے اور دانش کدہ ادبیات میں **باستانشناسی** کے مضمون میں ڈگری حاصل کی- اور محکمہ ایران باستان میں ملازم ہو گئے- اور شوش' مشہد اور مرغاب میں آثار قدیمہ کی کھدائی اور تحقیقات میں مصروف رہے- روز پنج شنبہ نہم خرداد 1364 ش/ 1986ء میں فوت ہوئے-

نثر و نظم میں فریدون کی تخلیقات و تالیفات و مقالات کی تفصیل حسب ذیل ہے-

مقالہ ھا و کتابھای تو للی

الف: آثار منثور

1- تو للی فریدون- التفاصیل- شیراز- چاپ خانہ شیراز- تیر ماہ 1322' 230ص' جیبی' سربی' چاپ اول یا مقدمہ ہای از **نویسندہ** و جعفر ابطحی' ملک الشعرای بہار' جعفر پیشہ وری و بانظراتی از روز نامہ رہبر' ش 222 س 2 وقضاوت روزنامہ ایران ما' ش 205' کتاب شامل 76 قطعہ است (. سبک مقامات) و بہ (رسول پرویزی) تقدیم شدہ است-

2- تو للی فریدون- التفاصیل، تہران، ناشر... خرداد 1331، 315 ص، جیبی، سربی، چاپ دوم، نقاشی ہا از محمد تجویدی، بامقدمہ ہای از نو ۔سندہ والف (جعفرا۔ طحی) ملک العشرای بہار و قضاوت روزنامہ ایران ما-

3- تو للی فریدون- التفاصیل، تہران، چاپ خانہ زیبا، 1328، 367 ص رقعی، 65 قطعہ، بانقاشی ہائی از، محمد تجویدی وباخط- عباس اخوین- انتشارات کانون تربیت شیراز- بامقدمہ ناشر (علی دارائن) وتو ضیحاتی ازنو ۔سندہ درمورد ہر مقالہ- چاپ سوم-

4- تو للی، فریدون- معجزہ یاسفرنامہ سیاہان یا وصف الحال اقتراحیہ، نجامہ توانای علامہ تحریر استاد ابوالقرطاس زوزنبہ (تو للی فریدون) تہران- کتابخانہ علمی، 1326، چاپ آفتاب، 62ص۔

5- تو للی فریدون- رسالہ غعینہ یا مشت و مال سید، شیراز، از انتشارات روزنامہ سروش، درجواب رسالہ (شعائر ملی) سید ضیاء الدین طباطبائی، چاپ مصطفوی، جیبی 28ص۔

6- تو للی فریدون- کاروان درشیوہ التفاصیل- تہران، فروز دین 1331، 233ص جیبی، سربی، ازانتشارات کتابفروشی ابن سینا، چاپ اول-

7- تو للی فریدون- کاروان یادوری از بردگان سرخ، ناشر..... تاریخ چاپ..... 223ص، جیبی، سربی، چاپ دوم-

ب: آثار منظوم-

1- تو للی فریدون- (رہا) مجموعہ شعر، شیراز، آذر 1329، مقدمہ ای از شاعر در، شناخت شعر نو 25 ش قطعہ، چاپ اول، 204ص، جیبی، سربی، چاپ مصطفوی، مصور بانقا شیہای از عزیز دانا-

2- تو للی، فریدون- (رہا) مجموعہ شعر، تہران، 1333 پیروز با مقدمہ ای در شناخت شعر نو، 25 قطعہ، چاپ دوم، 221ص، جیبی، سربی، نقا شیہا از محمد تجویدی ناشر امیرکبیر تہران-

3- تو للی فریدون- (رہا) مجموعہ شعر، تہران، 1346، چاپ خانہ زیبا، بامقدمہ شاعر در شناخت شعر نو و مقدمہ ناشر و(علی داداکین) مدیر انتشارات کانون تربیت شیراز، 233ص، رقعی، بانقا شیہای محمد تجویدی، بہ خط عباس اخوین-

4- تو للی فریدون- (نافہ) (مجموعہ شعر) تہران- بہمن 1341، چاپ زندگی بادیباچہ ای از شاعر در شناخت شعر نو- 350ص، جیبی، سربی، دستور چاپ و طرح از، اکبر معاونی- چاپ اول-

5- تو للی فریدون _ پویہ (پنجاہ غزل و قصیدہ) تہران، 1345، چاپ خانہ زیبا، 179ص، رقعی، ہای محمد تجویدی، بہ خط عباس اخوین- ازانتشارات کانون تربیت شیراز- چاپ اول-

6- تو للی، فریدون- شگرف (مجموعہ اشعار) تہران 1353، چاپ خانہ زیبا، بامقدمہ ای در شناخت شعر نو 227ص، سربی، وزیری، انتشارات جاویدان-

ج: شرح واحوال-

1- امداد، حسن، (شیراز درگذشتہ وحال) شیراز 1339، 619ص، سربی رقعی چاپ موسوی، مصور شرح حال وانتخاب پنج شعر ازتو للی ص 451_453

2- برقعی، سید محمد باقر، سخنوران نامی معاصر، تہران، سربی، رقعی- مختصر معرفی و انتخاب چند شعر ص 53-49

3- بہروزی، علی نقی، (شیراز یا خال رخ ہفت کشور) شیراز 1334، سربی، وزیری، مختصری در شرح حال، 175-176_

4- خلخالی، سید عبدالحمید، تذکرہ شعرای معاصر ایران- تہران، 1331، سربی، رقعی، 452ص، شرح حال و انتخاب 6 قطعہ شعر ص 96-108_

5- رکن زادہ آدمیت، محمد حسین- (دانشمندان و سخن سرایان فارس) تہران 1340-1337، سربی، وزیری، چاپ اسلامیہ و خیام 4 جلد (شرح حال و انتخاب چند شعر) ج 2، ص 55، 73 اورج 3_ ص 947_

6- رستاخیز جوانان، تجدید دیدار (زندگی نامہ) 17 آذر 1353 ش 120_

7- کامران، مرتضٰی، شاعران برگزیدہ معاصر (استاد فریدون تو للی) گوہر، س اش 9، مہر 1352_

د: مقالات باستا شناسی:

1- تو للی، فریدون، (ویرانہ ھای باستانی شوش) پیام نو، فروزدین 1326 ش 2 ص 63 - 72_

2- تو للی، فریدون، (سخنی چند پیرامون آثار تاریخی پاساگاد) روزنامہ استخر بہمن ماہ 1328 ش 1303_

3- تو للی، فریدون: (مقایسہ پاسار گاد وشوش)- پاسارگار یا قدیم ترین پائے تخت شاہنشاہی ایران، علی سامی، شیراز 1330، چاپ مصطفوی 120 ص رقعی ص، 107-108

4- تو للی، فریدون (شہرستان باستانی فساد کاوشہای کہ ادارۂ کل باستا شناسی درحوالی آن انجام دادہ است) باستا شناسی، بہار و تابستان 1338 ش 201 ص 48-61

5- تو للی، فریدون (کاوشہای علمی فساد آثار باستانی آن حوزہ) وحید، مہر 1352 ص 716-719_ آبان 1352، ص 729-756

6- تو للی، فریدون (کاوشہای علمی فساد آثار باستانی آن حوزہ) مجموعہ مقالات چہارمین کنگرہ تحقیقات

ایرانی درزمینہ ادب و فرہنگ ایران- شیراز' ج 2 ص 52- 66

ھ: مقالات ادبی:-

1- آشفتگی کار شعردرین روزگار: تلاش' ش 7_ ص 17- 21

2- شعر زمان ناپذیر: راہنمای کتاب' ش 12' 1348 ص 2- 19

و: فرہنگ مردم:-

1- تو لی' فریدون- واسونک جھری پیام نو' اردی بہشت 1325' ش 6

2- تو لی' فریدون- واسونک شیرازی' پیام نو' مہر1325' ش 1 ص 3

3- تو لی فریدون- واسونک شیرازی' پیام نو' ج 2' ش 6' ص 19

4- تو لی فریدون- واسوک مثلہای شوش' پیام نو' ج 3' ش 12' ص 31- 51

5- تو لی فریدون- مثلہای شوش' سخن' ش 3_ ص 595- 596

6- تو لی فریدون- سرگذشت بلنجی (داستان ازشوش) نامہ ماہنامہ مردم' ج 1' ش 8 ص 49- 50

7- تو لی فریدون- سرگذشت دیوو کودک (از شوش) نامہ ماہنامہ مردم ج 1 ش 9 ص48- 51

8- تو لی فریدون- دو بیتی ھای شیرازی نامہ ماہنامہ ج' 1 ش 5- ص 24

9- تو لی فریدون- مثلہائی شوش' نامہ ماہنامہ مردم ج 1 ش 8 ص 68 و ج 3 ص 12

10- تو لی فریدون- شاہ عباس و دختر داشوش' نامہ ماہنامہ مردم' ج 1 ش 6

ز: مقدمہ و نقد بر کتابہا:-

1- نادر پور' نادر' (چشم ہا و دست ہا) مجموعہ شعرنقد از فریدون تو لی' شیراز' آبان ش 4 دورہ پنجم- اردی بہشت 1333

2- یو شیج' نیما' نظرتو لی دربارہ نیما' مجلّہ کاویان ش 36 ص 1336

3- تو لی' مہین' سنجان مروارید' مجموعہ داستان بامقدمہ (فریدون تو لی) شیراز' آبان 1338' چاپ موسوی' رقعی' 169 ص

4- رھکو' بہار' دربزم گلہا مجموعہ داستان بامقدمہ (فریدون تو لی) تہران' ابن سینا مہر' 1340' رقعی' 99 ص

5- بہبود' محمد تقی' مقراض (شعر) باتقریظ فریدون تو لی' شیراز 1343' سربی جیبی' 96 ص

ح: ترجمہ:-

1- قرض سزار' ترجمہ از منابع فرانسہ- سروش' ش 1' س 1- 1322

2- شیطان لنگ رومان' تالیف او ساز- سروش ش 1' ص 1 و شمارہ ہای دیگر-

3- حاج میرزا آغاسی مظہر سفاہت' از سفر نامہ کست دوسری سفیر فرانسہ سروش 28 ص 1

4- محمد شاہ: از سفرنامہ کست دوسری سفیر فرانسہ' سروش' ش 31 س 1

5- سپاہ ایران: از سفرنامہ کست دوسری سفیر فرانسہ' سروش' ش 33 س 1

6- بدرود: شعر اثر پل ورلن' سومین نشریہ از انتشارات کانون دانس پارص 1333' سربی' وزیری' چاپ خانہ موسوی-

7- کیفر اثر: پل فور' وارژہ' ش 3 خرداد 1338' ص 204

8- گفت و شنود اثر پل ورلن (ترجمہ .شعر) بہار ایران ش ... س

9- غوک اقتباس از لافونتن' بہار ایران' ش .... س

ط: نقد آثار:

1- آیتی عبدالحمید' نافہ تو لی' رہنمای کتاب' س 6' 1343 ص 892

2- براہنی' رضا' نمازمیت برجسد روما نتیزم (نگرشی بر شعر تو لی) فردوسی ش 824-828 ص 1346_ طلا در مس ص 277- 317' تہران' س 1358' چاپ سوم

3- دست غیب: عبدالعلی شعر جدید فارسی پس از نیمایو شیج' نگین' ش 26 ش 1346-

4- دست غیب' عبدالعلی نقد بر رہا و نافہ و پویہ' نگین' ج 2- ش 5- ص 32- 35

5- دست غیب' عبدالعلی نقد چند اثر ادبی التفاصیل و....

6- متین' غلام حسین' فریدون تو لی' پیام نوین' ج 2- ش 11- 12 ص 1- 7

7- محمد دوران تو لی سپری شدہ است؟ نگین' ش 18 آبان 1345' ص 27

ی: داستانہای کوتاہ و مقامات سیاسی و اجتماعی

1- تو لی' فریدون- مار صاحبا خانہ سروش' ش 1' س 1' 1322

2- تو لی فریدون' فرائڈ الادب اسشراق بہ قلم صاحب التفاصل سروش' ش 7' س 1

3- تو لی' فریدون- سوغات خالو' سروش' ش 27' س 1

4- تو لی' فریدون- دختر مشتی نوروزم' این شبنم انیم روزم' سروش' ش 31 س 1

5- تو لی' فریدون- فرائد الادب فی مزاوجہ صاحب التفاصیل' بقلم صاحب' التفاصل سروش' ش 12 ص 1_

6- تو لی فریدون- انگور فروش (تصنیف) سروش' ش 103' س 2_

7- تو للی، فریدون- ذرت فروش (تصنیف) سروش، ش 106، س 2
8- تو للی، فریدون- جائیکه آدمهاسواری می دهند، سروش، ش 122، ص 2
9- تو للی، فریدون- سهراب (به صادق هدایت تقدیم شده) سروش، س 147، ص 2
10- تو للی، فریدون- سر قوام سلامت سروش، ش 194، س 3
11- تو للی، فریدون- آزادی خواه محرمانه سروش، ش 212، ص 3
12- تو للی، فریدون- آقای باز پرس سروش، ش 259، ص 4
13- تو للی، فریدون- در منزل کدخدا سروش، ش 267، ص 4
14- تو للی، فریدون- نامدار سروش، ش 269، ص 4
15- تو للی، فریدون- خر طلب کار اقیانوس (صاحب امتیاز تراب بصیری- مدیر داخلی مهدی حمیدی 1322) ش- 1 ص 1
16- تو للی، فریدون- زمامدار، اقیانوس، ش 2_ ص 1
17- تو للی، فریدون- انتخابات، اقیانوس، ش 13، ص 1
18- تو للی، فریدون- بارونی اقیانوس، ش 22، ص 1
19- تو للی، فریدون- ناقص الحلقه پاگرفت اقیانوس، ش 25، ص 1
20- تو للی، فریدون- آل اقیانوس، ش 31، ص 2
21- تو للی، فریدون- تنبل خانه اقیانوس، ش 31، ص 2
22- تو للی، فریدون- ابن قسمش بامن اقیانوس، ش 33، ص 4
23- تو للی، فریدون- سگ هائی غریبی داریم (یاد داشت سفر) اقیانوس، ش، 41، ص 2
24- تو للی، فریدون- آنچه روزنامه نویس ها از نوشتن آن خجالت می کشند اقیانوس، ش 42، س 2
25- تو للی، فریدون- سرمایه دار اقیانوس، ش 44، ص 2
26- تو للی، فریدون- عنکبوت (فرائد الادب) اقیانوس، ش 48، ص 2
27- تو للی، فریدون- بره فرهاد (بازی جدید برای بچه ها) اقیانوس، ش 49، ص 2
28- تو للی، فریدون- دو حیاتین، ایران ما، ش 197، ص 1323 -
29- تو للی، فریدون- شیخ نور الله، ایران ما، ش 271، ص 23
30- تو للی، فریدون- باا گردان نبرد بجای ایران ما، ش 67، ص 24
31- تو للی، فریدون قفقازی ارس بجای ایران ما، ش 134، ص 24

32- تو للی، فریدون- آکل جواد شهباز بجای ایران ما، ش 10، ص 24
33- تو للی، فریدون- شهران بقلم صاحب التفاصیل شهباز بجای ایران ما، ش 16، ص 24
34- تو للی، فریدون- سردار ماشاء الله خان شهباز بجای ایران ما، ش 48، 24
35- تو للی، فریدون- حکومت نظامی شاه عباس شهباز بجای ایران ما، ش 52، ص 24
36- تو للی، فریدون- وافور (لطائف التحف) خورشید ایران، ش 90، س 23
37- تو للی، فریدون- وطن فروشی (لطائف التحف) خورشید ایران، ش 79، س 23
38- تو للی، فریدون- خواجه (لطائف التحف) خورشید ایران، ش 91، ص 23
39- تو للی، فریدون- چرخ الماس (لطائف التحف) خورشید ایران، ش 92، ص 23
40- تو للی، فریدون- گاو صندوق (لطائف التحف) خورشید ایران ش 95، ص 23
41- تو للی، فریدون- هم شهریان گرامی توجه فرمائید صدای شیراز، ش 44، ص 31

ک: ذکر تو للی در کتابها و مجلات:-

1- آزند، یعقوب، ادبیات نوین ایران از انقلاب مشروطیت تا انقلاب اسلامی ج 1- 1363- ص 80، 95، 144، 151، 160، 172، 173، 174، 215، 314، 355، 357
2- استعلامی، محمد ادبیات دوره بیداری و معاصر ص 375، 377
3- پرهام، مهدی ره آوردی از شیراز نگین ش 73، ص 1350
4- تورسون زاده، میرزا باهم کاری (رحیم هاشم، شوکت نیازی) مسکو 1968 بنگاه نشریات پروگرس- جیبی ص 283
5- حمیدی، مهدی- دریائی گوهر ج 1 ص 196- 209
6- حمیدی، مهدی- دریای گوهر ج 4953- 503
7- حقوق، محمد- شعر نو از آغا تا امروز ص 101- 107
8- حقوقی، محمد- محاوره ادبی (حقوقی_ تو للی) نگین ش 94 ص 52، ص 15، 16، 17، 18
9- خامه ای، انور فرصت بزرگ از دست رفته- ج 2- انتشارات هفته 1362، ص 122، 161، 398، 399، 410، 411، 412، 413
10- خامه ای، انور از انشعاب تاکود تاج 3، انتشارات هفته 1363 ص 68، 75، 78، 79، 80
11- خانفی، پرویز- ارمغانی از شیراز (سخنی درباره شعر تو للی) روشن فکر، ش 632 ص 44
12- خانفی، پرویز- سخنی درباره پویه صبح امروز ش 325 ص؟

13- خانعی، پرویز- فریدون تو لّلی مردی چابک و جسور با چشم ہائی برنگ خاص و تقدیم غزل (عقاب قلہ تنہائی) بہ او- اطلاعات، پنج شنبہ 18_ آذر- ص؟
14- دست غیب، عبدالعلی، سایہ روشن شعر نو فارسی ج 1 ص 85، 86، 87، 97، 112، 113، 123، 184_
15- روشن فکر، نامہ و دو شعر از تو لّلی 20 آبان 1344 ش 632
16- روشن فکر، نامہ تو لّلی بہ منوچہر نیستانی- پنج شنبہ 17 دیما- 1343 ش 588
17- رستاخیز جوانان- نامہ تو لّلی بہ منوچہر نیستانی 13 آبانماہ- 1356_ ش 70
18- زرین کوب، عبدالحسین- شعربی دروغ، شعربی نقاب ج 1 ص 272، 276، 279
19- زرین کوب، حمید- چشم انداز شعر نو فارسی- تو لّلی پرچم دار شعر نو تغزلی ص 87- 99
20- شفیعی کدکنی، محمد رضا- ادوار شعر فارسی از مشروطیت تاسقوط سلطنت، تہران 1359، توس، ص 59، 62، 64، 71، 73، 94، 116
21- کاظمیہ، اسلام من و فریدون- فردوسی، تیر 1346، ش 820 ص 14، 15، 16
22- ضرابی، علی اصغر- گفتگو با نادر نادر پور شاعر معاصر در بارہ خانلری و تو لّلی- فردوسی ش 818 ص 1346
23- ملکی، خلیل- خاطرات سیاسی ملکی ج 1- 1360_ رواق، ص 56، 57، 99، 462، 494
24- مصطفوی، سید محمد تقی، اقلیم پارس تہران 1343_ انتشارات انجمن آثار ملی ص 89، 364، 365، 366، 371، 375، 382، 439، 444، 447
25- مزارعی، زہرا نخن عشق و شعار شوریدگان شیراز، کانون تربیت ص 159، 491، 565-
26- مدرس صادقی، محمد شیراز امروز، شیراز 1331_ چاپ مہرگان- ص 102، 104، (نامہ و دو شعر)
27- یوشیج، نیما، نامہ ہای یوشیج، تہران- 1363_ (نامہ بہ تو لّلی) ص 107
ل: کتابہای سبک التفاصیل:-
1- معزی، علی اکبر التفاصیل:- شیراز- سربی، رقعی، ص، ...... ص ......
2- سہیلی، مہدی الاراجیف- اصفہان- تا ـیلد ص 1340، سربی، جیبی 199 ص-

فریدون فرانسیسی زبان سے آشنا تھے- انہوں نے بلند پایہ مصنّفین کا مطالعہ کیا تھا- باستان شناسی میں تحقیقات کی تھی- ان عناصر نے ان کے فکر و فن کو متاثر کیا- ان کی اکثر منظومات خارجی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں-

شعر جدید کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے- تو لّلی نے لکھا-

نیما کے "افسانہ" نے مجھے خاصا متاثر کیا- میں پہلے کلاسیکی روایت میں لکھتا تھا- میں نے محسوس کیا کہ شعر کی جہت و رفتار وہی درست ہے جو نیما نے متعین کی ہے- اس لئے میں نے اس تاریخ سے اس کا تتبع کیا-

نیما سے ملاقات کے بعد 1319 ش ر 1940ء میں "پشیمانی" کے عنوان سے نئے اسلوب میں نظم لکھی- 1329 ش ر 1950ء میں رہا شائع ہوئی- دیباچے میں اس نے ادبیات قدیم کی مقلدانہ روش کی مخالفت کی-

شعر نو کے متعلق اس نے کہا کہ شعر میں وزن ہونا چاہئے- لیکن حالات سے ہم آہنگ ہو- مضامین تازہ ہوں- تشبیہات و استعارات بھی نئے ہوں- صنائع بدائع کے استعمال سے پرہیز کیا جائے- دشوار قوافی و ردیف سے اجتناب ضروری ہے- شاعر اپنے مشاہدات کو بہترین الفاظ میں پیش کرے- سکتہ شعری سے بچے-

1341 ش ر 1962ء میں اس نے نافہ سے شائع کیا- اس نے اس مجموعے میں نیما سے مختلف راہ اختیار کی اور نیما پر اعتراض کیا اور مقدمہ میں لکھا- میں نے نیما کے افسانہ سے اثر قبول کیا تھا- لیکن نیما نے افسانہ کے بعد چھوٹے بڑے مصرعے لا کر کلام کو مبہم بنا دیا اور گورکھ دھندا بنا کر تحول شعر کو ختم کردیا- اس کے مصرعوں کو کسی قانون و آئین کے تحت نہیں سمجھا جا سکتا- اس نے بحور زحافات کے قدرتی اسلوب کو اس طرح توڑا ہے کہ وہ طبع سلیم کو گوارا نہیں- تو لّلی کے نیما کے اپنا رشتہ توڑ لیا اور اپنا تعلق اس گروہ سے جوڑا جس کو وہ نوپردازان راستین کہتا ہے- اس کا عقیدہ ہے کہ نئے لکھنے والے بے وزن اشعار سے پرہیز کریں بے ضرورت قافیہ کو خیرباد نہ کہیں- جب تک قافیہ و ردیف مفہوم و مضمون بیان کرنے میں خلل انداز نہ ہوں، آہنگ کے لئے ضروری سمجھیں- فارسی زبان کے قواعد کی پابندی لازم خیال کریں- ایسے اشعار سے جو خارجی نمونوں کے ترجمے معلوم ہوں اجتناب کریں-

چشم انداز شعر نو فارسی، دکتر حمید زریں کوب- تہران، 1358 ش

التفاصیل اور کاروان فریدون کے دو ایسے اشعار کے مجموعے ہیں- جن میں ہر نظم کے ساتھ توضیحی نوٹ بھی لکھے گئے- کتابی صورت میں آنے سے پہلے یہ منظومات شیراز کے روزنامہ فروزدین اور سروش میں شائع ہوتے رہے-

یہ قطعات و قصاید ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی پر تبصرے ہیں یا تاثرات و مشاہدات ہیں- شاعر

نے ان اشعار کے لکھنے کا مدعا و مقصود خود بیان کیا ہے۔

1- ارباب حکومت اور خدمت گزاران استعمار کے خلاف جدوجہد۔

2- محنت کرنے والوں کو بیدار کرنا۔ انہیں اپنی طاقت کا احساس دلانا۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے انہیں ابھارنا۔ ظلم و فساد کے خلاف بغاوت کرنا۔

3- سید خائن (ضیاء الدین) اور اس کی اضراب وطن (ادارہ ملی) کے خلاف جدوجہد

4- عوام فریب ریاکار ملاؤں کے خلاف جدوجہد۔

5- ناقص **الفکر** تذکرہ نویسوں اور چاپلوس شعراء کے خلاف صدائے احتجاج۔ تعلیم کے ناقص پروگرموں اور تاریخ و ادبیات پر تنقید۔

6- فقیری قلندری گداگری اور مفت خوری کے خلاف جدوجہد۔

تو للی نے ان قطعات شعری میں ہجوو مزاح سے کام لیا ہے اور بعض جگہ بھرپور طنز کیا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل ناموں سے سر آوردہ اشخاص کی مذمت و تضحیک مقصود ہے۔

ابوالنجم نفت سوز طبری۔ ابوالبلاد جعفر سیاست شگاف بجستانی۔ شیخ منافق الدین، خواجہ فضول الدین کلکلاتی۔ سفیہ الدین گزا فکوئی۔

ملک الشعراء بہار نے ان منظومات کو پڑھ کر (1324 ش ر 1946) میں لکھا۔

از لطائف و ادبیات آقای توالی لذائذ و افری برم۔ از ذوقیات اومی توانم او را ندیدہ صف کنم در نظم و نثر ماہراست۔ امیدواری بسیاری در آیندہ باومی توان گذاشت۔

اپنے اہل وطن کے دل و دماغ پو تو للی کی ضربات دیکھنے کے لئے التفاصیل میں ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

چون زن دیگر ان بہ چنگ آری / دختر خود نیاز ایشان کن
غیرت از جملہ خرافات است / این بنائی نحیف ویران کن
رفقا کار مملکت زار است / ہر کہ دزدی نکرد بیمار است
کار عقبی ای پسر اولی تراست / ہر کہ در فکر وطن باشد خراست
خرمشو، بنگی بکش، وردی نجوان / تا بہ بینی مسروحدت راعیان
تو ذردی میکن وور کیسہ انداز / کہ دزدان راست دراین رہ سرودی
اگر دزدی نباشد در ادارات / در استخدام دولت نیست سودی
در گدائی حشمت سلطانی است / بر گدایان رافت ربانی است

جنبشی تا شیخ و میرو شحنہ و دزد و عس را / در دل اندازیم از بیم ہلاکت اضطرابی
ورنہ خائین تا بروز حشر دست از ماندارد / گرنہ بیند انتقامی، کیفرمی، زجری عقابی

کا دوا ن میں حکام کے خلاف تیز و تند تنقید و مخالفت و مبارزت ہے۔ تو للی نے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے اور صنعت نفت کو قومیانے کے لئے تند و تیز نظمیں لکھیں۔ فروغ الملک رئیس شہربانی کے اشارے سے 1320 ش میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ لیکن وہ بچ گئے۔ فروغ الملک کو فارس سے بلا لیا گیا۔ اور انگریزوں کی **کونسلیٹ** بھی وہاں سے ہٹالی گئی۔ فریدون نے انگریزوں کے متعلق لکھا۔

یار اشراری و سرخیل پلیدان دیاری۔ خصم احراری و سرسلسلہ، دزدان و غار ہمہ کار انگلیسی، طمع است و کاسہ لیسی۔ من و حرف حق نویسی، نمود صد عتاب مستر ای فرنگان چہ بی شرم و حیائید ہمہ۔ پای تا سر ستم و کین و جفائید ہمہ۔

نفت کے متعلق لکھا۔ تف است این نہ عصمت ہر دزدبی عقاف تارایکان بہر کس و ناکس سپاریش۔

اپنے متعلق کہا ہے:

دل من خانہ عشقست درین خانہ عشق۔ نیست خالی زہوا خواہی میہن جای۔ "رہا" اس مجموعہ شعر میں 1324 سے 1329 ش کا کلام شامل کیا گیا ہے اور 25 منظومات پر مشتمل ہے۔ اس میں اکثر نظمیں پاسارگاد اور شوش میں لکھی گئیں۔ جہاں فریدوں آثار قدیمہ کی کھدائی کی نظامت پر مامور تھے۔ وہاں ان کو دنیا کی ناپائیداری، زندگی کی بے ثباتی اور تمناؤں کے لاحاصل ہونے پر غور فکر کا موقع ملا اور اس کی روح غمناک و اندوہ گین ہوئی۔ چنانچہ باستان شناسی، دوز اندوہ شامگاہ، آرزوی گمشدہ، ویرانہ، امید، پیشو از مرگ، ناپائیدار، دخمہ راز، کوی مردگان، درہ مرگ جیسے عنوانات سے غم و اندوہ و مرگ کے احساسات کا انعکاس ہوتا ہے۔ مثلاً

بی اعتنا بتربیت گلچہرگان خاک
براستخوان پیرو جوان می زند کلنگ
قادر رسوب چشمہ **خشکیدہ** حیات
بیابد نشان قطرہ وہمی بگور حیات

ص 410

درسنگلاخ تیرہ و تاریک زندگی

دراین درشت ناک بیابان پر ہراس
می آیدم ہمارہ زسوی نہان بگوش
آوای آشنای یکی یار ناشناس
آوای دلیربایر زنی چون طنین جام کز ژر فنای شام

شاعر ناپائیدار دنیا میں انسانوں کی آرزوؤں کی پامالی دیکھتا ہے تو افسردہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی روح بظاہر حسن و زیبائی کی حامل ہے۔ لیکن وہ پریشان ہے اور مرجانا چاہتی ہے۔

آنجا کنار قلعہ ویران و دور دست
افروختنست دختر شب گرد آتشی
او خود بخواب رفتہ و نالاں بگرد او

روح مشوشی

در داکہ تابہ مہر تو آویختم امید
در شام غماختر شادی دمید و حفت

وہ ناکامی عشق میں مرجانا چاہتی ہے۔

بامن بمیر، آنکہ بجز در پناہ' مرگ' جاوید' عشق ہیچ کس در زمانہ نیست۔

انسان غم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے قید حیات سے خلاصی چاہتا ہے۔ فریدون اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

من خواستگار مرگم و آوخ کہ دست مرگ
دام حیات این شدہ دامان آن گرفت

اس مجموعہ میں "پوپہ" کی طرح بعض ایسی نظمیں ہیں جن سے جنسی تلذذ کی بو آتی ہے شاعر جسمانی تماس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے۔

بش بوسہ گر ختم شبی درازو ہنوز
چہ نوشہا کہ بلب دارم ازلب و دہنش

"فرادی انقلاب" ایک ایسی نظم ہے جو اس مجموعے کے مجموعی تاثر سے ہٹ کر ہے۔ شاعر اس میں انقلاب برپا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

شے پور انقلاب پر جوش و پر خروش

از نقطہ ہای دہ
می آیدم بگوش
می گیردم قرار
می بخشدم امید
می آردم بہوش

فریدون نے ایک قصیدہ کے علاوہ باقی دوسری منظومات میں کلاسیکی انداز کو چھوڑ کر نیما کی تقلید میں نئی ہیات کو استعمال کیا۔ اکثر قطعات اشعار اور دو بیتیوں کی صورت میں ہیں۔ بعض نظموں میں مصرعوں کو چھوٹے بڑے بھی کیا ہے۔ لیکن وزن کو قائم رکھا ہے کہیں کہیں قوافی کا التزام ترک نہیں کیا۔ اس مجموعے میں فریدون نے روایتی تشابیہ و استعارات سے اجتناب کیا ہے اور نئی تراکیب بنائی ہیں جن سے ان کی دقت نظم کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً "آتش درد، نخل فسونکار، تصویر آرزو، ہوس مردہ چشم کہربائی"

"نافہ" میں 1332 سے 1339 ش تک کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعے میں بھی "رہا" کے مضامین کا غلبہ ہے۔ اس دنیا میں اسے بیزاری و بے مہری نظر آتی ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کس سے دل لگائے اور اپنا راز کسے کہے۔

ہمی بیزاری و بیزاری و بیزاری' ہمہ ناکامی و نادانی و رسوائی' ہمہ افسوس کنان از غم بی مہری' ہمہ اندوہ از تب تنہائی۔

وہ غم و اندوہ اور ناکامی و نامرادی کے خاتمے کے لئے موت کو مداوا سمجھتا ہے۔

مرگ استادہ کہ ھان این تو و این تابوت
ہودج کام تو بردوش کہ بربندم؟
چارتن باید و من بیکس و بی پیوند!
گویم اینک زن ناکام وسہ فرزندم

شاعر اس غم آلود زندگی سے گریز کے لئے جنسی تلذذ کی طرف جاتا ہے جام لب' پر بوسہ پیش آور دو مست' دست سوزان حلقہ زد بر گردنم۔

وہ اپنے جنسی گناہ کے لئے اپنی محبوب سے معذرت کرتا ہے اور اس گناہ کا زمہ دار اپنے فن کو ٹھہراتا ہے۔

تولی کے کلام میں ایک طرف درد' تلخی' مرگ' تنہائی اور ناکامی ہے اور دوسری طرف عشق و ہوت' گناہ ولذت جوئی۔

تو للی کو زبان پر تسلط حاصل ہے۔ الفاظ و تراکیب میں شعریت اور جاذبیت ہے اور اس لحاظ سے وہ معاصر شعرا میں نام آور ہے۔

"پویہ" یہ پچاس غزلیات و قصاید کا مجموعہ ہے جو 1345/ 1966ء میں شائع ہوا۔ فریدون "سپاس" کے عنوان سے لکھتا ہے کہ امیر اسد اللہ علم وزیر سابق اور موجودہ رئیس دانشگاہ پہلوی کی نوازش سے یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوا اور باستانشناسی کی جفاکشی سے نجات ملی اور چھ مہینے کی بیماری سے شفا پا کر طبیعت میں تازگی و شگفتگی آئی۔ اس مجموعہ کی تمام منظومات 1344 ش/ 1965ء میں لکھی گئیں۔ زمانہ تحریر 17/ 7/ 44 سے 6/ 10/ 44 تک ہے۔

فریدون اس مجموعے میں سراپا تغزل لئے ہوئے ہیں۔ حسن و زیبائی محبوب سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ طبیعت نشاط و غنا سے سرشار نظر آتی ہے۔ سعدی کے رنگ میں ڈوب کر لکھ رہے ہیں۔

سعدی است کہ گویا شدہ در شعر فریدون۔ برخوانم وبانغمہ جادوش . بمیرم من سعدی امروزم اگر چنگ فریدون۔ در بزم علم نغمہ گر طبع من افتد

اپنے شعر کے تعریف میں لکھا ہے۔

من شعر فریدونم گنجینہ قارونم۔ ہم مشکم و ہم خونم۔ نبوش وجواب افگن خون می چکداز شعرتب افروز دل کشت۔ گر خودنہ عاشقی، سخن عاشقانہ چیست

فریدون کے جذبات میں حدت ہے پیاس اور تڑپ ہے وہ محبوب کو گرفت میں لے کر اس کی ساری رعنائیاں نچوڑ کر اپنے جذبات کی تسکین چاہتے ہیں۔

خواہم   بہ   برت   گیرم   و   خونت   بکسارم
تادر شکند   جوش   دل   و   سوسہ   خیزم
خونخوار   گیم   بین   کو   ہوشمند   و   عطشناک
دربوسہ   شیرین   لب   سوزان   تو   ختم

شنگرف

فریدون کے اشعار کا آخری مجموعہ ہے جو اس کی زندگی میں 1353 ش/ 1974ء میں شائع ہوا۔ اس میں 65 غزلیں، 11 قصاید، 3 قطعات، 3 مثنویاں اور 4 رباعیاں ہیں۔ فریدون نے اس کتاب

کے دیباچے میں شعر و شاعری پر اپنے نظریات و قصاید کو مفصل بیان کیا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ شعر میں بحور و اوزان کی پابندی ضروری ہے۔ قافیہ بھی واجب ہے۔ اگر کہیں فکر و جذبہ کے بیان میں قافیہ مانع ہو تو وہاں پابندی کو نرم کیا جا سکتا ہے۔ بے وزن و توازن اشعار شاعری نہیں۔ وہ شعر آزاد شعر سپید۔ شعر منشور یا نثر منظوم کے بھی مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان شعرا کا یہ خیال بھی درست نہیں جو چاہتے ہیں کہ عوامانہ زبان استعمال کر کے عوام کے قریب ہو جائیں گے۔ اصل چیز وہ فکر و اندیشہ ہے جو اچھی زبان میں عوام تک پہنچے اور وہی موثر اور نتیجہ خیز ہوگا۔ فریدون ان تجدد پسند شعراء کے بھی مخالف ہیں جو بیرونی نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

فریدون کا خیال ہے کہ شعر بھی موسیقی اور ساز کی مانند ہے اور اسے بھی اصول و ضوابط کا پابند ہونا چاہئے۔

فریدون کو اپنے وطن اور اہل وطن سے محبت ہے۔ وہ ان کے لئے تڑپا ہے اور ان کے لئے اس نے دکھ جھیلے ہیں۔ اس کا مندرجہ ذیل بیان اس کا شاہد ہے۔

"من مردم سرزمین خود راز ہر شہر و دیار و از طبقہ و نژاد کہ باشند، عاشقانہ دوست می دارم و این مہر ورزی عمیق و جاودانی را در بیست و ہفت سال مبارزات پر آشوب و خطر زندگی خویش بر آنان باز نمودہ و حتی در آن ہنگاہ کے خانہ و زندگیم بہ ہجوم و کین دشمنان خلق د شتخوش تارج و حریق گردید۔ باز از ھواداری این مردم پاکدل و میہن دوست بہ قدم و قلم از پای ننشستم۔" (دیباچہ شگرف)

فریدون کے کلام میں تصور مرگ ایک جذبہ، احساس اور فلسفہ فکر کی طرح ہر جگہ نظر آتا ہے موت کبھی عزیز ہے کبھی نفرت انگیز کبھی درد اور کبھی درد کا مداوا۔ موت کی آواز کہیں نہ کہیں سنائی دیتی ہے۔ تو للی کا دل اسکا ہم راز و ہمدم ہے۔ وہ اسے کبھی انسانی پنجر کے رقص میں کبھی ارواح کے قہقہے میں اور کبھی میت کو نگلنے والی مٹی کی مسکراہٹ میں دیکھتا ہے۔

فریدون کی شاعری داخلیت کی شاعری ہے۔ یہ روح کی پیاس کی شاعری ہے۔ زندگی اس کے سامنے کھلی کتاب ہے۔ وہ اس کی متضاد کیفیتوں پر ہنستا ہے۔ طنز کے کوڑے برساتا ہے۔ کبھی رندی و عیاری سے زندگی کے جور و ستم اور رنج والم کو جنسی تلذذ سے بھلانا چاہتا ہے۔ لیکن آخر تک سایہ مرگ اسکا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

فریدون حافظ شیرازی کے کلام سے بہت متاثر ہے وہ اس کے اشعار کی ترکیب، کلمات کے دروبست اور صنایع لفظی و معنوی کے لطیف استعمال کو بڑے احترام سے دیکھتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ حافظ کے دیوان میں افکار اور احساسات تو اس سے پہلے شعراء نے بھی بیان کئے ہیں لیکن اس

کے انداز و اسلوب، الفاظ کی تراش، ذوق لطیف اور جذب و شوق کی وجہ سے کلام میں دل نشینی آگئی ہے۔

فریدون نے کہیں کہیں فکر خیام کو بھی اپنایا ہے۔ ذیل کے شعر میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

در سبو، ساقی، اگر جامی بود باقی، بمن دہ، زانکہ فردا، من خود اندر دست میخواران سبویم۔

صادق ہمایونی نے فریدون کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"رندی در ہمہ حال خمیرمایہ کار ہای ہزلیش بود، شعرش آئینہ دلش و دلش آئینہ احساسائش بود و احساس ہمہ خواستہ ہایش را در برداشت و می گفت۔ آدم ہمہ چیز را می تواند مہار کند جزدش و احساسش را"

فریدون کی غزل سراپا عشق و جوش و ولولہ ہے۔ ایک ہیجان و التہاب ہے جو لفظ لفظ سے عیاں ہے۔ غزل کہتے وقت وہ غم و اندوہ و مرگ کو فراموش کر دیتا ہے اس کی روح کا گداز اور دل کی آشفتگی غزل غزل میں رواں دواں ہے۔ اس نے خود کہا ہے۔

مستی دہد از شعر طربناک فریدون۔ تانغمہ بودمست و نوامست و سخن مست غزل کا رنگ یہ ہے۔

بمن آویز وبلم برلب چو غنچہ فروبند
اگرای نوگل بی تجربہ خواہندہ پندی
بہ جوانی رسد آن پیر سپید آمدہ مژگان
اگرش چشم سیاہ تو کند وسوسہ چندی
تن پاکیزہ تر از نرگس شاداب تو نازم
کہ بدان قامت پر غنچہ در آغوش پرندی
(شگرف)

بعض کا خیال ہے کہ عبید زاکانی کے بعد ادبیات فارسی میں تو للی جیسا طنز نگار پیدا نہیں ہوا۔ اس نے سیاسی و اجتماعی واقعہ و حادثہ سے متاثر ہو کر اچھوتے مفاہیم و تعابیر کو بے باکی، گستاخی اور شمشیر براں کی تیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ڈراما

ڈراما جذبات واحساسات کا فطری اظہار ہے اس لئے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی اس کے اظہار کی کہیں نہ کہیں صورت نظر آتی ہے۔ اسلام کا مزاج ڈرامہ کو راس نہیں آتا۔ اس لئے مسلمانوں کے ابتدائی عہد سلطنت میں ڈرامہ کی کوئی واضح شکل دکھائی نہیں دیتی۔ مسلمان علماء نے جہاں یونانی علوم کو اپنایا اور فلسفہ، طب اور قانون کی شہرہ آفاق کتابوں کے ترجمے کئے وہاں ہومر، یوری پیڈیز، ایس کلیز، ارسٹوفین، سوفوکلیز کے ڈراموں اور ارسطو کے فن ڈرامہ اور فن تنقید و شعر کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن انفرادی ڈرامہ کی شکلیں ادبی و تفریحی مجالس میں موجود ہیں۔ ایک شخص نے جسے جذبات و احساسات کو اپنے اوپر طاری کرنے اور اس کے اظہار کا خاص ملکہ حاصل ہوتا۔ وہ رجز کے اشعار پڑھنے میں بہادری، تندی و غضب کے جذبات کا اظہار اپنے اعضاء کی حرکات اور چہرے پر تغیرات سے کرتا۔ اسی طرح مرثیہ کے اشعار پڑھنے سے غم و الم، افسردگی و ماتم کی کیفیات اپنی آواز کے زیر و بم اور صورت کی خارجی حالت سے اظہار کرتا۔ ایران میں قصہ خوان کی ایک شخصیت نظر آتی ہے جسے ہم مجسم ڈرامہ کہتے ہیں۔ یہ شخص قہوہ خانوں میں بیاہ شادی اور دوسری تفریحی مجالس میں اپنے فن کے کمالات دکھاتا ہے۔ کبھی سپاہی کی طرح مسلح اور کبھی درویش کی طرح خرقہ پوش ہو کر قصہ بیان کرتا ہے اور کردار افسانہ کی ہو بہو تصویر بن کر واقعات قصہ کو اسی انداز میں پیش کرتا کہ حاضرین مبہوت ہو کر اس کو سنتے اور محظوظ ہوتے۔ قصہ خوان کے علاوہ ایک شاہنامہ خوان بھی ہے جو اپنی سحر بیانی اور موزوں حرکات سے سامعین کو اس قدر مسحور کرتا تھا کہ جان مطلب کو ناتمام چھوڑ کر ان سے پیسے بٹورتا تھا۔ اور کہانی کو دوسرے وقت پر ملتوی کرتا تھا۔ شاہنامہ میں سے سہراب کشی کی داستانی اس قدر پر تاثیر انداز میں بیان کرتا تھا کہ لوگ اس کو معقول رقم ادا کرنے پر تیار ہو جاتے تھے تاکہ وہ سہراب کو مرتے نہ دیکھ سکیں۔ کل عنایت یا کچل عنایت، شاہ عباس صفوی کا ندیم اور بازیگر اپنے اس فن میں استاد تھا۔ اشارات اور بدن کی حرکات سے واقعات کو اس طرح بیان کرتا کہ لوگ ہنسنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس کی چند ایک نقلیں مشہور ہیں۔ جو اس نے خود سٹیج کیں مثلاً۔

دایر کردن وکہ کرباس فروشی۔ کلک چیدن برای نجات جان محافظ بازشاہ اور مداوای چشم۔

اسی قبیل کے اشخاص میں سے ناصر الدین شاہ کے بدرہ گو ندیم کریم شیرہ ای کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کو اپنے آزمودہ کار شاگردوں، اتکی ماسی اور چوروکی کے ساتھ بادشاہ کے حضور کھیل

دکھانے کا موقع مل جاتا اور وہ کھیل کے درمیان اراکین سلطنت پر بھی نکتہ چینی کر جاتا۔ اس آزاد کلامی کی وجہ سے اسے بڑا رسوخ اور احترام حاصل تھا۔

رفتہ رفتہ قصہ گویوں کی ارتقائی صورت یہ ہوئی کہ مختلف کھیل تماشا جاننے والوں کی ٹولیاں بن گئیں۔ بعینہ جیسے ہمارے ملک میں نقال' بھانڈ اور رہس دھاریئے ہوتے تھے۔ یہ لوگ خاص تقریبوں پر کہانیوں کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کرتے اور اپنی اجرت وصول کرتے۔ یہ لوگ اپنے چہروں کو رنگ و سفوف سے آراستہ کرتے اور رنگ برنگ لباس پہنتے۔ کھیل کے وقفوں میں رقص اور بازیگروں کے کرتب دکھاتے۔ کھیل اکثر مختصر ہوتے لیکن ساز و آہنگ کی ہم نوائی سے خوب لطف رہتا۔ ناچنے والے لڑکے لڑکیوں کا لباس پہن کر......سامنے آتے تو حاضرین کی دلچسپی کا اور بھی سامان ہو جاتا۔

عام نقلوں میں یا کھیلوں میں ایک خاص جگہ پر درمیاں میں سٹیج یا چبوترہ بناتے۔ اس کے چاروں طرف تماشا دیکھنے والے بیٹھتے۔ تماشاگر سٹیج پر آتے اور اپنا اپنا کردار ادا کرتے کبھی کبھی بعض ماہر ایکٹر موقع کے مطابق اور دلچسپ باتیں بھی کر جاتے۔ حاضرین پر فقرے کستے' بعض ناشائستہ اور فحش کلمات سے خاطر تواضع بھی کرتے اور مجلس کو گرما دیتے یہ ٹولیاں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتیں اور اپنی روزی کا سامان پیدا کرتیں۔ ان کھیل تماشوں میں عوام زیادہ حصہ لیتے۔ ایکٹر بھی ادنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور لوطی وبازیگر کہلاتے تھے۔ اس لئے ان کی نقلوں میں بھی ابتذال پایا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی ایسی نقلیں کرنے والے میراسی اور بھانڈ کہلائے۔ یہ کھیل کامیڈی یا طنزیہ کی ایک صورت تھی جو ہنسنے ہنسانے اور تفریح و مزاح کے کام آتی تھی۔ اسے محض فارس یا نقل کا درجہ دیا جاتا ہے۔

عوام میں ڈرامہ کی ایک سلجھی ہوئی شکل بھی مرغوب تھی۔ ہنسنے ہنسانے والے مسخرے یا بھانڈ بیاہ شادی کی محفلوں کو گرمانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھیلوں کی نقلیں کرتے تھے۔ ان میں اجتماعی اخلاقی قسم کے مضامین بھی ہوتے تھے۔ جن کو شوخی اور مذاق کے رنگ میں پیش کیا جاتا تھا ان کھیلوں میں سے پہلوان کچل یا پہلوان پنبہ۔ عروس ہالو' خالو رورو' چہار صندوق اور طبیب کاشی موجود ہیں۔ مثلاً عروس ہالو کا قصہ یوں ہے ایک شخص نے خوبصورت عورت سے بیاہ کیا ہے لیکن وہ زن داری کے آداب واطوار سے واقف نہیں۔ دو اوباش کاجاما اور کاتاما یعنی کاکا جاما سب اور کاکا طماسب اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اس کو الو بنانا چاہتے ہیں۔ ایک صاحب سالمندر ہیں۔ (سالمندر + آر) اور ایک ان کے شاگرد (صحیح معنوں میں یہی کھیل کی جان) اپنی

عیاری طراری اور عجیب و غریب حرکات سے کاجاما اور کاتاما کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عورتوں کے لباس میں ظاہر کر کے ان دونوں شخصوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جنہوں نے بیاہتا عورتوں کی طرف نظر بد لگا رکھی ہے۔ وہ رقص و سرود' اشعار اور دوسری تقریروں سے عوام کو ان کے عیوب سمجھاتے ہیں اور محفل کو گرم کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہنربازوں میں سے حسن کلاہ' دوز علی ترکہ اور حاجی لرہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ان تماشوں کے ساتھ ساتھ رونے رلانے یعنی ٹریجڈی کی بھی ایک صورت نکل آئی۔ صفویوں کے عہد سلطنت میں شیعہ مذہب قومی مذہب قرار پایا۔ مرثیہ خوانی کو رواج ہوا خاص خاص تعزیہ خوان اور تعزیہ گردان پیدا ہوئے۔ محرم کے پہلے عشرہ میں شہادت امام حسینؓ کی ٹولیاں بن گئیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مناسب لباس و اسلحہ رکھتے تھے۔ واقعات شہادت کی تماثیل لکھتے اور شہروں میں جاکر سٹیج کرتے۔ جب ان کی قدر ہوئی تو اچھے اچھے خوش آواز ممثل ڈھونڈ کر لائے جاتے جو خاص خاص کردار ادا کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض شمر خوان' امام خواں اور عباس خواں مشہور تھے۔ ان تماثیل میں جید فضلاء اور امراء بھی حصہ لیتے۔ عورتوں کا پارٹ مرد ادا کرتے اور ایک سیاہ سبز لباس برقعہ پہنتے جن میں سے صرف آنکھیں نظر آتیں۔ خوبصورت لڑکے یا لڑکیاں سیاہ و سبز لباس میں آتیں۔ سر پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھتیں۔ شمر و یزید کا پارٹ ادا کرنے والے قیدی ہوتے اور اکثر سرخ لباس پہنتے۔ بعض انتقامی جوش کے اثر میں مارے بھی جاتے۔ شاہانہ سرپرستی حاصل ہونے پر ان تمثیلوں کا بڑا چرچا ہوا اور وسیع پیمانے پر ان کا انتظام ہونے لگا۔ تہران میں اس مقصد کے لئے ایک جگہ "تکیہ دولت" کے نام سے مخصوص کی گئی تھی۔ اس میں بادشاہ اور امراء کے لئے کمرے بنائے گئے تھے سٹیج پر کئی کئی مناظر بدلنے کے لئے پہلے سے انتظام ہوتا تھا۔ یہ تمثیلیں اثر انگیزی اور ہیجان خیزی سے بے نظیر سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تو حاضرین خود اعتقاداً غم و الم کے جذبات لے کر ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے _ دوسرے ایکٹروں کی فنی مہارت اور مذہبی عقیدت شامل ہوتی۔ اس لئے تاثر انگیزی میں سارا ماحول ایک المناک فضا پیدا کر دیتا۔ سازو آہنگ کا موزوں استعمال حاضرین کے جذب و کشش کا اور سامان پیدا کرتا۔ مکالموں میں جہاں جہاں اشعار پڑھے جاتے ڈرامے کی رفتار اور تیز ہو جاتی کبھی کبھی خستگی کو دور کرنے کے لئے ہنسی مذاق کے کھیل بھی شامل کر لیتے یا وقفوں کے درمیان موسیقی سے حاضرین کی تواضع کرتے۔ شاہی دستہ ان تعزیوں کو بڑے اہتمام سے سٹیج کرتا۔ ایکٹروں کو خلعت اور انعام ملتے اور بعضوں کو معین البکاء جیسے خطابات ملتے۔

ان ایکٹروں کو اپنے پارٹ زبانی یاد ہوتے اور جن کو یاد نہ ہوتے وہ کاغذ یا کاپی پر لکھ کر اپنے پاس رکھتے اور اپنے کام سے فارغ ہو کر مینجر کو دے دیتے۔ تمثیلوں کی نقلیں ہم تک نہیں پہنچیں۔ بعض مشہور تمثیلیں یہ ہیں۔ حجتہ الوداع، شہادت مسلم، بازار شام، یوسف و زلیخا، ہفتا دو دوتن، شست بستن دیو اور بلقیس و سلیمان کچھ تمثیلیں سرکولیس بیلی نے انگریزی میں ترجمہ کر کے 1879ء میں شائع کیں۔

یہ تمثیلیں اس فنی ڈرامہ کی صورت میں نہ تھیں جن میں پرانی تین وحدتوں کا التزام ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے اروپائی تھیٹر کے مقابلہ میں بھی ان کو پیش نہیں کیا جاسکتا البتہ ان تمثیلوں سے ایرانی تھیٹر کی ابتدائی شکل معرض وجود میں آگئی۔

فتح علی شاہ قاچار (1797- 1834ء) کے زمانہ میں قفقاز کا علاقہ روسیوں کے زیر اقتدار آگیا۔ روس کا تھیٹر کافی ترقی یافتہ تھا۔ ایران کے اس نئے علاقہ میں بھی وہاں کا تمدن اثر انداز ہوا۔ طفلس میں تماشہ خانے بنانے گئے۔ اور عوام کو فضول رسوم و قیود سے آزاد کرانے اور علم و اخلاق کی نئی روشنی میں لانے کے لئے ڈرامے سٹیج کئے گئے اس سلسلے میں ایک روسی ڈرامہ "انعام زن" کے عنوان سے 1831ء میں تہران میں سٹیج ہوا لیکن ایرانی تھیٹر کی تاریخ میں اس کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ ایرانیوں نے اپنی سٹیج کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ مرزا فتح علی اخوندزادہ نے قومی و ملی جذبہ اصلاح کی خاطر آذربائیجان میں ترکی میں مندرجہ ذیل ڈرامے لکھے۔

1- ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر	1850ء	2- موسیو ژوردان، حکیم بناتات	1850ء
3- خرس و زدافگن	1951ء	4- وزیر خان لنگران	1852ء
5- مرد خسیس	1854ء	6- وکلائے مرافعہ	1855ء
7- قصہ یوسف شاہ سراج	1856ء		

مرزا جعفر علی قراجہ داغی نے ان تمثیلوں کا فارسی میں ترجمہ کیا(1872 - 1874ء)ان کی زبان سادہ اور روز مرہ محاورہ کے مطابق ہے۔ اس میں پر تکلف اور پر تصنع انداز بالکل نہیں۔فارسی نثر کو سادہ اور دل آویز بنانے میں ان تمثیلوں کی مثال بڑی اہم ہے۔ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ ان پر ذاتی تخلیق کا شبہ ہوتا ہے۔

ناصرالدین شاہ قاچار نے اپنے یورپ کے سفروں میں تھیٹروں کو دیکھا اور بہت پسند کیا۔ اس نے مرزا علی اکبر خان مزین الدولہ معلم دارالفنون کو ایران میں تھیٹر کو عام کرنے کے لئے مقرر

کیا۔ چنانچہ اس نے مولیر کے ڈراموں کو دارالفنون کے ہال میں سٹیج کیا لیکن وہ لوگ جو بھدی ظرافت یا تمسخر کے عادی تھے یا تعزیہ کے المناک مناظر سے آشنا تھے وہ ان ڈراموں کے باریک نکات کو کیسے سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے ان کو خاص قبولیت حاصل نہ ہوئی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں وطن پرستوں اور آزادی خواہوں نے تھیٹر کو تبلیغی مقاصد کے لئے ایک اہم وسیلہ سمجھا مگر ان کے سامنے سرمایہ کی کمی کے علاوہ اور بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ ایکٹروں کو رذیل اور ادنیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اس پر رسوائی اور ملا کی تکفیر اور حکومت کی شمشیر بھی ہر دم سر پر رہتی۔ لیکن بعض باہمت اشخاص نے ایک منظم کوشش کے تحت ڈرامہ شروع کیا اور شرکت فرہنگ کے نام سے ایک عمارت بھی بنائی جس میں کافی دیر تک مدرستہ المعلمین قائم رہا۔ کچھ عرصہ بعد تیار ترلی کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم ہوا جس کے صدر عبدالکریم محقق الدولہ تھے۔ انہوں نے کورش کبیر اور جمشید کے تاریخی ڈرامے پیش کئے اور حاصل شدہ آمدن کو امور خیریہ میں صرف کیا۔ یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔

1916ء میں سید علی نصر کی ادارت میں کمڈی ایران کے نام سے ایک اور کمپنی کی تشکیل ہوئی۔ علی نصر اور ان کے دیگر شرکائے کار یورپین تھیٹر سے واقف تھے انہوں نے اپنے مصنفہ یا مترجمہ ڈراموں کو حسین انداز میں پیش کیا۔ صحیح معنوں میں یہی لوگ ایرانی تھیٹر کے بانی ہیں جنہوں نے لوگوں میں ڈرامے کا شوق پیدا کیا۔ اسی کمپنی کی تشویق پر باقراف تاجر نے خیابان لالہ زار میں ایک عالی شان تھیٹر بنایا۔ اس تھیٹر کی سٹیج پر یہودی ارمنی اور ترک عورتوں نے زنانہ پارٹ ادا کئے۔ جنگ عظیم (1914- 1918ء) کے بعد روسی اور قفقازی ایکٹر بھی ایران میں آئے چونکہ وہ فن سے واقف تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ فارسی لہجہ بھی اپنا لیا اور ساتھ ساتھ اپنے دلربا رقص و سرود سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ 1919ء میں پری خانم آقا بابف روس سے رقص و موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے ایران میں آئی۔ اس کی شخصیت سے تھیٹر کو بہت فروغ ہوا۔ آقای رضا شہرزاد کا ڈرامہ پری چہرہ وپ زاد کھیلا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ مادام بابف نے مجتبیٰ طباطبائی کی اعانت سے تیاترالہ سٹیج کیا جو تقریباً چالیس مرتبہ بار بار سٹیج ہوا۔ اس مختصر دور میں ارمینوں کی کوششیں بھی قابل قدر ہیں۔ اس زمانے میں دکتر ریاضی دان، دیوانہ مزاحم اور جعفر خاں از فرنگ آمدہ جیسے مشہور ڈرامے سٹیج ہوئے۔

علی نقی وزیری 1924ء میں یورپی تحصیلات سے فارغ ہو کر ایران آئے تو انہوں نے ایک مدرسہ عالی موسیقی اور ایک کلب قائم کیا اور ایسے فیچر لکھے جو تھیٹر کی سٹیج پر پیش کئے گئے اور

بہت مقبول ہوئے۔ چونکہ یہ تمثیلیں مدرسہ کی عمارت میں ہی کھیلی جاتی تھیں اس لئے عورتوں کی جھجک بھی دور ہوئی اور انہوں نے بھی ان محفلوں میں شریک ہونا شروع کیا۔

1305 ش (1927ء) میں اسماعیل مہرتاش نے جامعہ باربد' کے نام سے ایک کلب کی بنیاد رکھی۔ اس ڈرامہ کلب یا کمپنی کی غرض یہ تھی کہ ہنرہای ملی ایران کو زندہ کیا جائے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے لیلیٰ و مجنون' خیام' خسرو شیریں کے اوپیرا سٹیج کئے اور سٹیج کی آرائش میں نئے اضافے کئے۔ یہی مہرتاش ہیں جو ایرانی موسیقی میں قطعات فکاہی اور "نشاط آور موسیقی" کے موجد ہیں۔ 1309ھ (1921ء) میں ارباب افلاطون نے ایک مستقل تھیٹر "نکیسا" کی بنیاد پر رکھی۔ سیف الدین کرمان شاہی نے سٹوڈیو درام کرمان شاہی آغاز کیا اور تھیٹر کی تکنیک سکھانے کے لئے ایک کلاس بھی جاری کی لیکن حریفوں کے حسد کی تاب نہ لاکر اس نے 1312 ش میں خود کشی کرلی۔ 1312 سے 1317 تک کا زمانہ ایرانی ڈرامے کے زوال کا زمانہ ہے۔ پولیس کے تشدد اور سنسر اور حکومت کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ سے کوئی مستقل ادارہ نہ رہا۔ 1318 (1940ء) سید علی نصر کی صدارت میں انجمن پرورش افکار کے تحت ایک شعبہ تیاتر بھی قائم ہوا۔ اسی سال "ہنرستان ہنرپیشگی" کے نام سے ایک مدرسہ کا آغاز ہوا۔ جس میں اروپائی انداز میں تمام اصناف ڈرامہ سٹیج ایکٹنگ اور تیاتر کے متعلق عملی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ ہنرستان اب تک قائم ہے۔ 1319(1941ء) میں سید علی اور احمد دہقان نے ایک مستقل تھیٹر تماشا خانہ تہران کے نام سے شروع کیا اور اس کے ہمکاروں رفیع حالتی' غلام علی فکری اور فضلی اللہ بایگان کی کوششوں سے فن ڈراما کی پھر قدر و منزلت ہوئی ان لوگوں نے خود ڈرامے بھی لکھے اور سٹیج بھی کئے۔ اسی دور میں پردوں کے پہلے یا درمیان میں تصنیف ہائے سیاسی پڑھنے کا رواج ہوا اور قطعات آہنگ دار' یا پیش پردہ' لکھنے کا طریقہ عام ہوا۔

دوسری جنگ عظیم (1939- 1946ء) کے دوران میں ایک بڑا سیاسی اقتصادی اور اجتماعی انقلاب آیا جہاں زندگی کے اور شعبے متاثر ہوئے ادب بھی نئے اثرات سے نہ بچ سکا۔ مصنفوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ لوگ نئے افکار سے آشنا ہوئے ان کا ذوق بھی بدلا اور اس طرح 1320 سے گویا ایران میں "تیاتر جدید" رونما ہوا 1322ء سے 1326ء تک (1944- 1948ء) نئے تھیٹروں کی بنیاد رکھی گئی۔ ان میں سے خاص طور پر تیاتر فرہنگ اور تیاتر فردوسی قابل ذکر ہیں۔ سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لئے تھیٹر کو استعمال کیا۔ اس لئے بھی ان میں خوب رونق رہی۔ اس عرصے میں عبدالحسین نوشین کا نام عروج پر تھا جس نے نئے ڈراما کو عروج

پر پہنچایا اور ڈراما نگاروں کے مشہور کھیل سٹیج کئے۔ بن جان سن کا و لپن' شیکسپئر کا تاجر وینزی۔ مارسل پانیول کا توپاز' **پریستلی** کا **مستنطق** اور میترنگ کا پرندہ آبی نہایت مہارت سے پیش کئے گئے جو بہت مقبول ہوئے۔ نوشین نے ڈراما کی سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ ڈرامہ کی زبان کو آسان اور روزمرہ کے مطابق بنادیا۔

ایران میں تھیٹر اچھا خاصا مقبول رہا ہے۔ سات آٹھ مستقل تھیٹر صرف تہران میں موجود تھے۔ ان میں سے جامعہ باربد' تماشاخانہ تہران' تیاترپارس' تیاتر فردوسی نام آور تھے۔

نئے ڈرامہ نگاروں میں سے چند ایک نامور اشخاص کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نام ہیں جو تھیٹر کے لئے ڈرامے لکھتے ہیں۔

علی نصیریان

بلبل سرگشتہ
استعمال دخانیات ممنوع است
بنگاہ تاترال
سیاہ بازی

غلام حسین ساعدی

چوب بہ دستہای ورزیل
آی باکلاہ۔ آی بی کلاہ
چشم در برابر چشم
بہترین بابای دنیا
وای بر مغلوب
جانشین
دیکتہ
زاویہ

اس میں فرنگی شخص کا مقابلہ پرانی وضع کے آدمی سے کیا گیا ہے اور استادانہ نکات پیدا کئے گئے ہیں۔

اوپیرا

ڈرامہ کی ایک اور شکل اوپیرا بھی ہے۔ فارسی میں سب سے پہلے اوپیرا کے نمونے وہ ہیں جو ترکی قفقازی سے ترجمہ ہوئے۔ چونکہ ایرانی قفقازی موسیقی سے آشنا تھے اس لئے یہ اوپیرا بعینہ اسی آہنگ کے ساتھ سٹیج پر پیش کئے جاسکے۔ اصلی وکرم اور آلہہ مشہدی عباد۔ ایرانی ایکٹروں کے ہاں بہت مقبول ہوئے۔ اسی نمونہ کے مد نظر رضا شہزاد نے پری چہرو پری زاد کے نام سے اوپیرا لکھا جو کئی مرتبہ سٹیج ہوا۔ عشقی کے اوپیرا رستاخیر سلاطین ایران اور بچہ گدا کو بہت شہرت ہوئی۔ خسرو شیرین، لیلیٰ مجنون کے اوپیرا بھی باربار سٹیج ہوئے۔

منظوم ڈرامہ

ایران میں منظوم ڈرامہ کا رواج ہوا۔ مولیئر کے ڈرامہ "ومیزان تروپ" کا ترجمہ فارسی شعر میں ہوا۔ فارسی نام "گزارش مردم گریز" ہے۔ جشن فردوسی کے موقع پر شاہنامہ کی ایک کہانی فردوسی کے اپنے اشعار میں مختصر سے تصرف کے ساتھ پیش کی گئی۔ اس قسم کی منظوم ڈرامے آج کل بھی پیش ہو رہے ہیں۔ رستم و سہراب، **منیثرہ و بیثران** ان کی مرغوب مثالیں ہیں۔ ذبیح بہروز کا ڈرامہ شاہ ایران و بانوی ارمن، نظم آزاد میں ہے۔

تاریخی ڈرامہ

تاریخی ڈراموں کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ بزرگ اسلاف کی یاد تازہ کرنے اپنے بڑوں پر فخر کرنے کے جذبات پیدا کرنے کے لئے یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ان میں سے شاہ عباس کبیر، داستان خونین، آخری یادگار نادرشاہ اور عمر خیام قابل ذکر ہیں۔

جب تک ڈرامہ نگاروں کی تصانیف شائع نہ ہو جائیں ان کا مطالعہ کرنے کا موقع نہ مل سکے ہم ڈرامہ نگاروں کی حیثیت اور فن ڈراما میں ان کا مقام متعین نہیں کرسکتے۔ ایران میں بہت کم

ڈرامے چھپے ہیں وہ ناپید ہیں۔ بعض کے صرف ایک ایک دو دو ڈرامے مل سکے ہیں۔ انفرادی طور پر ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے مگر ہمارا مقصد تھا کہ ہم ایران کے چند برگزیدہ شخصیتوں کو ڈرامہ نگار کی حیثیت سے روشناس کراسکیں۔ فی الحال ہم مندرجہ ذیل ڈرامہ نگاروں کے حالات حاصل کر سکے ہیں۔ اور ان کے چند ایک ڈرامے بھی پڑھ سکے ہیں۔ ایرانی ڈرامہ سے دلچسپی رکھنے والوں کا خیال ہے کہ تاریخ ڈرامہ نگاری میں ان اشخاص کا ذکر ضرور آئے گا۔

1- مرزا ملکم خان
2- ذبیح بہروز
3- علی نصر
4- علی جلالی
5- رضا کمال شہزاد
6- ابوالقاسم جنتی

مرزا ملکم خاں

مرزا ملکم خاں اصفہان کے ایک ارمنی قصبہ میں 1249ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا یعقوب خاں نے جوانی میں بیرونی ممالک کا سفر کیا تھا اور فرانسیسی اور روسی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور دنیا کے نئے تحولات سے بھی آشنا ہو چکے تھے۔ وہ تہران میں روسی سفارت کے ترجمان بھی تھے اور ظل السلطان اور دوسرے شہزادوں کو فرانسیسی بھی پڑھاتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ تہران میں آ ٹھہرے۔ ملکم ان کا خاندانی نام تھا جو دراصل عبری زبان میں ملکم تھا۔ مرزا یعقوب مسلمان ہوگئے تھے لیکن خاندانی نام باقی رکھا تھا۔

مرزا ملکم بچپن سے فرانس گئے اور ابتدائی اور متوسط تعلیم حاصل کر کے پیرس کے پولی ٹیکنک مدرسہ عالی میں تحصیلات کی تکمیل کی۔ ایران آئے تو مدرسہ الفنون میں یورپین استادوں کی ترجمانی اور جغرافیا اور علوم مقدماتی کی تدریس کا کام سپرد ہوا۔ انہوں نے قصر شاہی اور دارالفنون کے درمیان تار کا سلسلہ قائم کرنے میں مدد دی اور بادشاہ اور وزیراعظم کی نظروں میں مقبول ہوئے۔ بعد میں مدرسی کے علاوہ مترجم اور **مستشار** بھی ہو گئے اور سیاسی و اصلاحی امور میں مشورے دیتے رہے۔

جب انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ ہرات کے موقع پر اختلاف ہوا اور پیرس میں صلح کانفرنس ہوئی تو ملکم مترجم اور **مستشار** کی حیثیت سے ایرانی وفد کے ہمراہ گئے اور عمدہ خدمات انجام دیں۔ 1288ھ میں ترکمانوں کے ہاتھوں مرو میں شکست ہوئی اور ملکم نے اس شکست کی ذمہ داری مرزا محمد حسین خاں سپہ سالار پر ٹھہرائی۔ تو ان کو مصلحت کی بنا پر ترکیہ میں

بھیج دیا گیا- کچھ عرصہ کے لئے وہ مصر میں جنزل کونسل بھی ہو کر گئے- اسی سال مرزا حسین جو استانبول میں ایران کے سفیر کبیر تھے- تہران آئے اور وزیر سے ترقی کر کے صدر اعظم بنے تو ملکم کو بھی ترکیہ سے بلالیا- یہاں انہیں پھر تنظیمی امور مملکت میں اصلاح کا موقع ملا- جب ناصرالدین شاہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو ملکم کو لندن میں وزیر مختار بنا کر بھیجا تاکہ وہ استقبال کے انتظامات کرائے- 1295ھ میں برلن کنگرس میں ایران کی نمائندگی کی اور اپنی کارکردگی اور موقع شناسی کی وجہ سے ترکوں سے قطور کا علاقہ واپس لینے میں کامیاب ہو گئے- بادشاہ نے ان کو سفیر کبیر بناکر جناب اشرف اور پرنس کا لقب استعمال کرنے کی اجازت بخشی- دوسرے سفر میں جب بادشاہ کو روپیہ کی ضرورت پڑی تو اس نے بیرن جولیس رایٹر کو بنک قائم کرنے اور ریلوے لائن بنانے کا اجارہ دلا دیا اس سے قومی اقتصادیات اور وقار کو بہت نقصان پہنچا- مخالفین نے اس کام میں ملکم کا ہاتھ سمجھا- تیسری مرتبہ جب بادشاہ انگلستان میں گیا تو ملکم نے بادشاہ کو کچھ رقم پیش کر کے لوٹری چلانے کا اجارہ حاصل کرلیا- ایران میں پہنچ کر ملکم کے مخالفین نے علماء سے فتویٰ حاصل کر کے اجارہ کو فسخ کرا دیا- لیکن ملکم نے اس سے پہلے ہی ایک انگریز کمپنی کے ہاتھ اس کو فروخت کر دیا تھا- امین السلطان اور دوسرے برسرکار درباریوں نے مل کر ملکم خان کو سفارت کبریٰ کے عہدہ سے معزول کرا دیا-

عہدہ سے برطرفی کے بعد ملکم نے "قانون" کے نام سے اخبار جاری کیا اور اپنی حیثیت عرفی کے دفاع اور ایران میں اصلاحات کے لئے مقالات لکھے- سید جمال الدین اسد آبادی بھی ایران سے جلا وطن ہو کر اس کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ شریک ہوئے چار سال تک یہ پرچہ مقبول ہوا اور ایران میں داخلہ کی ممانعت کے باوجود چوری چوری پڑھا جاتا تھا-

ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد امین السلطان بھی صدرات سے معزول ہوئے اور مرزا ملکم کے دوست امین الدولہ صدر اعظم ہوئے اور مظفر الدین شاہ کے حکم سے مرزا ملکم روم میں ایران کے وزیر مختار مقرر ہوئے- آخر 1326ھ میں ضعف پیری اور بیماریوں کی وجہ سے سوئٹزر لینڈ میں وفات پائی-

مرزا ملکم نے اگرچہ مشروطہ طلبوں اور آزادی خواہوں کے ساتھ شریک ہو کر خدمات تو انجام نہیں دیں لیکن ایرانی ان کی تحریروں اور ان کے افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے- قانونی اصلاحات کے بارے میں ان کے دو رسالے "کتابچہ غیبی' اور دفتر قانون" آخر کار نئی حکومت اور قانون وضع کرنے والوں کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئے- ان کی معلومات ہمہ گیر تھیں-

ون فیلڈ بلنٹ نے ان کے متعلق لکھا کہ وہ ایران کی ایک بزرگ شخصیت تھی جسے شرق و غرب کے افکار و عقاید سے واقفیت تھی-

تصانیف و تالیفات

کلیات رسائل جو ان کی زندگی میں ایک مرتبہ تہران میں اور بعد میں تبریز میں شائع ہوئے- ان میں مندرجہ ذیل گیارہ رسالے شامل تھے- اصول تمدن' حرف غریب رسالہ' **غیبیہ**' رفیق و وزیر' شیخ وزیر' **پولتیسکی** ہای دولتی' تنظیم لشکر و مجلس ادارہ' سیاحی گوید' اصول آدمیت' توفیق امانت' اصول مذہب دیوانیان' محمد طباطبائی نے ان کی تمام تصانیف کو اکٹھا کر کے نئے سرے سے ترتیب دیا ہے-

1- جلد اول

وہ رسائل جو اصلاح مملکت اور تنظیم قانون کے متعلق ہیں-

1- کتاب خانہ غیبی یا دفتر **تنظیمات** 2- رفیق وزیر 3- دستگاہ دیوان 4- انتظام لشکر و مجلس **تنظیمات** 5- دفتر قانون 6- نوم ویقظ 7- منافع آزادی 8- کلمات متخیلہ 9- حریت 10- اشتہار نامہ 10- اشتہار نامہ اولیای آدمیت 11- راجع باستقراض خارجی 12- ندائے عدالت 13- رسالہ **غیبیہ**-

2- جلد دوم

آثار سیاسی' ترجمہ وصیت نامہ فواد پاشا- تسخیر مرو و ترکمان- سیاستہائی دولتی-

3- جلد سوم

آثار اقتصادی- حرف غریب- تاسیس بانک ،صورت مذاکرات' مجلس شوریٰ دولتی درباب بانک' اصول تمدن-

4- جلد چہارم

آثار انتقادی، مسائل عامہ، چہار چشمان، مرات ا لبلہاء، اصول مذہب دیوانیاں سوال و جواب دولتی۔

5- تین تمثیلیں جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

مرزا ملکم خاں کو دارالفنون میں یورپین استادوں کی ترجمانی اور نئے علوم کی تدریس میں نہایت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرنا پڑا اور اپنی تحریروں میں آسان وسادہ الفاظ استعمال کرتے۔ جملوں کی بندش اس طرح کرتے کہ مضمون صراحت سے بیان ہو جائے بعد میں انہیں اس خاص اسلوب میں خوب مہارت ہو گئی۔ انہوں نے سرکاری مراسلات میں میانہ روی اختیار کی اور مرزا تقی خاں اور قائم مقام کی تقلید میں منشیانہ **تکلفات** سے عاری نثر لکھنے کو تقویت دی۔ قانون کے مقالات اور دیگر رسائل کے اسلوب نگاروں کا بھی مفید اثر ہوا۔ ایران میں صور اسرافیل، حبل المتین، ترقی، تمدن اور معارف نے بھی ان کے اسلوب کو پسند کیا۔

سیاسی، اجتماعی اور قانونی مضامین کے اظہار کے لئے ان کی نثر سادہ رواں اور فصیح ہے۔ قانونی اصطلاحات اور رسمی عبارتوں کے لکھنے میں اکثر پر تکلف الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اور مضمون کے مبہم ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مرزا ملکم خاں کا کمال سمجھئے کہ ان کے تخیل میں پیچیدگی نہیں اور انہوں نے مشکل سے مشکل مسئلہ کو وضاحت سے ادا کیا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ نثر کی موجودہ روش عام نہیں ہوئی تھی اور اصطلاحات بھی وضع نہیں ہوتی تھیں قانونی اور سیاسی موضوعات پر لکھنا دشوار تھا لیکن ملکم نے اس مشکل کو آسان کیا۔ اس لئے نثر کے تحول و تکامل میں ان کے طرز نگارش کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

ڈرامے انہوں نے فتح علی اخوندزادہ کی تقلید میں لکھے تھے اور ان کی نقل بھی اس کو بھیجی تھی۔ موضوع بھی اس کے ڈراموں سے ملتا جلتا ہے دونوں کا مقصود سیاسی اور اجتماعی اصلاح تھا۔ فتح علی کے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے۔ مرزا جعفر علی نے عوامانہ زبان میں ترجمہ کر کے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور زبان کی بھی اہم خدمت انجام دی۔ ایران میں تھیٹر شروع ہونے سے پہلے مرزا ملکم ہی ایسے شخص ہیں جنہوں نے فتح علی کے بعد طبع زاد ڈرامے لکھے اگرچہ ان کے اسٹیج ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن ڈرامہ نگاری کے ارتقاء میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے

مکالموں کے لحاظ سے طرز نگارش بھی اہمیت رکھتی ہے۔

مرزا ملکم کے یہ تین ڈرامے 1326ھ میں پہلے پہل تبریز میں روزنامہ اتحاد میں شائع ہونے شروع ہوئے تھے لیکن اسی سال سیاسی حالات کی خرابی سے اخبار بند ہو گیا اور ان کی اشاعت بھی منقطع ہو گئی۔ پھر مدت بعد 1340ھ کاویانی پریس برلن میں مجموعہ تیاتر کے نام سے شائع ہوئے۔

پہلے ڈرامے کا عنوان "سرگذشت اشرف خاں حاکم عربستان درایام توقف در طہران" ہے۔ اس میں کسی ایک شاہ قاچار کے زمانے میں دربار داروں، وزیروں اور دوسرے ملازمین کی مالی ابتری، رشوت ستانی اور انعام خوری کے واقعات کا ذکر ہے۔ اشرف خان عربستان کے حاکم تہران دارالسلطنت میں بلائے گئے ہیں کہ اپنے صوبے کی مالیت کا حساب دیں۔ وہ بادشاہ اور وزیراعظم کی خدمت میں خدمت گار کنیزیں اور چند ہزار اشرفیاں ہدیہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پھر حساب دار یعنی مستوفی کو نذرانہ یعنی رشوت دیتے ہیں تاکہ جلد گلو خاصی ہو جائے۔ مستوفی تیس ہزار تومان اسکے ذمہ قرض نکالتے ہیں لیکن بعد میں نذرانہ وصول کرنے پر سارا حساب ختم ہو جاتا ہے اور بادشاہ کی طرف سے حکمنامہ اور خلعت عطا ہوتا ہے۔ حاکم کے دوران توقف میں فرآش، شاگرد، خلوت، میر غضب، گداگر اور کدخدا وغیرہ سب انعام مانگنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں مستوفی یہ بھی سبق دیتے ہیں کہ اگر پائے تخت میں تمہارا خرچ ہوا ہے تو تم اپنے علاقے میں جا کر اپنی رعیت سے زبردستی روپیہ وصول کر لو گے۔

تکنیکی نقطہ نظر سے یہ کہانی ڈرامہ نہیں بن سکی۔ اشرف خاں تہران پہنچتا ہے کبھی وزیر سے ملاقات کرتا ہے کبھی مستوفی سے ملتا ہے کبھی اس کے پاس فراش اور کبھی دوسرے ملازمین انعام لینے آتے ہیں اور کبھی وہ اپنے قدیم سے مشورہ کرتا ہے یوں سمجھئے کہ ایک واقعہ ہے جس کا مکالموں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کوشش کر کے واقعہ کو ایک پلاٹ کی شکل دی جا سکتی ہے جن حالات کو پیش کیا گیا ہے ان میں واقعیت کی جھلک ملتی ہے۔ مکالموں سے کسی کی شخصیت نمایاں نہیں ہوتی۔ سب بھکاری، ہوسباز، حرام خور، کاہل اور بے ایمان ہیں جو خوشامد سے بھی اور تہدید سے بھی روپیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس تمثیل میں کسی عورت کا کردار نہیں آیا۔

2- طریقہ حکومت زمان خان بروجردی در سرگذشت آں ایام

عنوان میں تو اس ڈرامے کا نام یہی لکھا ہے لیکن آخر میں تمام شدجندن بازی حاجی رجب تاجر لکھا ہے۔ دونوں نام زیادہ موزوں نہیں۔ اس کھیل میں طریقہ حکومت زیر بحث نہیں البتہ

اس زمانے کے نام نہاد علاقائی حاکموں کی زندگی کا نقشہ ہے ان کا رکھ رکھاؤ تو حاکمانہ ہے لیکن آمدن کا کوئی باقاعدہ ذریعہ نہیں۔ اس لئے ہرناجائز طریقہ سے روپیہ بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شراب فروشوں کو دباتے ہیں۔ طوائفوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کے پاس جانے والوں پر جرمانہ کرتے ہیں۔ اس کھیل میں اس مالی ابتری کا بیان ہے۔ حاکم فراشباشی سے روپیہ حاصل کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔ فراشباشی وہ باشی سے کہتا ہے وہ باشی ایک فاحشہ کے پاس جاتا ہے اس سے ساز باز کرتا ہے کہ وہ ایک دن حاجی رجب تاجر کو اپنے پاس رات کو بلائے اور ان کو خبر کرے تاکہ وہ دوسرے آدمیوں کو لے کر اسی رات حاجی رجب کو گھیرلیں اور وہ اپنی عزت کے خوف سے روپیہ دینے پر مجبور ہو جائے' چنانچہ یہ سازش کامیاب ہوئی۔ حاجی رجب سے تین سو تومان حاصل کر لئے۔ ڈیڑھ سو تومان فراشباشی کی وساطت سے حاکم کی خدمت میں پیش کئے گئے' وہ باشی کی کارکزاری کی تعریف ہوئی اور وہ باشی سے نائب کد خدا بنایا گیا۔ فراش باشی بھی حاجی رجب سے چائے پی آیا اور شال کا تحفہ وصول کر لایا۔

اس تمثیل میں ڈرامے کی صورت نکل آئی ہے ایک پلاٹ بن گیا ہے اور کہانی بھی چلتی نظر آتی ہے لیکن ہمیں پلاٹ کا پہلے پتہ چل جاتا ہے کہ ایک تدبیر کی ہے اور وہ کامیاب ہو جائے گی' اس لئے اصل ڈرامہ کی طرح پلاٹ کا چڑھاؤ اور اتار نہیں پایا جاتا ایک واقعہ سوچا ہے اس کو ڈرامہ کی صورت دیدی ہے۔

سین چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کہیں کہیں (SIDES) سے بھی کام لیا گیا ہے کردار عام ہیں ان کے لباس وضع قطع اور گفتگو سے ان کی شخصیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ ڈرامہ میں ان کی سیرت کا خاص پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔ صرف طوائف کی باتیں اس کے حال کے مطابق ہیں۔ اس لئے حاجی رجب کو جو خط لکھے ہیں وہ بھی حسب حال ہیں۔ اس کی گفتگو اور حرکات سے طوائف کی شخصیت تھوڑی سی نمایاں ہوتی ہے۔

3- سرگذشت کربلا رفتن شاہ علی مرزا او توقف چند روزہ در کرمان شاہاں نزدشاہ مرا و مرزا حاکم آنجا۔

اس ڈرامے میں ایک ادھیڑ عمر شاہزادے کا ذکر ہے جو کربلا جاتے جاتے اپنے بھائی حاکم کرمانشاہاں کے پاس ٹھہرا تاکہ اس سے کچھ روپیہ اور زادراہ حاصل کرے۔ یہ ایک عجیب بے وقوف زودرنج اور سادہ لوح شخص تھا۔ حاکم کرمان شاہ کے بیٹے ایرج مرزا نے اس کو ٹالنے کے لئے یہ تجویز کیا کہ اس کو دور ایک علاقے میں شکار کے بہانے لے جائیں اور سیرو گردش کرا کے

چلتا کریں وہاں لے جا کر اس کی خوب مٹی پلید کی۔ رقص و سرود کی محفل کے بعد ایک بیسوا کو اس کی خلوت میں رکھا۔ بعد میں چراغ خاموش کر کے غنڈوں' بدمعاشوں کو اس کی منزل کے باہر ہنگامہ کے لئے چھوڑ دیا۔ دوسرے دن شہزادہ صاحب نے ان فسادیوں کے سرغنہ کلانتر کو سزا دینے کے لئے دربار لگایا دوبارہ ایرج مرزا کے اشارے پر چند لوطی لفنگے بندوقیں لے کر ٹوٹ پڑے۔ نوکروں نے شہزادہ کو پکڑ کر بیت الخلا میں پھینک دیا۔ وہاں سے نکالا تو طویلہ میں لے جا کر اس پر پالان ڈال دیا۔ شہزادہ صاحب کئی دفعہ بیہوش ہوئے۔ آخر اس کو عورتوں کا لباس پہنا کر چھپے چھپے باہر نکال دیا تاکہ وہ قصر شیریں میں کچھ دیر ٹھہرے اور کچھ خرچ اس کو پہنچا دیا جائے۔

یہ کھیل ایک فارس (FARCE) ہو کر رہ گیا ہے۔ بھلا اتنی عمر کا شہزادہ اتنا احمق ہو سکتا ہے کہ اس کو حاکم کے محل میں ٹھہرایا جائے لیکن وہ یہ باور کرے کہ وہ کلانتر کا مکان ہے تو اس ڈرامے میں بھی مالی اوضاع کی خرابی کا ذکر ہے۔ کلانتر شہزادے کو کچھ تومان دینے کا وعدہ کرتا ہے تو اس سے راضی ہو جاتا ہے پھر دھ خدا اس سے کچھ زیادہ رقم لکھ کر دیتا ہے تو اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ بدنظمی اور بدامنی کا مظاہرہ بھی ہوا ہے جس سے مقصود اس زمانے کے خراب نظام کی طرف توجہ دلانا ہے۔ شہزادے کی ذات کے ساتھ اس قدر تمسخر بادشاہ اور نالائق شہزادوں کی توہین کے مترادف ہے۔

اس تمثیل میں شاہ قلی مرزا کا کردار کچھ قابل مطالعہ ہے۔ وہ محض زبانی زور دکھاتا ہے۔ قتل کی دھمکیاں دیتا ہے لیکن اس میں خودثبات و استقلال نہیں۔ اس کا عمل نہایت بزدلانہ ہے وہ ہماری ہمدردی اور ترحم کے قابل نہیں۔ مصنف خود اس کو ذلیل دکھانا چاہتا ہے۔ اگر ایک اچھا ایکٹر اس کردار کو کھیلے تو حرکاتی کمڈی کا ایک اچھا کھیل بن سکتا ہے باقی کردار آسان ہیں اور ہر شخص ان کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ تمثیل میں خاص کہانی اور اس کا ارتقا مد نظر نہیں بلکہ شہزادہ کی تضحیک مقصود ہے۔ اسی غرض کے لئے چار پانچ منظروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ذبیح بہروز

ذبیح بہروز 1889ء میں پیداء ہوئے۔ ان کے والد ابوالفضل ساوجی اپنے عہد کے فاضل شخص تھے۔ ناصرالدین شاہ کے دربار میں رئیس التالیفات مقرر تھے۔ نامہ دانشوراں کی مبسوط کتاب ان کی ادارت میں مرتب ہوئی اور کافی حصہ ان کے اپنے قلم سے ہے۔ بہروز نے اپنی ابتدائی اور

متوسط تعلیمات کی تکمیل تہران میں کی۔ 1910ء میں وہ مصر چلے گئے اور وہاں 1919ء تک ایک مدرسہ متوسط ایرانی میں معلم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1919ء سے 1924ء تک کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے ساتھ معاون ہو کر کام کرتے رہے۔ 1924ء کے بعد ایران میں واپس آگئے اور آج تک وزارت فرہنگ کے ملازم ہیں۔۔ دانش کدہ ہوا پیائی اور دانش کدہ افسری میں ریاضیات کی تدریس میں مشغول ہیں۔ وہ باشگاہ افسران میں لائبریری کے بھی انچارج ہیں۔

عربی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ان کو خوب مہارت ہے جرمنی بھی جانتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کافی حصہ زبان و خط کے متعلق تحقیق کرنے اور آسان بنانے میں صرف کیا۔ وہ ایک نئے اور آسان خط کے موجد شمار ہوتے ہیں اور اگر رضا شاہ کبیر کچھ اور مدت تک بر سرکار رہتے تو عین ممکن تھا کہ ان کا ایجاد کردہ رسم الخط سرکاری طور پر منظور ہو جاتا اور آج مدارس میں اس خط کے توسط سے تعلیم دی جاتی۔

ایران میں آکر ان کے پیش نظر یہی مقصد تھا کہ وہ تدریس کے وسائل کو آسان کریں۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر ریاضی کتابوں کی زبان آسان کر دی جائے تو اس کو پڑھانا بھی آسان ہو جائے اور پڑھنا زیادہ سہل ہو جائے پھر تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ زبان کی مشکلوں کو کلمات کے نقطہ نظر سے دور کر دیں تو علوم و فنون کے حاصل کرنے میں اور ترقی ہو۔ اسی ضمن میں ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ دنیا میں علم وہنر کے پھیلانے میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان کا رسم الخط ہے۔ اکثر رسم الخط غیر طبعی اور ناقص ہیں بچہ ساتویں سال مدرسہ جاتا ہے اور اپنی زندگی کا کافی حصہ خط سیکھنے میں ضائع کرتا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر خط کا رابطہ زبان سے ہو تو خط کی ایک علمی صورت پیدا ہو جائے اور ہر قسم کے تلفظ کو اس خط میں لکھا جا سکے۔ اور بچے جونہی بولنا سیکھیں ساتھ ہی ساتھ کھیل کود میں پڑھنا سیکھ لیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل رسالے لکھے ہیں۔

1- خواندن و **نوشتن** در دو ہفتہ 2- کودک و بیرہ 3- خط و فرہنگ 4- زبان و فرہنگ 5- ریاضی و فرہنگ 6- تقویم و تاریخ در ایران

ان کی ڈرامہ نگار کی حیثیت ضمنی ہے لیکن چونکہ وہ فن ڈرامہ اور تکنیک سے آشنا ہیں اور انہوں نے دقت نظر اور محنت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ اس لئے ان کا ایک ڈرامہ کئی مصنفوں کی تصانیف پر بھاری ہے۔ ڈراموں سے مقصود قوم و ملت کی بیداری ہے۔ اکثر ڈراموں کے پس

منظر میں حکومت اور اجتماعی خرابیوں کی اصلاح ہے اور صرف انہیں کے ڈراموں میں ہمیں کامیاب طنز و ہجو کے نمونے ملتے ہیں۔ مرات السرائر اور پنج باد. آور ان کے منظوم ڈرامے ہیں اور قبل الذکر ان کی اپنی نظر میں ان کا ایک کامیاب طنزیہ ڈرامہ ہے۔

طربیہ ڈراموں میں **جیجک** علی شاہ' دکترنکلن برگ باستان شناش حکیم باشی مشہور ہیں اور سب سٹیج ہو چکے ہیں۔ شاہ ایران و بانوی ارمن تاریخی ہے۔ درراہ مہر' میں حافظ کی شخصیت نمایاں ہیں اور **خویشتن**' میں ابن سینا اور شب فردوس' میں فردوسی' کے علم و عرفان سے بحث ہے۔ یہ آخری تین ڈرامے علمی و تعلیمی ڈرامے ہیں اور مصنف کے گہرے مطالعہ اور وقت نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ ان ڈراموں کو پڑھ کر ہی لطف لیا جاسکتا ہے سٹیج کے نقطہ نظر سے یہ ڈرامے زیادہ علمی ہو گئے ہیں۔ ان میں حرکت و رفتار کم ہے مکالمے اور مباحث زیادہ ہیں۔

جیجک علی شاہ

یہ ایک پانچ پردوں کا کھیل ہے۔ شروع میں عنوان کے نیچے جیجک علی شاہ یا اوضاع سابق دربار ایران لکھا ہے اس سے مصنف کے خیال کی وضاحت ہوتی ہے پہلے پردے میں ہال ہے جس میں **بیگلز** بیگی یعنی حاکم شہر اپنے مشیر اور خدمت گاروں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ لوگ فریادیں لے کر آئے ہیں۔ ظلم کے خلاف شکایت لائے ہیں۔ روتے ہیں لیکن ان کی کوئی نہیں سنتا۔ ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ایک عورت فریاد لائی ہے کہ اس کا شوہر مر گیا ہے ایک بچی رہ گئی ہے لڑکی کا چچا اس کو اپنے بیٹے سے بیاہنا چاہتا ہے جو اس کے باپ کی عمر کا ہے۔ شیخ الاسلام نے کہہ دیا ہے کہ یہ شادی جائز و مناسب ہے۔ حاکم کے مشیر فرماتے ہیں کہ جوان شوہر نادان ہوتا ہے عورت چلاتی ہے کہ بچی بیچاری ابھی بیاہ شادی کو نہیں سمجھتی لیکن اس کو بھی باہر نکال دیتے ہیں۔ دوسرے پردے میں دربار کا ایک ہال ہے۔ شاہ صدر اعظم سے احوال مملکت پوچھتا ہے مورخ روزانہ لکھے ہوئے حال سناتا ہے۔ شاعر قصیدہ سناتا ہے کریم شیرہ مسخرہ دربار امیر دواب کا مذاق اڑاتا ہے اور وہ بادشاہ سے ناراض ہو کر آجاتا ہے۔ تیسرے پردے میں امیر دواب میرزا بزرگ سے زبردستی شعر لکھواتا ہے ندیم دربار اس کو واپس بلا کر لے جاتا ہے۔ چوتھا پردہ بادشاہ کے اطاق ناہار میں واقع ہوتا ہے۔ امیر دواب شعر پڑھ کر سناتا ہے اور ظرافت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسی منظر میں سفیر الملک اور اقیانوس العلوم کا تعارف ہوتا ہے جو اپنے اقوال

و حرکات سے ہدف تمسخر بنتے ہیں۔ پانچویں پردے میں امیردواب میرزا بزرگ کو پڑاتا ہے کہ اس نے شعر نہیں کہا معر کہا ہے۔ بادشانہ نے امیردواب کو حکم دیا تھا کہ ہال میں میز بزرگ ڈال کر اس پر قلمکار بچھا دے۔ اس نے میزبزرگ کے بجائے میرزا بزرگ کو لٹا کر اس پر قلمکار بچھا دیا ہے۔ آخر میں بادشاہ سفیر بلجیک کے ہمراہ داخل ہوتا ہے اور امیردو آب کی حماقت دیکھ کر اس کو باہر نکال دیتا ہے۔

اس ڈرامہ میں کوئی مسلسل کہانی نہیں ہے۔ پہلا منظر باقی چار منظروں سے الگ ہے۔ محض داد رسی کی خرابیاں بتانے کے لئے اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ باقی حصے میں اگرچہ کوئی پلاٹ تو نہیں پھر بھی دربار بادشاہ اور اس کے اوضاع و اطوار کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس کھیل کو موضوع پلے کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ موضوع پہلے سے متعین ہے اور کردار اس غرض کے لئے لائے جا رہے ہیں کہ مطالب کو واضح کر سکیں ایک ایک کردار دربار کا نمائندہ ہے۔ صرف کریم شیرہ کا کردار اپنی اصلی شخصیت میں نمایاں ہے۔ تاریخوں میں یا اس کے جاننے والوں نے اس کے متعلق جس قسم کے بیانات دیئے۔ وہ یہاں اپنے خدوخال کے ساتھ ساتھ پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کی پھبتیاں، ضلع جگت، مذاق، تمسخر، خندہ اور حرکات موجود ہیں۔ اور شاعر لائسنس کی طرح اس کو تمسخر لائسنس ملا ہے۔ اس لئے وہ ہر ایک کی پگڑی اچھالتا ہے، باقی سب کے کردار میں بھی تمسخر کا شائبہ موجود ہے۔ مصنف نے ان کی شکلیں بگاڑ کر اور ان کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ صرف اخلاق کی ان خصوصیات کو ابھارا ہے جس کے جاننے سے ان کے خلاف دبی دبی نفرت اور حقارت پیدا ہو۔ بادشاہ خوشامد طلب ہے۔ شعر سنتا ہے اپنی تاریخ کے فضول واقعات کو مبالغہ آمیز لہجہ میں سن کر انعام دیتا ہے۔ وہ سنجیدہ نہیں ہے۔ امور مملکت میں غور نہیں کرتا لیکن اس کھیل سے اس کے کردار کی ایک جھلک نمایاں ہے وہ جانتا ہے لوگ جاہل خوشامدی اور محض باتونی ہیں وہ ملا سے پوچھتا ہے کیا اس نے کبھی بلجیک کھایا ہے۔ ندیم دربار سے پوچھتا ہے بلجیک میں کتنے مسلمان بستے ہیں۔ سفیرالملک جب اپنا علم جتانے کے لئے لفظوں کو بگاڑ کر بولتا ہے تو اس کو پڑاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باہوش ہے لیکن وہ اس قسم کے لوگوں کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت بھی دیتا ہے۔

امیردواب کا کردار ہے تو مصنوعی، لیکن مسخرگی کے لئے خوب ہے وہ احمق اور زود رنج ہے پل پل بگڑتا ہے۔ فحش بکتا ہے ہر ایک کام کو فوراً کروانا چاہتا ہے۔ ترکی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ترکی لہجہ میں بولتا ہے اور ہر وقت اپنا مذاق اڑواتا ہے جس دربار کے منتظم اس قبیل کے

اشخاص ہوں اس کا خدا حافظ صدر اعظم، ملا شاعر اور مورخ کا کردار ضمنی ہے لیکن ان کی گفتگو سے ان کی شخصیت ظاہر ہے۔ سارا دربار مسخروں کا اکھاڑہ نظر آتا ہے۔ مصنف نے ان سب کرداروں کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور سب کو اپنی اپنی جگہ درست بٹھایا ہے مصنف نے ہر کردار کی حرکات کو بھی ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اس لئے ڈرامہ پڑھ لینے سے دیکھنے کا لطف آتا ہے۔

مصنف کو اپنی زبان لکھنے پر بڑا عبور ہے ہر کردار کی زبان میں وہ کلمات دیئے ہیں جو اس کی شخصیت کے لئے موزوں ہیں۔ شاعر کے اشعار اور مورخ کی عبارت اظہار بیان کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ ڈراما بھی موضوع کے اعتبار سے اخوند زادہ اور مرزا ملکم خاں کے ڈراموں سے ملتا جلتا ہے لیکن اس میں امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مزاح و طنز کا عنصر زیادہ ہے۔ انہوں نے کرداروں کے نام ایسے چنے ہیں جن میں ایک طنز کا پہلو چھپا ہے مثلاً قیانوس العلوم، امیردواب، مفخر الشعراء وغیرہ۔ صدر اعظم کی تقریر مورخ السلطان کی تاریخ نگاری اور مفخر الشعراء کے اشعار طنز نگاری کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ طنز کے ساتھ ادبی لطافت رچی ہوئی ہے۔

شاہ ایران وبانوی ارمن

یہ ایک پانچ پردوں کا کھیل ہے مصنف نے اس کے پہلے دو صورتوں میں لکھا تھا۔ ایک سینما کے لئے اور دوسرا تھیٹر کے لئے کہانی خسرو شیریں کے مشہور قصے پر مبنی ہے مصنف نے اپنے انگلستان کے دور قیام میں تواریخ اور آثار قدیمہ کی مدد سے خسرو پرویز کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا اور تحقیق کے بعد اس ڈرامے کو لکھا اس کا نظریہ یہ ہے کہ شیریں ارمن کی ایک خاتون ایرانی الاصل تھی اور وہ عیسائی نہیں تھی سینما کے لئے جو کھیل لکھا ہے وہ بھی پانچ حصوں میں منقسم ہے مگر اس میں تاریخ اور قصہ کے متعلق تفاصیل بہت زیادہ ہیں گویا وہ سارا کھیل قصے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور کہیں کہیں مکالمے لکھے ہیں۔

مختصراً کہانی یہ ہے کہ خسرو ایک دن تیسفون میں جشن رقص و سرود میں ایک مہ جمال کا رقص دیکھنے میں مصروف ہوتا ہے کہ شاہپور اس کا مشیر اس کو بتاتا ہے کہ ارمنستان میں ایک حسن و جمال کی دیوی شیریں رہتی ہے جس کے سامنے دربار کی سب پریاں مات ہیں۔ بادشاہ اس کو لانے کے لئے شاہ پور کو بھیجتا ہے۔ شاہ پور بادشاہ کی تصویر بنا کر شیریں کے باغ میں لٹکا آتا

ہے اور اس کی توجہ اور اس کے دل کو بادشاہ کی طرف مائل کرتا ہے۔ پھر کسی ذریعے سے شیریں کی تصویر بھی بناتا ہے اور دونوں کو یکجا کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی عرصہ میں بادشاہ فتنہ تاتار کو فرو کرنے کے لئے مشرق میں چلا جاتا ہے۔ لیکن رات دن شیریں کا عشق اور خیال اس کو بے چین رکھتا ہے۔ شاہ پور بادشاہ کے پاس تصویر لے کر پہنچتا ہے اور اس کو مزید فراق و اضطراب میں چھوڑتا ہے۔ دربار کے امراء بادشاہ کی یہ خواہش دیکھ کر شہزادی کو شادی کا پیغام دیکر ارمن میں بھیجتے ہیں اور شیریں کو بڑی خوشیوں سے دارالخلافہ تیسفون میں لاتے ہیں۔ لوگ اس کے استقبال میں بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ شیریں محلات میں رہتی ہے پولو کھیلنے میں حصہ لیتی ہے کھیل کے میدان میں فرہاد اس پر فریفتہ ہوتا ہے اور اس پر پھول نچھاور کرتا ہے۔ بادشاہ دیر تک نہیں لوٹتا تو شیریں اداس ہوتی ہے۔ اس کو مصروف رکھنے کے لئے امراء اس کے لئے قصر شیریں تعمیر کرنے کا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ فرہاد معمار کا نقشہ پسند کیا جاتا ہے، شیریں کئی مرتبہ وہاں جاتی ہے اور اس کے دل میں محبت ابھارتی ہے یہ خبریں بادشاہ تک پہنچتی ہیں وہ نئے محل کو برباد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فرہاد کو زنجیروں میں جکڑ کر طوس میں لے جاتے ہیں۔ موبد فیصلہ کرتے ہیں کہ فرہاد بے گناہ ہے اور اس کی رہائی کا حکم دیتے ہیں۔ فرہاد نئے سرے سے محل کی تعمیر شروع کرتا ہے اور شیریں کے خیال میں مدہوش اپنا کام جاری رکھتا ہے شاہ پور ایک عورت کو بھیج کر یہ چال کھیلتا ہے اور فرہاد کو اطلاع دیتا ہے کہ شیریں اپنے رتھ سے گر کر جان توڑ بیٹھی ہے۔ یہ خبر سن کر وہ تیشہ مار کر خود کو ہلاک کر ڈالتا ہے شیریں پہنچ کر اپنے عاشق زار کو دامن میں اٹھاتی ہے اور وہ جان دے دیتا ہے بعد میں خسرو اور شیریں کی شادی ہوتی ہے۔ بادشاہ اس قدر عیش و عشرت میں غرق ہو جاتا ہے کہ امور مملکت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ سپہ سالار اس کو قتل کر دیتے ہیں اور اس کے بیٹے شیرویہ کو تخت پر بٹھاتے ہیں۔ شیرویہ رومی شہزادی مریم کے بطن سے تھا۔ وہ بادشاہ کی بے اعتنائی دیکھ کر غم میں گھلتی گھلتی مر گئی۔ عوام بھی ایک عیسائی عورت کو ایران کی ملکہ دیکھ کر خوش نہیں تھے۔

چونکہ اس کہانی کو فلمانے کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی تاکہ خسروی عہد کا ایران اپنے تزک و احتشام سے جلوہ گر ہو۔ اس لئے کوئی انگریزی کمپنی اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ایران خود ہی اس کا اہتمام کرتا تو مصنف کی دلی خواہش پوری ہو جاتی۔

اگرچہ اس کھیل میں ایک بادشاہ کی زندگی کے واقعات قلمبند ہیں مگر ڈرامائی عناصر جگہ جگہ موجود ہیں۔ فرہاد اور خسرو کی عشقیہ کشمکش، شیریں کا خود تذبذب، روم و ایران کی جنگ، ایران و

تاتار کی لڑائی، شاپور کی سازشیں اور چالیں اور آخر کار سرداروں کے ہاتھوں خسرو کا قتل۔ ایک لائق اور بلند نظر ڈائریکٹر کے ہاتھوں یہ کھیل ایک شاندار ڈرامہ بن سکتا ہے۔ کہانی کو مسلسل رکھنے کے لئے کچھ مناظر کی تخفیف کرنا پڑے گی۔ ورنہ کھیل بہت طویل ہو جائے گا شیریں فرہاد کا قصہ خود ڈرامے میں ایک ڈرامہ ہے۔

کرداروں کی شخصیتیں پہلے سے متعین ہیں۔ ڈرامے سے غیر معمولی طور پر کسی کی شخصیت نہیں ابھرتی۔ ڈرامہ کھیلنے والوں پر منحصر ہوگا کہ وہ کس سلیقے سے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں تاکہ شیریں فرہاد، خسرو پرویز اور مریم کی شخصیتیں آنکھوں کے سامنے پھر جائیں۔ کہانی المناک تاثر چھوڑتی ہے۔ فرہاد کی دردناک موت اور آخر میں خسرو کی بے وقار موت دیکھنے والوں کو غمناک بناتی ہے۔ اور شیریں کو ہماری نظروں میں گراتی ہے کہ ایک عورت ایک عزیز جان کی شکست اور عظیم الشان بادشاہ کے زوال کا سبب بنی ہے۔

یہ ڈرامہ اپنے انداز بیان کے لحاظ سے ایرانی ڈراما کی تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ آزاد نظم میں لکھا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپئر کے تاریخی ڈراموں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ 28- 1927ء میں یہ بڑی کامیاب کوشش شمار ہوتی تھی۔ الفاظ کے استعمال تک میں اس زمانے کے رواج کا خیال رکھا گیا ہے۔

در راہ مہر

یہ ڈرامہ "ایران کوہ" کے پہلے شمارے میں 1313 ش میں شائع ہوا تھا۔ فہرست میں لکھا تھا کہ یہ ڈرامہ پانچ پردوں میں منقسم ہے تین پردے اس شمارے میں شائع ہوئے ہیں اور باقی دو آئندہ شماروں میں شائع ہوں گے۔

ڈرامہ کا خلاصہ یہ ہے مسجد کا ایک منظر پیش کیا ہے جس میں امام مسجد لوگوں کو فرمان خداوندی بجا لانے اور نیک عمل کرنے کی نصیحت کرتا ہے اسی مجلس میں محتسب اور اس کے رفقائے کار بھی موجود تھے اس کو بھی خبردار کیا اور بتایا کہ شہر میں شراب خوری اور بدمعاشی عام ہے۔ اس لئے سختی سے کام لے کر ان بدعنوانیوں کو روکنا چاہئے دوسرے منظر میں ایک نوجوان کو ایک گلی میں دکھاتے ہیں جسے مصنف نے کوے جاناں کا نام دیا ہے۔ نوجوان کشکول میں شراب پیتا ہے۔ اپنے محبوب کے دروازے پر جا کر آواز دیتا ہے وہ باہر نکلتی ہے اور اس کو اپنے

گلے کا ہار دیتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے یہ اس کے دروازے پر بے ہوش پڑا رہتا ہے۔ محتسب کا رفیق کار فقیر کے لباس میں اس گلی میں پہنچتا ہے جوان اس کو بھی زبردستی شراب پلاتا ہے۔ لیکن وہ شخص محتسب کو اس نوجوان کے متعلق اطلاع دیتا ہے۔ محتسب اس کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتا ہے مسجد میں مجلس برخاست ہونے کے بعد ایک اور منظر کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک امیر آدمی مصلے پر بیٹھ کر دعا مانگتا ہے کہ اے خدا دنیاوی آرام و آسائش کے تمام اسباب تم نے عنایت کئے ہیں لیکن میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ تو کون ہے' کیا ہے اور کہاں ہے۔ میں کون ہوں اور کیا ہوں یہ جزاء اور سزا کیا ہے۔ اگر ہماری قسمتیں تو نے بنائی ہیں تو پھر حساب اور سزا کیسی؟ اگر تو جانتا ہے تو پھر آزمائش کیوں کرتا ہے۔ اگر تو توانا ہے' تو برائی کیوں ہونے دیتا ہے۔ کسی کو عزت دیتا ہے کسی کو ذلت۔ اے خدا ان اسرار کو واضح کر۔ اسی جگہ کچھ دور ایک رند بھی کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔ وہ بھی امیر کو سنانے کے لئے دعا مانگتا ہے۔ اے خدا میں خوش و خرم ہوں۔ تو نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے میں سب کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے کچھ نہیں پوچھتا اور کوئی جواب نہیں مانگتا تو بن مانگے دیتا ہے جو کوشش کرتا ہے تو اس کو زیادہ سے زیادہ دیتا ہے۔ امیر رند کی باتوں پر متوجہ ہوتا ہے اور اس سے راہنمائی کی درخواست کرتا ہے۔ رند اس کو بتاتا ہے کہ یہ راہ کٹھن ہے۔ تم گمراہ ہو تمہاری آنکھیں حقیقت کو نہیں پاسکیں۔ اگر تم تیار ہو تو میں اس کو آشکار دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ امیر رند کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ دوست محتسب جو مسجد کے ایک گوشے میں چھپا ہوا تھا۔ رند کی یہ عیاری دیکھ رہا ہے جب وہ محتسب کو ملتا ہے اور شرابخوروں کی گرفتاری کی اطلاع پاتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ یہ حال جو میں نے دیکھا ہے اس کے روکنے کے لئے قید و بند ناکافی ہے کسی اور سزا کی ضرورت ہے۔

اگلے منظر میں رند امیر کو ایک خاص مقام پر لے جاتا ہے جس کو مصنف نے دلستان کہا ہے وہاں وہ امیر کو مختلف مناظر دکھاتا ہے۔ پہلا منظر ایک مدرسہ کا ہے جہاں استاد کچھ پڑھا رہا ہے۔ شاگردوں میں جوان اور بوڑھے بھی ہیں۔ وہ استاد کی ایک بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ استاد ان کو بے شرم اور گستاخ کہہ کر چپ کراتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے استاد سے یہی سنا ہے۔ اگر تم نہیں مانتے تو گمراہ اور بددین ہو۔ اتنے میں ایک شخص آکر اطلاع دیتا ہے کہ باہر ایک بے دین شخص گیت گارہا ہے۔ استاد شاگر یک زبان ہو کر پکارتے ہیں اس کو مار ڈالو۔ چنانچہ آن کی آن میں اس بیچارے کو قتل کر دیتے ہیں۔ رند امیر سے پوچھتا ہے بتاؤ کیا دیکھا وہ جواب دیتا ہے "دین" دوسرے منظر میں ایک حلبی کو خط پڑھتے دکھاتے ہیں۔ امیر حلب اس سے خط چھین کر خفا

ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ آخر دھمکیوں کے بعد وہ بتاتا ہے کہ لکھنے والا ایک عجمی ہے چنانچہ عجمی کو گرفتار کر لیتے ہیں اور حلبی شرمندہ ہو کر سر کو جھکا لیتا ہے۔ رند نے امیر سے پوچھا کیا دیکھا وہ کہتا ہے "جان" تیسرے منظر میں ایک لڑکا اور لڑکی چھپے چوری رات کے وقت پیار کی باتیں کرنے آتے ہیں۔ اتنے میں لڑکے کا باپ آپہنچتا ہے۔ لڑکی چلی جاتی ہے لڑکا لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ باپ اس کو بھیج کر ایک طاقچہ کو کھول کر اشرفیوں کو باہر نکالتا ہے دیکھتا ہے اور پھر اسی جگہ بند کر کے چلا جاتا ہے لڑکا اسی جگہ پہنچ کر طاقچہ کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے اندھیرے میں آواز سن کر باپ داخل ہوتا ہے اور لڑکے کے سر پر ڈنڈا مارتا ہے جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ رند امیر سے پوچھتا ہے تو نے کیا دیکھا۔ امیر کہتا ہے "مال" چوتھے منظر میں ایک جوان اپنے باپ بادشاہ کو قتل کرتا ہے تاکہ اس کے بعد خود بادشاہ بنے رند پوچھتا ہے کیا دیکھا۔ امیر کہتا ہے "نام" پانچویں منظر میں ایک نوجوان مرد عورت ہم آغوش ہوتے ہیں۔ ایک بڑھیا ان کو دیکھ لیتی ہے۔ رسوائی کے خوف سے بڑھیا کو اخفائے راز کے لئے عورت پہلے انگوٹھی پیش کرتی ہے پھر گلوبند جب وہ راضی نہیں ہوتی تو اس کو قتل کر دیتی ہے۔ رند پوچھتا ہے کیا دیکھا۔ امیر جواب دیتا ہے "ننگ" اس کے بعد رند اسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ دیکھا جان کے لئے کتنے بندھن ہیں اور ان سے رہائی کا ایک راستہ ہے داروے ہشیاری یعنی شراب پیو اور ان غموں کو بھلا دو چنانچہ ساز بجتے ہیں۔ ایک ماہ پارہ آکر شراب پیش کرتی ہے۔ امیر جھجک کے بعد پی لیتا ہے رند کہتا ہے دیکھا نشہ سے بے خود ہو گئے۔ اکنون در خود دیداری ہشیاران رادرین پردہ رہی نیست! آخری سین میں ایک شمع جلتی ہوئی دکھاتے ہیں۔ رند بتاتا ہے دیکھو یہ ہے زندگی "خندان بہردگر سوزان۔"

یہ ڈراما غور و فکر کی دعوت دیتا ہے مصنف نے دو نقطہ نظر پیش کئے ہیں بعض ایسے اشخاص ہیں جو محض عیاشی کی خاط شراب پیتے ہیں اور مستی میں آکر اپنے محبوب سے لذت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قانون کے محاسب ایسے لوگوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیتے ہیں لیکن اس کے مقابل ایسے اشخاص ہیں جو دنیا میں لوگوں کو قتل کرتے۔ جھوٹی عزت اور جھوٹے نام حاصل کرتے چھپے چوری داد عیش دیتے اور روپیہ انبار کرتے دیکھتے ہیں تو بیزار ہوتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے اسرار کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے دل و دماغ میں ایک کشمکش رہتی ہے۔ یہاں پہنچ کر مصنف نے خیام و حافظ کے نظریہ کی ترجمانی کی ہے کہ پیو پلاؤ اور زندگی کے راز مت ڈھونڈو۔ دنیا کے غموں کو شراب میں بھلا دو۔ اس میں زندگی کا مزہ ہے۔ ایسے خیالات رکھنے

والوں کے خلاف پولیس بھی سوچ میں پڑگئی ہے کہ ان لوگوں کا کیسے سدباب کیا جائے لیکن ڈرامے میں دوست محتسب نے یہ خیال اس وقت ظاہر کیا ہے جب وہ مسجد میں خواجہ (امیر) اور رند کی گفتگو سن سکتا ہے لیکن رند نے جن مناظر کو دیکھا کہ خواجہ کو شراب پینے اور راگ رنگ کی محفل میں شریک ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ وہ نہ محتسب نے دیکھے ہیں اور نہ دوست محتسب نے۔ اس لئے ڈراما میں تصادم پہلے شرابی کی سزا پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے مصنف کی فکر کے پس منظر میں یہ خیال کارفرما ہو کہ علماء منبر پر شراب خوری اور رندی کو روکنے کے لئے محتسب کو اکساتے ہیں لیکن عام سوسائٹی میں اور خود علماء دین میں جو تعصب اور جرم پھیل رہا ہے وہ دین و دنیا سے بیزاری کا سبب بن رہا ہے جب تک اس طوفان کو نہ روکا جائے اس گرداب سے بچاؤ مشکل ہے۔

ٹیکنیک کے لحاظ سے یہ ڈرامہ مکمل نہیں ہوا۔ پلاٹ کے دو حصے معلوم ہوتے ہیں پہلے میں مسجد کا منظر اور کوئے جاناں کا منظر اور جوان کی سزا۔ دوسرے حصے میں رند و خواجہ کی گفتگو اور بعد میں رند کے پیش کردہ مختلف مناظر اور خواجہ کی شراب آلودگی۔ کردار نگاری کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مصنف کے سامنے اکثر چند فرضی اشخاص ہیں جنہیں شاعرانہ اور متصوفانہ روایتی تخیل کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔

مصنف سٹیج کی ٹیکنیک سے واقف ہیں۔ ایکٹروں کی حرکات کے لئے ہدایات ساتھ ساتھ لکھی ہیں۔ مکالموں سے زیادہ مواقع (SITUATIONS) کا بیان زیادہ ہے۔ ڈرامے کی زبان خالص فارسی ہے۔ اکثر مکالمے تھیٹریکل انداز کے ہیں انداز نظم عاری کا ہے۔

علی نصر

علی نصر کاشان کے مشہور سادات خاندان سے ہیں۔ 13 رمضان 1311 ہجری کو تہران میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی ولی اللہ نصر سے حاصل کی۔ جب مدرسہ علمیہ شروع ہوا تو اس میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد مدرسہ الیانس میں فرانسیسی زبان و ادبیات کا مطالعہ کیا۔ ابھی جوان ہی تھے کہ اسی مدرسہ میں ادبیات فارسی پڑھانے کے لئے معلم مقرر ہو گئے۔ بعد میں سالہا سال تک مدرسہ نظام' مدرسہ علوم سیاسی اقدسیہ میں فرانسیسی ریاضی اور علوم طبیعی پڑھاتے رہے اور اس زمانے میں تقریباً مختلف مضامین پر 19 کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان میں زیادہ اہم یہ ہیں۔

تاریخ انقلاب فرانسہ' تاریخ ایران و دنیا' کتاب فزیک' حساب' حفظ الصحہ' علم الاشیاء (جلد 6) اور ہنر آموز دوشیزگان (6جلد)

تعلیم و علم کی زندگی کے بعد جب وہ وزارت مالیہ میں ملازم ہوئے تو انہوں نے اجتماعی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ چند ایک روشن خیال دوستوں کے ہمراہ ڈرامے سٹیج کرتے اور ان کی آمدن خیراتی کاموں پر صرف کرتے۔ مدرسہ کھولتے یا لائبریریوں کی بنیاد رکھتے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عوام کے فکر و نظر کی اصلاح کے لئے تھیٹر ایک موثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ تیاتر ملی' کے نام سے ایک تھیٹر کی بنیاد رکھی اور اس کے ذریعہ ملک و ملت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ایک سال کے لئے علی نصر یورپ گئے اور وہاں فن تیاتر کا مطالعہ کیا۔ واپس آکر 1295 شمسی میں کمڈی ایران کے نام سے ایک اور تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد رکھی اور صحیح معنوں میں اروپائی انداز پر ڈرامے لکھنے اور سٹیج کرنے شروع کئے۔

جب وہ حکومت کے مختلف عہدوں پر متعین ہوئے اور ان کی مصروفیات بڑھ گئیں تب بھی فرصت کے اوقات میں تھیٹر سے دلچسپی رکھتے رہے وہ معاون وزیر پیشہ وہنر۔ وزیر کشور و اقلی مازندران۔ وزیر پست و تلگراف کے عہدوں پر سرفراز رہے اور آخر میں پہلے چین میں اور بعد میں پاکستان میں ایران کے پہلے سفیر کبیر متعین ہوئے۔ اس وقت پنشن پا کر استراحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

1318 شمسی میں انجمن پرورش افکار قائم ہوئی۔ اس کے سات شعبے تھے شعبہ نمائش کے صدر علی نصر مقرر ہوئے۔ انہی کی تجویز سے تہران میں فن تیاتر کی تعلیم و تربیت کے لئے

ہنرستان ہنر پیشگی کے نام سے ایک مدرسہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے وہ خود بھی اس مدرسہ میں تاریخ نمائش، لباس، تزیینات، طرز بیان اور د شناسی پر لیکچر دیتے رہے۔ ایران میں وہ ماڈرن تھیٹر کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کو "پدر تیاتر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان کی چھوٹی بڑی تالیفات و تصانیف کی تعداد 206 تک پہنچتی ہے۔ اس میں ان کے مقالات، مفصل تقریریں، مشہور روزنامچے اور مختلف ممالک کے سفرنامے بھی شامل ہیں۔ ان کے مترجمہ اور مصنفہ ڈراموں کی کل تعداد 68 اور مونولوگ کی 32 ہے۔

ان کے مصنفہ ڈرامے مندرجہ ذیل ہیں۔

حاجی حکیم باشی، حسن رعیت، روزنامہ زوزنم، تاا۔بنجوریم ہمین است، کورش کبیر، درجزیر لیلوپتھا، طلسم خانہ بزرگ، خانم خانہ دار، سہ خواہر نجول، یتیم، آشتی کنان، زن وشوہر، زندگانی فردوس، گلنار ونوروز، نتیجہ تعدد زوجات، عروس حسین آقا، مفت خوریم و طفیلی وای بر من بہ تو، وای بہ در کوچہ، مواصلت اجباری، من باید وکیل بشوم، طبیب قدیم وجدید، ہفت سین عید نوروز، نتیجہ بی سوادی درزناں، انوشیروان و تاج گزاری پسرش راسپوتین، زندگانی آقا محمد، عروس حمیدہ بالسپر عوش، یعقوب لیث، کریم خان زند، نادرشاہ، فتنہ، رستم و سہراب، ملکشاہ، طمع، ندای وجدان، پیک نیک بیچارہ، دکتر، مردہاا۔بنجور ند۔

ان ڈراموں کے ناموں سے ہی ان کے مضامین عیاں ہیں۔ بعض تو تاریخی ہیں جن سے مقصد اسلاف کی عظمت دکھا کر لوگوں میں خود اعتمادی اور وطن پرستی کے جذبات ابھارنا تھا۔ بعض اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مقصدی اور تعلیمی ڈرامے ہیں۔ بعض میں تو جذبہ اصلاح اتنا کار فرما ہے کہ ڈرامے محض مکالمے بن کر رہے گئے ہیں۔ ان میں حرکت نہیں۔ چند شخص اکٹھے بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہیں۔ اکثر ڈراموں میں پلاٹ کی گرفت کمزور نظر آتی ہے اور جب کبھی ان کی اس ٹیکنیکی خامی کی طرف اشارہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ میں نے ڈراما کی وساطت سے چھ آدمیوں کو شراب پینے، افیون کھانے اور غیر محرم عورتوں کے پیچھے جانے سے روکا۔ یہی میری خدمت ہے ان کا صرف ایک ڈرامہ، عروسی حسین آقا، بنیاد نمائش در ایران میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کے قلمی نسخوں سے صرف دو تین ڈرامے اور کچھ پیش پردے، لے کر پڑھ سکا تاکہ ان کا تعارف ہو سکے۔

کورش کبیر

چار پردوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں کورش کے بچپن کا حال ہے۔ اس کے دادا نے خواب

دیکھا کہ اس کی لڑکی کے بطن سے پانی نکلا ہے جس نے تمام دنیا کو احاطہ کر لیا ہے پھر دوسری مرتبہ خواب دیکھا کہ ایک درخت اگا ہے جس کی شاخیں اور پتے سارے جہان پر چھا گئے ہیں۔ نجومیوں نے تعبیر بتائی ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بادشاہ کی سلطنت الٹ دے گا اور تمام سرزمین پر قابض ہوجائے گا۔ جب نواسہ پیدا ہوا تو اس خطرکے کی بناپر کہ کہیں وہ خواب سچا نہ ہو جائے بادشاہ کے حکم سے وزیر نے بچے کو شاہی چرواہے کے حوالے کیا کہ اس کو ہلاک کر کے چیلوں گدوں کے سامنے ڈال دے۔ اتفاق سے چرواہے کے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوا تھا اس نے کورش کو بچالیا اور اپنے بچے کی ہڈیاں وزیر کو لا کر پیش کر دیں۔ بچہ دس سال کا ہوگیا۔ بادشاہ کے دل میں اب بھی تشویش تھی۔ ایک دن اتفاق یہ ہوا کہ شاہ بازی میں کورش بادشاہ انتخاب ہوا۔ اس نے اپنے حکم کی نافرمانی میں وزیر کے بیٹے کو ڈنڈوں سے پٹوا ڈالا۔ دوسرے پردے میں بادشاہ کا دربار ہے۔ وزیر نے بیٹے کو بادشاہ کے حضور لے جا کر شاہی چرواہے کے خلاف شکایت کی چرواہا اس کی بیوی اور کورش پکڑے آئے۔ بچے کی ہوشیاری اور معقول باتیں سن کر بادشاہ کو شک ہوا۔ تنہائی میں بادشاہ کے سامنے چرواہے کو اصل ماجرا کہنا پڑا۔ بادشاہ تقدیر کی اس کارفرمائی پر مجبور ہو گیا۔ تیسرے پردے میں کورش کو فاتح کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ شوش، ارمنستان اور لیدی کے بادشاہ اور ان کی بیویاں گرفتار ہو کر حاضر ہیں۔ وہ ان کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہے اور مہربانی سے پیش آتا ہے۔ عورتوں کو آزادی دیتا ہے اور دوسرے بادشاہ اپنی اطاعت گزاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ چھوتھے پردے میں کورش تمام اقالیم مفتوحہ کے بادشاہوں کے سامنے اپنی سلطنت کی وسعت، امن و امان اور نظام جہانداری کی باتیں کرتا ہے اور سب کے سامنے اپنے بیٹے کمبودیا کے سر پر تاج شاہی پہناتا ہے۔

ڈرامائی عمل کے لحاظ سے چاروں پردوں میں حرکت ہے اور دلچسپی بھی ہے۔ پہلے پردے میں عورتیں کنوئیں پر پانی بھرنے آتی ہیں اور شاہی چرواہے کی بیوی سے کورش کا راز پوچھتی ہیں کیونکہ اس میں اور ماں باپ میں کوئی مشابہت نہیں ۔ اس اثناء میں چکور زن آنکلتا ہے مرد عورتیں مل کر رقص کرتے ہیں۔ اس کے بعد بچوں کے کھیل کا منظر ہے۔ دوسرے ایکٹ میں چرواہا بیوی اور کورش بندھے ہوئے آتے ہیں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ ان سپاہیوں کو سزا ملتی ہے جنہوں نے قیدیوں کو مارا تھا اصل راز کھلتا ہے۔ کورش کی ماں کو بلاتے ہیں۔ وہ بچے کو دیکھ

کر بیہوش ہو جاتی ہے تیسرا پردہ بھی حرکت سے مالا مال ہے۔ سواریاں' شہزادیاں' بادشاہ' سپہ سالار حسن وزیبائش' قیدی وغیرہ تماشائیوں کی توجہ مبذول رکھتے ہیں۔ چوتھے پردے میں زیادہ حرکت اور عمل نہیں محض تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی ہے۔

چونکہ یہ ایک تاریخی داستان ہے اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ کورش کبیر کی زندگی کے مختلف گوشے سامنے آجائیں۔ تماشائیوں کے سامنے ایرانی شہنشاہ اور ایرانی سلطنت کی عظمت نمایاں ہو اور ان میں وطن پرستی اور اخلاف پرستی کے جذبات ابھارے جائیں۔ چنانچہ کورش کی زبان سے ایسے کلمات نکالے ہیں کہ میں ایسی وسیع اور عظیم الشان سلطنت چھوڑ چلا ہوں۔ اب میری اولاد اور ایرانیوں کا فرض ہے کہ اس کی عظمت کو برقرار رکھیں اور اپنی جانیں قربان کریں۔ تیکیکی اعتبار سے ہم اس قسم کی تاریخی داستانوں کو ڈرامہ نہیں کہتے ہیں۔ اس میں کوئی مسلسل کہانی نہیں ہے کہانی کا ارتقاء کشمکش اور چڑھاء اتار بھی نہیں۔ ڈرامہ تو نام ہی دو قوتوں کے ٹکراؤ کا ہے۔

مکالے تقریباً یکساں ہیں۔ بچے سے لیکر چرواہے اور عورتوں سے لے کر بادشاہ وزیر اور سپہ سالار تک ایک جیسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ کا انداز کہیں کہیں شاہانہ ہے۔ خیر مکالموں کی یکسانیت قابل اعتراض نہیں کیونکہ سب لوگ اعلیٰ طبقہ کے افراد ہیں لیکن جب دس سالہ چرواہا بچہ متعلق سیاست اور استواء جیسے کلمات بولتا ہے تو اس کی زبان پر یہ الفاظ کھٹکتے ہیں۔ یہ بچہ ایسے بولتا ہے جیسے ایک حکمران بزرگ دانا گفتگو کرتا ہے جابجا کرداروں کی زبان سے شاہنامہ کے اشعار پڑھوائے ہیں جو بعض مقامات پر نامناسب اور نامتناسب ہوگئے ہیں۔ کورش عشق اور فرض پر بات کہتا کہتا مثنوی پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے پردے میں لڑکیاں پنگھٹ پر آتی ہیں جو شعر پڑھتی ہیں وہ بھی سب مثنوی کے اشعار ہیں۔ اس مقام پر کوئی موزوں راگ گائے جاسکتے تھے۔ مثنوی اور رقص دو انمل باتیں ہیں۔

گلنارونوروز

تین پردوں کا ڈرامہ ہے۔ عنوان سے ایسا معلوم ہوتا ہے شیریں خسرو کی طرح کوئی عشقیہ قصہ ہوگا مگر ایسا نہیں ہے یہ ایک میاں بیوی کی داستان ہے۔ موضوع یہ ہے کہ وہ اجنبی شخص ایران کی سرحد کے اس پار سے چھپے چوری داخل ہو کر نوروز کو روپیہ کا لالچ دے کر چاہتے ہیں کہ

اس کے ذریعے سرکاری معلومات حاصل کریں یعنی وہ خط جو اس کے والد گاؤں کے نمبردار کو آتے رہتے ہیں وہ ان کے متعلق اطلاعات پہنچاتا رہے۔ ان اجنبیوں کی حرکات اور نوروز سے دوستی اور تنہائی میں ملاقاتوں کو دیکھ کر گلنار کو شبہ ہوتا ہے اور وہ اپنے شوہر کو متنبہ کرتی ہے۔ تاکہ وہ ان کے پھندے میں نہ آجائے۔ نوروز علی ہزاروں ریالوں کی طمع کے مقابلے میں اپنے اندر کشمکش پاتا ہے لیکن آخر میں وطن کے خلاف غداری کرنے سے رک جاتا ہے۔

پہلے پردے میں جشن عروسی منایا جاتا ہے۔ دوسرے پردے میں نوروز کی اجنبیوں کے ساتھ خفیہ ملاقات ہوتی ہے۔ گلنار چارپائی کے نیچے چھپ کر ساری گفتگو سنتی ہے۔ تیسرے پردے میں گاؤں کے باہر نوروز علی تنہا رات کے وقت پاگلوں کی طرح گفتگو کرتا ہے۔ دو اجنبی آکر پھر اس کو پھسلاتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے مادر وطن ایک تمثیلی صورت بن کر اس کے سامنے آتی ہے اور اس کو صبر و حوصلہ کی تلقین کرتی ہے اور وطن سے غداری کرنے سے روکتی ہے بعد میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے گلنار فریدوں یعنی نوروز کے والد اور عبدالخالق رئیس محضر ذیلدار آپہنچتے ہیں ڈرامہ سرود ملی پر ختم ہوتا ہے۔

ڈرامے کا پہلا حصہ تو حرکت و عمل رکھتا ہے اور تعطل کی وجہ سے جاذب بھی ہے لیکن آخر میں مادر وطن کی نمود سے تو ماورائی عنصر داخل ہوگیا ہے۔ اور حقیقت خیالی اور مصنوعی صورت میں آگئی ہے موضوع کی افادی حیثیت واضح ہے۔ عورت کا کردار دل پسند ہے۔ وہ دلہن کے ساتھ ساتھ مضبوط ارادے کی مالک ہے۔ وہ اپنے خاوند کو جاسوسوں کے دامن میں گرفتار ہوتے ہوتے بچاتی ہے۔ یہ ایک متوسط درجے کا ڈرامہ ہے۔

حسن رعیت

یہ بھی تین پردوں میں منقسم ہے۔ ڈرامے کا موضوع کاشت کاروں پر زمینداروں اور مالکوں کا ظلم وستم ہے۔ حاج قہار خاں مالک ظلم آباد ہے۔ دو ایک اس کے حواری ہیں۔ دو ایک نوکر ہیں اور دوسری طرف حسن بیچارہ رعیت یعنی کاشت کار ہے اس کی بیوی اور تین بچے ہیں۔ مالک عیش و عشرت میں مگن ہے۔ اپنے بچے کا جشن ختنہ منا رہا ہے۔ حسن کے بھتیجے کی بیوی کے حسن کا چرچا سنا تو اس کو زبردستی چھین کر اپنے گھر میں لا ڈالا۔ حسن اور اس کی بیوی بچے افلاس اور تنگ دستی کی حالت میں بھوک کی وجہ سے بیتاب ہیں۔ ایک بچے کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ وہ بھی بخار

سے جان دے دیتا ہے۔ مالک کے حواری حسن کو اس قدر پیٹتے ہیں کہ وہ بھی نڈھال ہو کر جان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا قصور یہ ہے کہ وہ زمینداروں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس کی بیوی بچے بے کس و تنہا رہ جاتے ہیں۔ یہ پردہ جس میں حسن اور اس کے گھربار کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ تاثر خیزی کے اعتبار سے خوب ہے۔ باقی دونوں پردوں میں مذاق ہے پھلیں ہیں۔ مالک اور اس کے حواریوں کی بدمذاقی دکھائی گئی ہے اور رقص و سرود ہے۔

کار آگاہ یعنی تفتیش کنندہ

عام محاورہ میں سی آئی ڈی پولیس یہ ڈرامہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حسین مکار عورت اپنے چار مرد ساتھیوں اور ایک خادمہ کے ہمراہ زندگی بسر کرتی ہے۔ لوگوں کے مال و دولت پر ہاتھ صاف کرتی ہے اور بعض اوقات قتل تک بھی نوبت آجاتی ہے فکور رئیس کار آگاہ اور اس کے پانچ ساتھی کئی مرتبہ اس سے زک اٹھا چکے ہیں اور اس کو گرفتار کرنے میں ناکامیاب ہو چکے ہیں۔ لیکن آخر رئیس کی چالاکی اور ہوشیاری سے وہ بھیس بدل کر اس کا سراغ نکالتے ہیں اور رات رات پہنچ کر اس کو اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ کہانی کا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بدی کا انجام برا ہوتا ہے اور ہر برا شخص اپنی سزا کو پہنچتا ہے۔ یہ ایک جاسوسی افسانہ ہے اور مصنف نے اس کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اچھا خاصا دلچسپ ہے۔ عمل ہے' حرکت ہے' پلاٹ میں بھی گرفت موجود ہے۔

ایک پردہ تمثیلیں

میں صرف ان کے دو' ایک پردہ ڈرامے پڑھ سکا ہوں۔ طلسم خانم' بزرگ اور مردہا ا۔بنجورند' اول الذکر کہانی یوں ہے۔ میاں' بیوی کے خلاف خیانت کرتے ہیں اور دوسری کسی عورت کے پیچھے جاتے ہیں۔ بیوی اور اس کی بہن ایک مرتبہ ان کو کان سے پکڑ کر گھر واپس لاتی ہیں۔ یہ دونوں بہنیں بھی ایک معلم موسیقی سے سبق پڑھتی ہیں اور کچھ ان کی طرف مائل بھی ہیں۔ خانم بزرگ یعنی دادی اماں کو میاں بیوی کی باہمی خیانت کا پتہ چلتا ہے تو وہ ایک سفید پانی کی بوتل بھیجتی ہے یہ کہہ کر کہ یہ طلسمی بوتل ہے جو شخص خیانت کر کے گھر آئے گا فوراً اس کا پانی سیاہ

ہو جائے گا۔ اتفاق سے خاوند اپنی محبوبہ سے ملنے جاتے ہیں بعد میں معلم موسیقی آتے ہیں۔ دونوں بہنیں ان کے ساتھ باغ میں چلی جاتی ہیں۔ گھر کا نوکر جو ان کے راز سے واقف تھا۔ وہ یہ چال چلتا ہے کہ پانی میں ایک بوتل میں سیاہی ڈال دیتا ہے۔ جب خاوند گھر لوٹتا ہے تو پانی کا رنگ سیاہ دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے اور باہر پانی لینے جاتا ہے تاکہ بوتل کا پانی عوض کر دے۔ اتنے میں عورتیں باہر سے آتی ہے اور وہ بھی پانی کا رنگ سیاہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں وہ بھی دوسری طرف سے باہر پانی لانے کے لئے جاتی ہیں۔ ادھر سے خاوند اور دوسری طرف سے بیوی پانی کے برتن لئے ہوئے بوتل کے قریب پہنچتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے اس مختصر سی کہانی میں اصلاحی سبق تو ملتا ہے مگر مزاح و ظرافت کا رنگ زیادہ گہرا چھایا ہوا ہے۔ مصنف آدمیوں اور عورتوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتا ہے اور ان سے کام لیتا ہے کہانی بذات خود مصنوعی اور غیر حقیقی ہے اور موجودہ دنیا میں اس قسم کا بدھو آدمی ملنا مشکل ہے۔ لیکن ڈرامہ نگار کا مقصود ہنسنا ہنسانا اور ساتھ ہی اخلاقی سبق سکھانا ہے۔ اس لحاظ سے یہ گڑیوں کا کھیل کامیاب ہے۔ ڈرامے میں کہانی پلاٹ ٹکراؤ سب کچھ ہے۔ حرکت اور دلچسپی ہے۔ گرفت میں ڈھیلا پن نہیں۔

مردہا ا۔بنجورند' میں ایک عورت اپنی سہیلی کے پاس جاتی ہے۔ گرتی پڑتی ہانپتی کانپتی بار بار بے ہوش ہوئی جاتی ہے۔ اور اپنا قصہ بیان کرتی ہے۔ کہ اس کا شوہر کسی اور عورت سے وابستہ عیش مناتا ہے۔ اس لئے اس کی زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے۔ سہیلی حوصلہ دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ تم صبر سے کام لو۔ یہ تمہارا ہی قصور ہوگا تم اس کی خاطر خواہ خدمت نہیں کرتی ہوگی۔ دیکھو میرے شوہر کتنے اچھے اور محبت والے ہیں کیا مجال کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔ میں نے کیسے ان کو اپنے بس میں رکھا ہوا ہے۔ آپسی گلوں شکوؤں کے بعد عورت اپنی سہیلی کو وہ خط دکھاتی ہے جو اس نے میز کے دراز سے نکال کر پڑھا ہے اور اس کی محبوبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ سہیلی خط پڑھتی پڑھتی جب آخر تک پہنچتی ہے تو بے ہوش ہو جاتی ہے اب اس عورت کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور پانی چھڑک کر اس کو ہوش میں لاتی ہے۔ معلوم ہوا اس خط میں عورت نے یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اپنے ہمراہ اس چھوٹے قد کے آدمی موٹی موٹی آنکھوں والے گھسی ہوئی چندیا والے کو بھی لانا۔ سہیلی کو جب یہ معلوم ہوا کہ خط میں جس شخص کی طرف اشارہ ہے وہ اس کا اپنا شوہر ہے بعد میں دونوں کہتی ہیں کہ سب مرد اسی طرح کے ہیں۔ کہانی میں ایک اچھا لطیفہ ہے اور دلچسپ ہے۔ اس کی دلچسپی کا دارو مدار عورتوں کی

ایکٹنگ پر منحصر ہے۔ مصنف نے ساتھ ساتھ جو ہدایات دی ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت اور لطافت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ان ایک ایکٹ کے ڈراموں سے مصنف کی فنی مہارت واضح ہے۔ وہ پلاٹ کی پوری گرفت سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ طربیہ **موقعیت** پیدا کرتے ہیں۔ ان کا ہنر نمایاں ہے۔ ایکٹروں کے لئے جو ہدایات مذکور ہیں ان سے بھی مصنف کی سٹیج سے آشنائی اور کردار ایکٹنگ کی معلومات پر روشنی پڑتی ہے۔

پیش پردہ

ایک قسم کے MONOLOGUES ہیں جو MONOOCTING کے لئے لکھے گئے ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے۔ پردوں کے توقف کے دوران میں کام لینے اور تماشائیوں کو متوجہ رکھنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یہ پردے سادگی زبان اور صراحت بیان کے اعتبار سے نثر کے بہترین ٹکڑے شمار ہونے کے قابل ہیں۔ ان مضامین سے ڈرامہ نگار کی وسعت نظر اور کردار فہمی کا سراغ ملتا ہے۔ مختلف قسم کے کردار زندگی کے چلتے پھرتے اشخاص اپنی حالت وکیفیت کے اظہار کے لئے اپنی حیثیت کا لباس پہن کر سٹیج پر آتے ہیں اور اپنی زندگی کا حال بیان کرتے ہیں اور اپنی عبرت ناک زندگی کا نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تاثر خیزی کے اعتبار سے یہ بھی ڈرامہ کی ایک قسم ہے مصنف نے اس کو مجموعہ لطائف کے نام سے اپنی بیاض میں لکھا ہے _ لطائف لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کے معنوں میں نہیں بلکہ لطائف کو ایک لطیف پر معنی اور نکتہ پرور بات کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف نے کردار مخصوص کے جذبات و احساسات تو سلیقہ ومہارت سے لکھ دیئے ہیں۔ اس کے بعد سٹیج پر ان کا صحیح اظہار ایکٹر کی مہارت پر منحصر ہے۔ ان میں پیش پردوں کو پڑھ لینے سے بھی لطف اور تاثر پیدا ہوتا ہے ان پردوں میں ثریا کی' طلاق' خیانت' بی خیریت' مدپرست' اور جمشید جون اپنے مضمون اور صراحت بیان کی وجہ سے بہترین کردار شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان تحریروں کا مقصد اجتماعی اخلاق کی اصلاح ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی یہ کامیاب چیزیں ہیں۔ محض ان نگارشات کو پڑھ لینے سے سماج کے ان گھناؤنے کرداروں کے خلاف تنفر اور حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ سٹیج پر اگر کوئی شخص اپنی آپ بیتی بیان کرے اور خود اپنی واردات کا حال اپنے پورے جوش تاثر اور پشمانیوں کے ساتھ بیان

کرے تو اس کی تاثر خیزی اور عبرت انگیزی میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔

رضا کمال شہرزاد

رضا کمال 1277 شمسی کو تہران میں پیدا ہوئے۔ شہرزاد ان کا تخلص تھا۔ ان کے والد میرزا حسن کمال الدولہ میرزا یوسف صدر اعظم کے دبیر مخصوص تھے۔ چار بھائیوں اور چار بہنوں میں شہرزاد سب سے چھوٹے تھے۔ چونکہ حسن و لطافت و نزاکت سے مالا مال تھے اس لئے سب کے چہیتے تھے۔ ناز و نعمت میں پلے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ موزوں شعر نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کا خط بھی خوب تھا۔ تصویریں بھی خوب بنا لیتے تھے۔ گھر کے افراد جب سردی کی راتوں میں آتشدان کے گرد بیٹھتے اور قصے کہانیاں کہتے تو شہرزاد الف لیلیٰ میں سے عذرا و عباس کا قصہ پڑھ کر سناتے اور جوان ہوئے تو بڑی اچھی عادتیں پائیں۔ شائستہ اخلاق سیکھے۔ سہ تار بجانا سیکھا۔ شطرنج میں مہارت حاصل کی۔ جرائد و مجلّات میں اپنی سرشار طبیعت سے نکلے ہوئے قطعات ادبی شائع کئے۔ فرانسیسی اور انگریزی ادبیات سے نظمیں بھی ترجمہ کیں۔ آسکر وائلڈ کے سالمہ کا ترجمہ شائع ہوا تو ان کی محبوبیت اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے علی دشتی کے ہمراہ روزنامہ "شفق سرخ" میں اور نظام وفا اور حبیب میکدہ کے ساتھ مجلّہ وفا میں کام کیا۔ 1298ء میں قفقازی ہنرمندوں نے تہران میں اوپیرا دکھائے تو شہرزاد کو بھی شوق ہوا۔ انہوں نے پری چہرہ و پری زاد اوپیرا لکھا اور مادام پری بابوف اور آقائی وریان کی رہنمائی اور دوسرے رفقاء کی اعانت سے سٹیج کیا جو نہایت مقبول ہوا۔ بعد میں انہوں نے قفقازی ڈراموں مثلاً افسانہ عشق' کمربند سحر آمیز اور اصلی وکرم کا ترجمہ فارسی میں کیا اور ان کے لئے موسیقی بھی خود لکھی اور بڑے شوق' جوش اور انہماک سے سٹیج کرانے میں حصہ لیا۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ اغراق آمیز تعریف سے ان کو مسرت بخشی۔ مجسمہ مرمر میں انہوں نے خود پارٹ ادا کیا جس سے ان کا نام زبان زد عام ہوگیا۔ 1309 میں انہوں نے اپنا سب سے چھوٹا ڈرامہ شب ہزار ویکم الف لیلیٰ سٹیج پر اس خوبصورتی سے پیش کیا کہ مدتوں اس کی یادیں محو نہ ہوئی۔

جوانی میں ہی ان کے حساس دل پر سخت صدمے ہوئے۔ ان کے والد' والدہ اور عزیز بہن کا انتقال ہو گیا اور وہ مغموم رہے چونکہ اس زمانہ میں عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ اس لئے اپنے ذوق

کی تسکین کی خاطر ان کو دل پسند بیوی بھی نہیں ملتی تھی۔ ایک مے فروش پارسی لڑکی سے محبت کا سلسلہ ہوا تھا لیکن اس کو پیغام دینے سے پہلے جب اس کے عزیزوں نے قرآن سے استخارہ کیا تو آیہ یاس نکلی جس سے انہوں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ یہی سال ڈرامہ کے زوال کے بھی تھے۔ حکومت کی طرفسے بے اعتنائی اور پولیس کے تشدد اور سنسر نے تھیٹر والوں کے جوش کو دبا دیا۔ لوگوں کی روحیں افسردہ ہو گئیں۔ شہرزاد نے بھی کنارہ کشی کر لی۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ بلدیہ میں اور پھر وزارت کشور میں ملازم ہو گئے اور ادارہ فنی میں کام کرتے رہے۔

اب ان کی زندگی میں غم والم چھا رہا تھا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد انہوں نے ہمیشہ سیاہ ماتمی لباس پہننا شرع کر دیا ہوا تھا۔ ان کے اشعار میں یاس و ناامیدی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس غم کو غلط کرنے کے لئے انہوں نے افیون بھی کھانا شروع کر دی تھی۔ ان کو چند ایک دوست بھی ایسے ملے جو خود زندگی کو موت پر ترجیح دیتے تھے پانچ آدمیوں نے اکٹھے بیٹھ کر خود کشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک کے سوا باقیوں نے اپنے ارادہ پر عمل کیا۔ دوسرے تین آدمیوں کے نام یہ ہیں۔ مجتبی طباطبائی، سید رضا خاں اور حبیب میکدہ۔

شہرزاد کے ایک نوکر تھے۔ جن پر ان کو بہت اعتماد تھا ایک مرتبہ ان کی بہن کا ایک پرس قیمتی چیزوں کے ساتھ گم ہوا۔ سب نے اس پر شک کیا۔ اس لئے کہ شہرزاد کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگے۔ بات آئی گئی کر دی لیکن نوکر کے باپ نے شہرزاد کو بتایا کہ اس نے اس کی بد عملیوں کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیا تھا تو ان کا اعتماد شک میں تبدیل ہو گیا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہی چور تھا۔ اس لئے اس کو نکال دیا۔ شہرزاد نے کہا۔ "اس کے بعد دنیا میں کسی شخص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔" کچھ دنوں بعد جب شہرزاد دفتر گئے تو اس نوکر کو اپنی کرسی پر بیٹھے پایا۔ اس نے کہا متعلقہ دفتر نے حکم دیا ہے کہ تم فوراً اپنا کام اس کے سپرد کر دو۔ شہرزاد یہ سن کر گھر چلے آئے اور پھر نہیں گئے اور رات کوئی زہریلی دوا پی کر خود کشی کر لی اور ایک حسین زندگی بری طرح خاک میں مل گئی۔ یہ بیس شہرپور 1316 کی رات کا واقعہ ہے (1937ء) انہوں نے اپنی تمام تصانیف و تالیفات ایک صندوق میں بند کر کے مہر لگا کر اپنے بھائی کے حوالے کرنے کی وصیت کی تھی لیکن دوستوں کے تقاضا کے بعد ان کے بھائی نے صندوق سے وہ نوادر کھولنے کی اجازت نہ دی اور وہ خود بھی اس دنیا سے چل بسے اس لئے ان کی نامطبوعہ چیزیں ابھی تک کسی کے ہاتھ نہیں لگیں۔ ڈاکٹر ابوالقاسم جنتی جنہوں نے ان کے دوستوں اور عزیزوں سے مل کر ان کے حالات جمع کئے اور ان کی کچھ چیزیں حاصل کر کے کتاب شائع کی وہ بھی ابھی ان کی باقی ماندہ تصانیف حاصل کرنے

میں کامیاب نہیں ہوئے۔

شہرزاد ایک لطیف شاعر بھی تھے اور نقاش بھی موسیقی بھی لکھتے تھے اور ساز بھی بجاتے تھے۔ قدرت نے ان کو احساس دل ودماغ بھی عطا کیا تھا اور یہ سب چیزیں ایک شخص کو ڈرامہ نگار بنانے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی خوب تھا۔ فرانسیسی ادبیات پر انہیں بڑا عبور تھا۔ یونانی اصنامیات سے بھی وہ خوب واقف تھے۔ روزنامہ ایران نے لکھا کہ شہرزاد اپنے ہموطنوں میں بے شک بہترین اور بزرگ ترین ڈرامہ نگار شمار ہوتے ہیں۔

ان کی نثر کا اسلوب بھی نہایت خوبصورت تھا۔ شاعرانہ نثر لکھنے میں ان کو کمال مہارت تھی۔ اپنے تخیل سے نثر میں جادو پھونکتے تھے ان کی نثر اشعار کی طرح لذت بخشتی تھی۔

ڈرامہ میں اس کی تصانیف اور تالیف مندرجہ ذیل ہیں۔

ترجمے

1-	سالمہ	از آسکر وائلڈ	1301
2-	افسانہ عشق	نامعلوم	1306
3-	ستارہ شرق	(اصلی و کرم) از عزیز حاج بیگ آف	1307
4-	شہیدہ	مصنف نامعلوم	1307
5-	کمربند سحر آمیز	از بانو آقابابوف	1308
6-	ساغر و لب	از لفرو دوسوسہ	1311

ڈرامے

1-	شب ہزار و یکم الف لیلیٰ	1309	
2-	عباسہ خواہر امیر	1309	
3-	حرم خلیفہ ہارون الرشید یا عزیز و عزیزہ، ویکٹر ہوگو،		1316
4-	شاہزادہ خانم یک شہ		
5-	در ظلمت شب	از ژوزہ ژرمن	
6-	مجسمہ مرمر	1308	

-7 پری چہرہ و پری زاد 1299

-8 زردشت 1298

-9 وکتر از فرنگ آمدہ (کمڈی) 1303

-10 گلہائے حرم 1310

-11 عروس ساسانیاں یا خسرو شیریں (اوپیرا) 1310

-12 پروانہ زندگی بانو پروانہ 1307
(خوانندہ معروف)

-13 زنہای پاشا اپرت دریک تابلو

عباسہ

شہرزاد کا ایک طویل ایک پردہ ڈرامہ ہے عباسہ ہارون الرشید کی بہن ہے۔ جو خود جعفر کے عشق میں گرفتار ہے اور اس کے لئے بے چین ہے۔ ہارون نے ایک خوبصورت لڑکی ثریا کو پسند کر کے اس کو ہم سری کے لئے قبول کر لیا ہے اور محل میں رکھا ہے وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہے کہ اس سے پہلے وہ اپنے عم زاد حمید کی نامزد تھی جو اپنے باپ کے ساتھ عرصہ سے سفر تجارت پر گیا ہوا ہے۔ ثریا بھی اپنے نامزد کے فراق میں بیمار و مغموم رہتی ہے اور ہارون بھی اس کی بیماری سے ملول اور اداس رہتا ہے۔ طبیب اس کی بیماری سمجھنے سے قاصر ہیں۔ منظر کا آغاز یوں ہے۔ ایک رات عباسہ ہارون کی دعوت پر اپنے گھر بلاتی ہے اس کی آمد سے پہلے حمید ایک بڑھیا کی راہنمائی میں غلطی سے اس کمرے میں آنکلتا ہے۔ جہاں ضیافت کا سامان کیا ہوا تھا۔ عباسہ اپنی ندیمہ قمر کے ساتھ اپنے عشق کا حال بیان کر رہی ہوتی ہے حمید کو سفر سے واپسی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نامزد امیر کے ہاں چلی گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو کر اپنے عشق کی وارفتگی میں اپنی محبوبہ کو ملنے آگیا ہے۔ عباسہ اس کی درد ناک داستان سن کر اس کو محبوبہ سے ملانے کا وعدہ کرتی ہے اور اس کو پردے کے پیچھے چھپا دیتی ہے۔ پھر ثریا کو بلاتی ہے اور اتنے میں ہارون کی آمد سنائی دیتی ہے تو حمید و ثریا دونوں پردے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ امیر ثریا کی بیماری پر غمگین ہے۔ عباسہ اسے اطمینان دلاتی ہے کہ انشاء اللہ کل تک ثریا تندرست ہو جائے گی۔ ہارون اپنی مہربان بہن سے تسلی آمیز الفاظ سن کر کچھ سنبھالا لیتا ہے اور

شراب کے بعد بہن سے کوئی کہانی بیان کرنے کی درخواست کرتا ہے وہ حمید و ثریا کا قصہ دہراتی ہے اور آخر میں اس سے پوچھتی ہے کہ اگر ہارون خود اس امیر کے بجائے ہوتا جس نے کسی کی نامزد کو اپنے حرم میں داخل کر لیا ہو تو اس کی کیا روش ہوتی۔ عباسہ نے اس کو بتایا تھا کہ عاشق اپنی محبوبہ کی تلاش میں بادشاہ کے حرم میں داخل ہو گیا تھا اور جب امیر اپنی بیمار ہمسر کو دیکھنے آیا تو اس نے دونوں کو یکجا پایا۔ عباسہ نے ہارون سے پوچھا اگر تم ایسے عالم میں ہوتے تو کیا کرتے۔ ہارون نے کہا کہ میں ان کو بخش دیتا۔ عباسہ نے پوچھا اگر تمہاری عزیز ثریا ہی کیوں نہ ہوتی۔ اس نے کہا ہاں میں بخش دیتا۔ہارون نے قسم کھا کر عباسہ کو اپنے عزم کا یقین دلایا۔ اس مرحلہ پر عباسہ نے جا کر پردہ ہٹایا جس کے پشت میں حمید و ثریا ایک دوسرے کو آغوش میں لئے سو گئے تھے۔

ڈرامے کی کہانی خاصی دلچسپ ہے۔ پلاٹ بھی خوب بنایا گیا ہے اور بڑے سلیقے سے نبھایا گیا ہے۔ ہیروئن عباسہ ہی ہے۔ مصنف نے اس کی شخصیت کو نیکی اور ہمدردی سے موصوف کر کے اس کو دلاویز بنا دیا ہے۔ شہرزاد کو اپنی بہن سے والہانہ محبت شیفتگی اور احترام تھا۔ عباسہ میں اس نے اسی کو مجسم کر دیا ہے ہارون خود شہرزاد ہے۔ ہارون کے خلاف پہلے پہلے حقارت کے جذبات ابھرتے ہیں کہ اس نے اپنی ہوس کی تسکین کے لئے ایک معصوم لڑکی کو اپنے گھر ڈال لیا۔ لیکن جب اسے ثریا کی اصل محبت کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ اس سے جدا ہونے کے لئے رضا مند ہو گیا۔ اس فیاضانہ عمل سے اس کی عزت دوبالا ہو جاتی ہے مکالمے کہیں کہیں طویل معلوم ہوتے ہیں۔ اسلوب شاعرانہ اور کہیں کہیں فلسفیانہ ہے۔ مصنف نے عشق و محبت کی باتیں بیان کر کے اس میں خلوص و گداز بھر دیا ہے۔ بعض بعض جگہ زندگی کے حقائق کو بڑے نفیس انداز میں بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے "امید در دل انسان ضعیف میشود ولی ہرگز نمی میرد" یا عورت کے متعلق وہ لکھتا ہے "زن فرشتہ سعادت بشراست یک وقت باشمائل مادر غمخوار جلوہ کردہ شہد ہستی رابکام مای چشاند' یک وقت باطلعت یک معشوقہ باوفا نازل شدہ مارا ازبادہ عشق و عشرت مدہوش می سازد یک وقت بصورت خواہر مہربان در آمدہ تلخی محنت را از کام مامیبرو۔"
یہ کھیل بہت پسند کیا گیا ہے۔ 1326 میں 100 مرتبہ اس کی نمائش ہوئی۔

مجسمہ مرمر

یہ ایک نہایت مختصر سی ایک پردہ تمثیل ہے۔ ایک مجسمہ ساز ہے جو اپنے کمال فن سے ایک

نہایت خوبصورت عورت کا مجسمہ بناتا ہے پھر خود ہی اس کی لطافت اور زیبائش پر عاشق ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت اس کے نظارہ حسن میں محو رہتا ہے۔ رات وہی بت اس کی خواب گاہ میں آکر اس کے سامنے رقص کرتا ہے اور اس کی روح کو شادمان کرتا ہے۔ صبح اٹھ کر وہ پھر رات کے خواب سے پریشان رہتا ہے۔

ڈراما نگار نے اتنے سے خیال کو خوبصورت الفاظ میں اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے مجسمہ ساز اپنی کارگاہ میں بیٹھا ہے۔ ایک حسین عورت سفید ملبوس میں خاص انداز میں کھڑی ہے۔ مجسمہ ساز اس سے مخاطب ہوتا ہے اور اس سے اپنے والہانہ تعشق کا اظہار کرتا ہے۔ پھر اس پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔ عورت اپنے مجسمہ کی حالت چھوڑ کر اس کے ارد گرد رقص کرتی ہے۔ جب وہ آنکھ کھولتا ہے تو پھر وہ مجسمہ کے انداز میں بت بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار نے اپنے تالم روح کے اظہار کے لئے تین تین چار چار اشعار کے تین قطعے بھی لکھے ہیں جن کو سن کر فضا میں ایک خاموشی اور اداسی کی روح چھائی معلوم ہوتی ہے اس خیالی تصور کا لطف دیکھنے اور سننے والوں کو اسی حالت میں آسکتا ہے جب ایک نہایت موزوں ایکٹر اس کردار کو پیش کر سکے۔ 1308 شمسی میں شہرزاد نے خود اس کو ایکٹ کیا تھا۔

مجسمہ مرمر کا قصہ اساطیر یونان کے ایک افسانہ پر مبنی ہے۔ پیگمالیون قبرص کا ایک مجسمہ ساز تھا۔ اس نے آرائش و ہوس کی دیوی گلاتی کا مجسمہ بنایا پھر اس پر عاشق ہوگیا۔ ونوس نے اس کی خواہش کے مطابق اس میں جان ڈال دی لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد پگیمالیون اس کی ہوسبازیوں سے اکتا گیا۔ چنانچہ اس نے ونوس سے درخواست کر کے اس کو اصلی حالت پر تبدیل کرا دیا۔

ژان راؤ فرانسیسی مصور نے اس قسم کی ایک تصویر بھی بنائی تھی شیلر نے بھی اپنی ایک نظم میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مجسمہ ساز نے اپنے شدت احساسات سے مجسمہ کو آغوش میں لیا کہ پتھر میں جان پڑ گئی۔

علی جلالی

1292 شمسی تہران میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم بھی یہیں پائی اور علوم سیاسی میں

ڈپلوما حاصل کیا۔ شروع سے ہی ان کا رجحان صحافت کی طرف تھا۔ اس لئے وہ روزنامہ اطلاعات میں خبرنگار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے بعد میں سیاسی اور اجتماعی مضامین پر کالم لکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ ضمنی طور پر ان کے افسانے بھی شائع ہوتے رہے آخر میں وہ اداریہ بھی لکھتے رہے۔

1320 میں انہوں نے مجلّہ اطلاعات ہفتگی شروع کیا۔ 1328 میں اطلاعات ماہانہ کی بنیاد رکھی اور ایران میں پہلی مرتبہ رنگ دار تصویر چھاپنے کا طریقہ عام کیا۔ 1321- 1322 میں انہوں نے میہن پرستان کے نام سے بھی دو سال تک ایک اخبار جاری کیا تھا۔

آج کل صحافت اور ڈراما سے کنارہ کشی کر رکھی ہے اور ایک تجارتی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ وہ دو مرتبہ یورپ ہو آئے ہیں۔ وہاں رہ کر انہوں نے تھیٹر کا بھی مطالعہ کیا۔ وہ فرانسیسی سے خوب واقف ہیں۔

انہیں نقاشی اور مصوری سے کمال ذوق ہے۔ ایران کے مشہور مصور حسین بہزاد ان کے محبوب دوست ہیں۔ انہیں کے خیالات سمجھانے سے مصور نے بعض بے نظیر تصویریں بنائی ہیں اور وہ اپنے اصلی رنگ و روپ میں صرف انہیں کے پاس موجود ہیں۔

انہوں نے ساٹھ پینسٹھ افسانے اور چالیس پچاس ڈرامے لکھے ہوں گئے' دو ناول شبہای بابل اور در راہ نجات میہن مجلّہ اطلاعات ہفتگی میں مسلسل شائع ہوئے اور ڈراموں میں سے انقلاب مشروطیت' شاہ عباس کبیر' عتاب شیریں اور گرد آفرید سہراب بھی شائع ہوئے۔

انہیں بچپن سے ہی ڈراما نگاری کا شوق تھا۔ ابھی دبیرستان کے طالب علم تھے کے انہوں نے سولہ سال کی عمر میں تبہ کار کے نام سے ایک حزنیہ ڈراما لکھا اس کے بعد تحریک سکاؤٹ کی تبلیغ کے لئے "پیش آہنگان در جنگل" کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جو بہت مقبول ہوا اور وزارت فرہنگ کی طرف سے تمام سکولوں میں اس کے سٹیج کرنے کی اجازت دی گئی۔ ابتدائی ڈراموں میں سے ایک خیالی ڈرامہ "شبہائی ہند" جس کے تمام کردار خیال پرست ہیں اور گمان کو حقیقت سمجھ کر اس کے پیچھے چلتے ہیں ان کے دوسرے مشہور ڈرامے مندرجہ ذیل ہیں۔

تاریخی ڈرامے

1- عباس کبیر 2- داریوش کبیر 3- انقلاب مشروطیت ایران

مذہبی ڈرامے

1- فاجعہ رمضان 2- مسلم بن عقیل 3- سہ ملعون

ادبی ڈرامے

یعنی وہ ڈرامے جن کی بنیاد کسی مشہور قصے پر ہے یا اس کی کہانی کسی مصنف کی کتاب سے اقتباس کی گئی ہے۔

1- عتاب بشر (خسرو شیریں) 2- ویس ورامین 3- شاہ دادگر 4- نبردیا زدہ رخ (شاہنامہ سے اقتباس) 5-سعدی و چنگیز 6- منیژہ و بیژن 7- رستم و اسفند یار 8- رستم و سہراب۔ ان ڈراموں کے ترجمے فرانسیسی زبان میں بھی ہوئے ہیں۔

اجتماعی ڈرامے

1- توانگر تیرہ بخت 2- مردیکہ راست میگوید 3- دخترک آموز گار 4- درکام سیل

ہم صرف ان کے تین چار ڈرامے پڑھ سکے ہیں۔ انہیں کے مطالعہ سے فن ڈرامہ میں ان کی ہنر مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ کہانی پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ قصہ کو بڑے محکم پلاٹ میں بیان کرتے ہیں۔ کردار بھی خود بخود اپنی شخصیتیں نمایاں کرتے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق پہلے سے بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

داریوش کبیر

ڈرامے کی مختصر کہانی یہ ہے کہ کورش کبیر کے بعد اس کا بیٹا کمبوجیہ ایران کے تخت پر بیٹھا۔ کمبوجیہ کا ایک بھائی بردیا تھا جو دوسری ماں سے تھا کمبوجیہ نے اسے مروا دیا تھا اپنے عہد سلطنت میں کمبوجیہ مصر کی مہمات پر گیا اور وہاں کے معاملات طے کرتے ہوئے دیر لگ گئی۔ اس کی غیر حاضری میں ایک آتش پرستوں کے سردار منغ گئومات نے ادعا کیا کہ وہ بردیا ہے اور تخت کا حقدار

ہے جو لوگ اس راز سے واقف تھے کہ اصل بردیا تو مار دیا گیا تھا اس نے ان کو قتل کروا دیا یا اپنے ساتھ ملالیا۔ داریوش جو بعد میں داریوش کبیر کے لقب سے مشہور ہوا۔ دوسرے سلسلہ نسب سے کمبوجیہ کا بھائی تھا وہ جھوٹے بردیا کے دوران حکومت میں پارس میں تھا اور اس راز سے واقف تھا اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کا ملک غاصب کے ہاتھوں سے چھیننے اور ظلم و استبداد کی حکومت کو ختم کرے۔ چنانچہ وہ شوش پایہ تخت پہنچا اور اس نے قبائل کے چیدہ سواروں کو اپنے ساتھ ملا کر بردیا کا تختہ الٹ دیا۔

کہانی میں ڈرامہ کا عنصر موجود ہے یعنی حق و باطل کی جنگ ایک حقدار و غاصب کی کشمکش اور پھر ڈراما کا بنیادی خیال دو ارادوں کی ٹکر موجود ہے ڈراما نگار نے اس کہانی کو پلاٹ کی صورت میں دینے اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بڑی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے پلاٹ کو تین ایکٹ میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے ایکٹ کے پہلے منظر میں ہی ڈرامے کے واقعات معلوم ہو جاتے ہیں۔ جب داریوش شوش میں پہنچتا ہے تو ڈرامے کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جب گئومات کو اپنی جان کا خطرہ پڑجاتا ہے تو ڈرامہ اپنے ارتقاء کو پہنچا ہوتا ہے اور آخر میں ایک حاکم کی طرف سے جب عوام کے سامنے اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ بادشاہ اصل بردیا نہیں ہے تو ڈرامے کا اتار ہو چکتا ہے۔ بردیا کے قتل پر اس کا اختتام ہے اگرچہ تاریخی واقعہ کوئی خاص دلچسپ نہیں لیکن ڈرامے کی رفتار میں سستی نہیں آتی _ ایک واقعہ ہو رہا ہے اور آپ کو گمان نہیں ہوتا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ڈرامہ نگار فوراً منظر میں کسی اور کردار کو داخل کر دیتا ہے جس سے دیکھنے والوں کی توجہ مبذول ہوجاتی ہے گئومات اور آتس سا (کمبوجیہ کی بہن) باتیں کر چکے ہوتے ہیں اور گئومات چلا جاتا ہے تو فوراً داریوش داخل ہوتا ہے ایک اور منظر میں ایک غیر آباد و خمہ میں داریوش اور دوسرے سردار چھپے ہوئے باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ اچانک زخمی دایہ داخل ہو جاتی ہے سب مناظر ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور پلاٹ کے استحکام میں مدد دیتے ہیں کسی غیر ضروری عنصر کا اضافہ نہیں ہے۔

کردار بھی سب موزوں ہیں۔ داریوش بہادر جانباز اور ہوشمند ہے۔ بردیا ظالم ستم گار اور عیش پرست ہے اس ڈرامہ میں دو کردار اپنی شخصیت کے اعتبار سے نمایاں ہیں۔ ایک آتس سا اور دوسرا منغ کو زہشت۔ آتش سا اپنے حسن و جمال کی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ بیباکی اور استقامت کا مجسمہ ہے۔ بردیا داریوش کا راز پوچھنے کے لئے اسے بیڑیاں پہناتا ہے۔ یہاں تک کہ آنکھیں نکالنے کے لئے گرم سلاخیں اس کے نزدیک لے جاتا ہے لیکن وہ موت کو ترجیح دیتی ہے اور ظالم

کے سامنے عجز کا اظہار نہیں کرتی۔

کوزپشت اپنی ہیئت کذائی کے ساتھ ساتھ مکاری اور جاسوسی کا مجسمہ ہے اور اول درجے کا بیباک تبہ کار اور سنگدل ہے اور اپنے مقاصد کے لئے عورت کی آنکھیں نکالنے کے در پے ہو جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ڈرامے کا تاثر اچھا ہے۔ وطن پرستی کے جذبات پیدا کرنے وطن دشمنوں کی مخالفت کرنے اور وطن کی آزادی پر جان قربان کرنے کے خیالات ابھارنے میں بھی یہ ڈراما قابل قدر ہے۔

انقلاب مشروطیت ایران

ڈرامے کا آغاز اس وقت سے ہے جب محمد علی شاہ نے مجلس پر بمباری کی روسی فوجی کمانڈروں اور قزاقوں کی مدد سے آزادی خواہوں اور مشروطہ طلبوں کو قتل کیا یا جیلوں میں بھر دیا۔ لیکن چند ایک جانباز تھے جن کی کوششوں سے بادشاہ کا تختہ الٹ گیا۔ تبریز میں ستار خاں' باقر خاں جیسے مدبر فدایان وطن کی استقامت سے اور سردار اسعد بختیاری کی کمک سے تہران فتح ہوا اور محمد علی شاہ سفارت خانہ روس میں پناہ گزین ہوا مصنف نے اس زمانے کے تمام واقعات کا جزی مطالعہ کر کے اور تمام شخصیتوں سے آشنائی پیدا کر کے اس تاریخ کو ڈراما کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان تمام واقعات کو کھیل کی صورت میں مجسم کر دیا ہے۔ منصب داروں اور قزاقوں کی بے رحمی وہوس بازی کا بھی مظاہرہ ہے۔ فراشوں کی بزدلی اور رشوت خوری کا بھی بیان ہے۔ بادشاہ وقت کا اضطراب اور بزدلی بھی واضح ہے اس کے رفقاء اور درباریوں کی خوشامد بھی ظاہر ہے وطن پرستوں کی خفیہ انجمنیں بھی منعقد ہیں اور ان کی قربانی کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

ڈراما چار مجلسوں میں منقسم ہے پہلے ایکٹ میں مشروطہ خواہوں کی شکست اور بمباری کا ذکر ہے۔ ایک وطن پرست آزادی خواہ کے گھر کا منظر ہے اس کی ماں اور بیوی فکر مند ہیں اور اپنے آدمی کی خیریت و سلامتی کی خبر سننے کی خواہش مند ہیں۔ خاندان کا ایک دوست اصل واقعہ کی خبر دیتا ہے اور ان کو گھر سے دور چلے جانے کا مشورہ دیتا ہے اس کے چلے جانے کے بعد ایک منصب دار قزاقوں کے ایک گروہ اور ایک راہنما کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ وہ سامان لوٹتے ہیں

ماں کو قتل کرتے ہیں۔ عورت کے ساتھ منصب دار دست درازی کرتا ہے۔ وہ اس کو خنجر سے ہلاک کرتی ہے اور گرفتار ہو جاتی ہے دوسرے ایکٹ میں محل کا منظر ہے فراش اور پاسبان فاطمہ یعنی قاتل منصب دار کے متعلق گفت و شنید کرتے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ وزیر' سپہ سالار اور روسی افسر داخل ہوتے ہیں اور صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور تبریز میں مشروطہ طلبوں کی سرکوبی کے لئے فوجوں کو متعین کرتے ہیں تیسرے ایکٹ میں تبریز کے وطن پرست اکٹھے ہیں اور آزادی کی راہیں سوچتے ہیں اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں چوتھے میں بادشاہ اپنے مشیروں کے ہمراہ فکر مند ہے۔ وطن پرستوں کی فوجیں تہران پر آپہنچی ہیں اور آخر بادشاہ ناامید ہو کر سفارت خانہ روس میں پناہ لیتا ہے اور آزادی خواہوں کی فتح ہوتی ہے۔

ڈرامہ پڑھ کر آنکھوں کے سامنے انقلاب کا نقشہ آ جاتا ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے مناظر میں ہم آہنگی موجود ہے کہانی کی رفتار کہیں کہیں سست معلوم ہوتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کہیں کہیں مکالمے ہو گئے ہیں۔ مثلاً فاطمہ اور ماں کا مکالمہ' بادشاہ اور اس کے مشیروں کی گفتگو' وطن پرستوں کے مشورے وغیرہ۔

کوئی منظر اضافی نہیں۔ سب منظر حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ مطلق العنان بادشاہ کے زمانے میں واقعی ایسی بے انتظامی' ابتری' افسروں اور سپاہیوں کی لاقانونی' ستم گاری اور سخت گیری عام تھی خون کی ارزانی اور تاراج و غارت کا یہی عالم ہو گا۔ ان حالات میں فاطمہ کی دلیری' ماں کی قربانی' حسن کی جانبازی' احمد یوزباشی کی ہوشیاری اور ستار خاں باقر خاں کی قیادت تدبر اور ثبات و استقامت قابل صد ستائش ہے اور ڈرامہ دیکھنے والوں میں ملی بیداری اور وطن پرستی کے سرفروشانہ جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ یہ ڈرامہ تاریخ کی تاریخ ہے اور ڈرامے کا ڈرامہ۔ تاریخ کے زریں کارنامے کو ڈرامے کی شکل میں پیش کرنا اور اس زمانے کی تمام شخصیات کو ان کے اصل کردار میں پیش کرنا ڈرامہ نگار کی ہنر مندی پر شاہد ہے۔ کردار سب حقیقی ہیں لیکن ڈرامائی اضافہ کی خاطر تبلیغی مقاصد کے پیش نظر چند افراد کی تضحیک اور تذلیل بھی مقصود ہے۔

فاجعہ رمضان

یہ ڈرامہ حضرت علیؓ کے واقعہ شہادت پر مبنی ہے جنگ نہروان کے بعد رقیب قبائل کے بہت

سے لوگ مارے گئے۔ تین آدمیوں نے عزم کیا کہ مقررہ دن اور وقت پر عمرو بن عاص، معاویہؓ اور علیؓ کو قتل کر ڈالیں۔ ابن ملجم زہر آب تلوار سے حضرت علیؓ کو زخمی کر دیتا ہے اور شہادت کا باعث بنتا ہے۔ اور خود بھی موت کی سزا پاتا ہے اس واقعہ کیساتھ قطامہ کا واقعہ بھی شامل ہے۔ قطامہ ایک عربی قبیلہ کی دلربا خاتون ہے جس کا باپ اور بھائی جنگ میں مارے گئے ہیں اور حضرت علیؓ سے انتقام کے در پے ہے۔ پہلے وہ ابراہیم سے محبت کا اظہار کرتی ہے اور اس کو حضرت علیؓ کے قتل پر ابھارتی ہے جب وہ راضی نہیں ہوتا تو ابن ملجم کو اپنے جال میں پھنساتی ہے۔ اس سے شادی کرنے کے لئے اس شرط پر راضی ہوتی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو قتل کردے۔ بعد میں اپنے پرانے ہمکار بوڑھے ابو فراس کے ذریعے اس کو گرفتار کرانے کا سبب بنتی ہے۔ قطامہ کی کنیز نرگس کے ذریعہ ابراہیم کو پتہ چل جاتا ہے کہ قطامہ اس سے محبت نہیں کرتی اور ابن ملجم سے اظہار عشق و پیان کرتی ہے ابو فراس، ابراہیم اور ابن ملجم دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر خود قطامہ کو حاصل کرنے کی تدبیر میں تھا۔ قطامہ نے اس کو بھی وعدہ دے رکھا تھا لیکن آخر وہ اس کو بھی فریب دے کر قافلے کے ساتھ شام و مصر کو نکل جانا چاہتی تھی کہ ابو فراس نے اس کو آلیا لیکن ابراہیم نے پہنچ کر ابو فراس کا کام تمام کیا اور نرگس نے قطامہ کو اسی خنجر سے ہلاک کیا جو وہ عیاری سے ابراہیم کی کمر سے نکال کر چپکے سے اس کو مارنا چاہتی تھی۔

ایرانی ڈراما کی تاریخ میں شہادت حسینؓ کی تمثیلات کے بعد یہ پہلا مذہبی ڈراما ہے جو واقعی ڈراما کی صورت میں لکھا گیا اور ڈرامہ نگار نے واقعہ شہادت علیؓ کو ایک مضبوط پلاٹ کی شکل میں پیش کر کے اپنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ پلاٹ میں کہیں الجھاؤ نہیں۔ پہلے منظر میں قصہ کے واقعات سامنے آجاتے ہیں اور حضرت علیؓ کے حامیوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان کشمکش نمایاں ہوتی ہے۔ تبہ کار طاقت اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اپنا زوال لے آتی ہے۔ مصنف نے قطامہ کے واقعات شامل کر کے پلاٹ کو دلچسپ بنا دیا ہے اور اس کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اس کی مکاری اور حیلہ پروری کو دکھا کر ناظرین کی توجہ کو باندھے رکھا ہے۔ حضرت علیؓ کے شہید ہو جانے کے بعد بھی ناظرین قطامہ کا انجام دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ مصنف نے دو تین منظر کا اضافہ کر کے ڈرامے کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ پہلے یہ جب تین شخص رہنماؤں کے قتل کی سازش کرتے ہیں تو چوتھا شخص بھی سنتا ہے لیکن وہ اس تجویز کا مخالف ہے اس لئے ابن ملجم اس کو قتل کر دیتا ہے تاکہ وہ اس راز کو دوسروں تک نہ پہنچا دے۔ دوسرے جب ابن ملجم مسجد کے گوشے میں چھپ کر موقع کے انتظار میں ہوتا ہے تو وعظ کے یہ الفاظ سن کر

کہ تمہارے دل کا حال خدا جانتا ہے تمہیں اپنے اعمال کی سزا مل کر رہے گی تو اپنے ناپاک ارادے سے باز آنے کا خیال کرتا ہے۔ تیسرے اس کے بجائے کہ حضرت علیؓ کی شہادت پر ساری قوم ماتم میں دکھائی جائے، مصنف نے دو یتیم بچوں اور ان کی ماں کو پیش کر کے منظر کو دردناک بنا دیا ہے کیونکہ وہ تین دن سے منتظر تھے کہ ان کے لئے غذا مہیا کرنے والا، ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں آیا اور وہ بے سہارا رہ گئے۔

قطامہ کا کردار ایک حسین مکار کے اعتبار سے بڑا نمایاں اور مثالی ہے۔ ڈرامے کی فضا عرب کی معلوم ہوتی ہے۔ گفتار و رفتار کے نقطہ نظر سے بھی کردار عرب بدو دکھائی دیتے ہیں۔

ابوالقاسم جنتی عطائی

ابوالقاسم ان کا نام ہے اور جنتی عطائی خاندانی نام۔ مشہد میں 1296ہجری شمسی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم مشہد اور تہران میں حاصل کی۔ تہران میں مدرسہ علمی اور دبیرستان فردوسی میں پڑھتے رہے۔ تین سال تک ہنرستان ہنر پیشگی تہران میں فن تیاتر میں تعلیم حاصل کی۔ 1319 میں فراغت کے بعد دوستوں کی رفاقت میں تماشا خانہ کشور قائم کیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ بعد میں رقیبوں کی سازشوں کی نذر ہوگیا۔ دو سال تک تیاتر تہران میں بھی کام کرتے رہے۔ خود ڈرامے بھی لکھتے اور ایکٹ بھی کرتے۔ 1380 تک ان فنی مشاغل میں عملی طور پر حصہ لیتے رہے۔ دوستداران فرہنگ فرانسہ کے شعبہ ہنری اور جمعیت شیر و خورشید کے لئے ریڈیائی ڈرامے لکھتے رہے اور تبلیغی مقاصد کے لئے سٹیج پر بھی ڈرامے پیش کرتے رہے۔

1328 میں تھیٹر کی تعلیم کے لئے پیرس گئے۔ سوربن یونیورسٹی میں دو سال تک تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایران میں وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے فن ڈرامہ اور فن تیاتر پر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ واپسی تہران میں مدرسہ تیاتر میں معلم ہو گئے اور حرکات و صدا GEST AND MOVEMENT پر درس دیتے رہے۔ آج کل ادارہ کل انتشارات میں رئیس ادارہ سینما و نمائش ہیں اور وزارت کشور میں وزارت تعلیم کے نمائندہ ہیں۔

جنتی کو طالب علمی کے زمانے سے ڈرامے سے خاص لگاؤ تھا اور جذبات و احساسات کے اظہار میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ 1313 میں جب وہ دبیرستان کے طالب علم تھے تو انہوں نے ہزارہ

فردوسی میں اپنی ہنرنمائی کے لئے شاہنامہ پڑھ کر سنایا اور جس پر ان کو نشان فردوسی عطا ہوا۔ ان کی دو چار چیزیں گراموفون ریکارڈوں میں ضبط ہیں جو ان کی اداکاری اور اظہار جذبات پر قدرت کے کمال فن پر شاہد صادق ہیں۔ ایک ریکارڈ میں مثنوی رومی کو پڑھ کر سنایا ہے _ دو ریکارڈوں میں آہنگہای محلی میں دو **تصنیفیں** بعنوان دانہ انارا اور لب گل یار ضبط ہے۔ چوتھے ریکارڈ میں ایک مثنوی میں ان کی اپنی تصنیف "داستان اصغر بنا" محفوظ ہے۔ جو RECITATION اور DECLAMTION کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ را دیو پاریس میں جب انہوں نے تقریریں کیں اور ڈرامائی انداز میں کچھ چیزوں کو پڑھ کر سنایا تو وہ ان کی چھوٹی عمر میں اس کمال پر منتخب ہوئے اور انہوں نے کہا۔

LA VALEURN, ATTEND PAS LV NOMBRE DEHSANNESS یعنی کسی فن میں استعداد و قابلیت سالوں کی تعداد پر منحصر نہیں۔ ان کی تصانیف میں سے مشہور ڈرامے مندرجہ ذیل ہیں۔

اتابک اعظم	درام تاریخی درسہ پردہ
اورنگ و گل چہر	ملو درام درسہ قسمت
بچہ شیطان	کمدی درسہ پردہ
پول	درام اجتماعی درسہ پردہ
د لقک	درام تاریخی انتقادی درپنج قسمت
پرسی پلیس در آتش	ٹریجدی تاریخی درسہ قسمت
درزیر نقاب	کمدی انتقادی تاریخی در چہار قسمت
دادرس یا ناموس بباد رفتہ درام اجتماعی	
شہزادہ عروس توران	درام تاریخی در۵ پردہ
یوسف و زلیخا	درام تاریخی در۵ پردہ
دلگر دیلیوز	کمدی انتقادی در چہار پردہ
نمایشنامہ ہای مدارس	1336

ترجمے

1- گل نساء فرانسیسی سے ترجمہ۔بطور ڈرامہ فلمایا گیااور جنتی نے معاون ڈائریکٹر کی اس کی تکمیل میں حصہ لیا۔

-2	شہزادہ خوش بخت	اسکروائلڈ
-3	سالومی	اسکروائلڈ
-4	خرس	چیخوف
-5	کیفر	از **نویسندہ** اروپائی

ڈراموں کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں۔

-1 زندگانی و آثار شہرزاد
-2 نیمایو شیج (کیست و چیست)
-3 بنیاد نمائش درایران
-4 نیما زندگانی و آثاراو
-5 میرسیف الدین کرمانشاہی
-6 LA THEATRE EN RERSE CA 1850 -1950

ان کے ڈرامے شائع نہیں ہوئے۔ میں صرف تین پڑھ سکا ہوں ایک تاریخی' ایک اجتماعی اور ایک کمڈی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تکنیک کے ماہر ہیں اور ڈرامہ کی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے ڈرامے سٹیج پر کامیاب رہے ہیں۔ امیرکبیر 37 رات تک کھیلا گیا۔ ان کے ڈراموں میں کہیں کہیں پلاٹ کی ناپختگی کے آثار نمایاں ہیں۔ جن ڈراموں کا مطالعہ کر کے ہم نے تبصرہ کیا ہے ان سے ان کی فنی قابلیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

امیرکبیر

میرزا تقی زادہ ایران کی ان بزرگ وطن پرست شخصیتوں میں سے ہیں جن کی زندگی ملک و ملت کی بھینٹ ہوگئی۔ ان کے باپ فتح علی شاہ قاچار کے زمانے میں شاہی **مطبخ** کے مہتمم تھے۔ انہوں نے اپنی لیاقت اور محنت کے بل پر کم رتبہ سے ترقی پاکر صدارت کا بلند ترین عہدہ حاصل کیا۔ وہ ناصرالدین شاہ کے عہد سلطنت میں 1264 سے 1268 تک امیرکبیر صدراعظم رہے۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد امیرکبیر ہی نے ناصرالدین شاہ کو تبریز سے لاکر تہران میں تخت نشین کیا۔ اس نے ملک میں اصلاحات نافذ کیں۔ دارالفنون قائم کیا۔ قبائل کی شورشیں ختم کیں۔ مالی حالت کو درست کرنے اور بجٹ کو متوازن کرنے کے لئے امیروں شاہزادوں اور درباریوں کی

تنخواہوں میں کمی کی۔ درباریوں، خائنوں اور یہاں تک کہ مہد علیا نے سازش کر کے بادشاہ کو اس سے متنفر کر دیا اور اس کو صدارت سے برطرف کرا دیا۔ میرزا آقا خاں نئے صدر اعظم کے اشارے سے کاشان میں اس کو قتل کر دیا گیا بادشاہ نے اپنی احسان مندی کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ بادشاہ کی بہن عزت الدولہ اس کے عقد میں تھی۔ امیر کبیر کی موت ایک وطن پرست کی دردناک موت ہے۔

امیر کبیر کا ڈرامہ صرف انہی واقعات زندگی پر منحصر ہے جو صدر اعظم کی حیثیت سے اس کو پیش آئے۔ مصنف نے واقعات کے لئے دو کتابوں سے مدد لی ہے۔

1- امیر کبیر و ایران از فریدوں آدمیت 2- امیر کبیر و ایران از حسین مکی اور تاریخ سے انحراف نہیں کیا۔ کہاں کے واقعات مختصراً وہی ہیں جو ہم نے اوپر بیان کر دیئے ہیں۔

ڈرامے کا انجام چونکہ حزن انگیز ہے اس لئے اس کو حزنیہ کہا جاسکتا ہے۔ وگرنہ یونانی حزنیہ یا شیکسپئر حزنیہ کا انداز اس میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یعنی اس میں ایک عظیم کردار کی موت اس کی شخصی عادات کے تصادم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ چند ہوس باز خائنوں اور بادشاہ کی کمزور شخصیت کی وجہ سے وجود میں آئی جو تاریخی اعتبار سے ایک وطن پرست شخص کی موت ہونے کی وجہ سے غمناک ہے اور اپنے اندر عبرت کا سامان رکھتی ہے اور وطن کے خائنوں کے خلاف ایک تنفر اور بغاوت کا جذبہ ابھارتی ہے اخلاقی نقطہ نظر سے یہ ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔

ڈراما چونکہ سٹیج کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے سامان کی محدودیت اور اقتصادی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف چار پردوں پر منقسم ہے۔ ان محدود مناظر کے باوجود سب تاریخی واقعات کو نمایاں کرنے کے لئے کسی اور منظر کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

ڈرامے کے صرف دو کردار ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ امیر کبیر اور بادشاہ کے کردار امیر کبیر ایک باوقار، زیرک اور ہوشیار سیاست دان ہے جو ہر لحہ بادشاہ اور وطن کی خیر خواہی کے لئے سوچتا اور کام کرتا ہے۔ نوجوان بادشاہ اس سے خائف ہے اور اس کے حواریوں کو بھی ڈانتا ہے وہ بے باک شخص ہے۔ بھرے دربار میں بادشاہ سے کہتا ہے کہ جس نے تمہیں تخت دلوایا، جس نے وطن کے استحکام کے لئے کوشش کی کیا اس کی جاں نثاری کا صلہ اس کی برطرفی اور توہین ہے۔ وہ موت کے وقت جو وصیت کرتا ہے اس میں بھی وطن کی اصلاح کے لئے بادشاہ کو نصیحتیں کرتا ہے۔ اس نے اپنی ذات کے لئے کوئی وصیت نہیں کی۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی سیاسی مداخلت سے روکا۔

بادشاہ نوجوان ناتربیت یافتہ اور ملکی معاملات سے بے پروا ہے۔ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ تاش کھیلتا ہے۔ اور اپنی حرکات سے مسخرگی کا اظہار کرتا ہے۔ صدر اعظم اور وہ سیاسی معاملات میں مذاکرات کر رہے ہیں اور وہ بے توجہ ہو کر سونے کے ہار کی تعریف کرنا شروع کر دیتا ہے جو زرگر باشی نے انہیں مذاکرات کے دوران میں لاکر پیش کیا ہے۔ دربار کے آخری منظر میں صدر اعظم کی برطرفی کا اتنا بڑا اہم حکم دے کر وہ نقالوں کی باتیں سننے میں مصروف ہو جاتا ہے اور پھر شکار کی طرف چلا جاتا ہے۔

ڈرامہ نگار نے ڈرامہ کو زور دار ارو درد ناک بنانے کے لئے عزت الدولہ کا خواب اور امیر کبیر پر اس کے اثرات کو بیان کر کے ڈرامائی تاثر میں اضافہ کیا ہے۔ امیر کبیر نے اسی خواب کی تعبیر میں اپنے لئے اسی طرح موت کو قبول کیا۔ یعنی شریان بزرگ سے خون کا فوران اس کی موت کا سبب بنا۔ ایک منظر میں اصفہان کے ایک ہنرمند کو امیر کبیر کے سامنے پیش کیا ہے جو خارجی سماوار کے مقابلے میں ایک سماوار بنا کر لایا ہے امیر کبیر نے اس کی قدر و منزلت کی انعام دیا اور اپنی ہنرو دوستی اور ملی صنعت وحرفت کی قدردانی کا ثبوت دیا۔ ڈرامہ نگار نے اس چھوٹے سے منظر کا اضافہ کر کے اپنی ہنرمندی ظاہر کی ہے اور ایک اہم ملی ضرورت کی طرف توجہ دلوائی ہے۔ نقالوں کا سین کچھ زیادہ جاذب نہیں۔ القاب کی تکرار سننے والوں کے لئے خستگی آور ہے اگرچہ ظرافت کے ساتھ ساتھ اس میں تمسخر اور طنز موجود ہے۔ مکالمے خوب ہیں اور جاندار ہیں۔ بادشاہ اپنے ہمجولیوں میں عوامانہ گفتگو کرتا ہے۔ لیکن دربار میں تحکمانہ انداز میں بولتا ہے۔ جو حسب حال ہے۔

ڈرامے کا مجموعی تاثر بھی خیال انگیز ہے۔

2- ناموس برباد رفتہ

تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ ہمایوں اور اقدس ہم جماعت تھے۔ ہمایوں نے اظہار محبت کیا اور نامزدی تک نوبت آگئی اور دونوں نے باہم تصویریں بھی کھچوائیں ہمایوں عیار اور بلہوس نکلا۔ اس نے ایک دوسری عورت گوہر سے اظہار عشق کیا۔ گوہر نے بھی اقدس کے ساتھ ایک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اقدس نے جلال سے شادی کر لی لیکن ہمایوں نے انتقام لینے کے لئے جلال سے دوستی جوڑی اور اقدس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ ایک دن اس کو دھمکی دی کہ اگر وہ اس

کی مراد پوری کرنے کے لئے رضامند نہ ہوئی تو وہ تصویر اخبار میں شائع کر کے اس کی رسوائی اور توہین کا باعث بنے گا۔ اگر وہ تصویر واپس لینا چاہتی ہے تو چار بجے اس کے مکان پر پہنچے۔ گوہر نے یہ باتیں مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے سن لیں اور وہ ساڑھے تین بجے ہی ہمایوں کے گھر پہنچ گئی لیکن ہمایوں نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور اس کو باہر نکال دیا۔ وہ دوسرے کمرے میں چھپ رہی۔ جب اقدس پہنچی اور ہمایوں نے اس پر دست درازی شروع کی تو اس نے ہوا میں فائر کیا۔ اسی لمحے گوہر نے پردے کے پیچھے سے فائر کیا۔ گولی سینے میں لگی اور ہمایوں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اقدس اپنا ریوالور اور ایک دستانہ وہیں چھوڑ کر بھاگ آئی۔ ہمایوں کا نوکر گولی کی آواز سن کر پہنچا اور اس نے پستول اٹھا کر دیکھا۔ اتنے میں سپاہی اور دوسرے لوگ آپہنچے اور انھوں نے اس کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اسی اثنا میں جلال بھی وہاں آپہنچا اور تفتیش میں شامل ہوا۔ اس نے اقدس کا دستانہ بھی پہچان لیا۔ جلال نوکر کی طرف سے وکیل بنا۔ اقدس نے عدالت میں پہنچ کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اسی دوران میں گوہر آپہنچی اور اس نے اصلی قاتل ہونے کا اعتراف کیا اور بتایا کہ جس گولی سے ہمایوں کی موت واقع ہوئی وہ میرے پستول سے نکلی تھی اور اقدس کا وار خالی گیا تھا اور اس کی گولی دیوار پر جا لگی تھی پس گوہر کو سزا ہوئی اور اقدس اور نوکر رہا ہو گئے۔

پلاٹ میں دلچسپی حرکت اور کہانی کا اتار چڑھاؤ موجود ہے لیکن واقعیت کے لحاظ سے ایک چوک ہوئی وہ یہ کہ گوہر کی زبان سے یہ کہلوایا ہے کہ اس نے گزرتے گزرتے اقدس کے مکان پر ہمایوں اور اقدس کی باتیں سن لی تھی۔ یہ حادثہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ وہ کہیں اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہوں گے بازار میں گزرتے گزرتے اس نے تہدید کی باتیں کیسے سن لیں۔ اگر مصنف گوہر کی زبان سے یہ بیان نہ بھی دلواتے تب بھی یہ نقص دور ہو سکتا تھا۔ وہ اس طرح کہ گوہر تو ہمایوں کے گھر تقریباً ہوس بازی کے لئے آتی رہتی تھی۔ اس دن بھی وہ آپہنچی تھی لیکن ہمایوں چار بجے سے پہلے اس کو وہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ہمایوں کی یہ غیر متوقع روش گوہر کے دل میں شبہات تو ابھارتی جب وہ باہر جاتی تو اچانک اقدس کو مکان کی طرف آتے دیکھ لیتی اور چپکے سے مکان میں داخل ہو کر کمرے کے پیچھے چھپ جاتی۔ اس عمل سے ڈرامائی عنصر کا بھی اضافہ ہو جاتا اور غیر حقیقی بیان کی تلافی بھی ہو جاتی۔

پلاٹ کی تکمیل میں ایک اور کمی معلوم ہوتی ہے عدالت کے آخری منظر میں جب گوہر اپنے قاتل ہونے کا اقرار کرتی ہے تو صدر اپنے رفقائے عدالت سے کہتا ہے کہ اس عورت کے مقدمہ

کی الگ تفتیش کی جائے اور فیصلہ دیا جائے۔ اس جملے پر ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے اور پردہ گر پڑتا ہے۔ دیکھنے والا تصور تو کر لیتا ہے کہ بس اب گوہر کو پھانسی کی سزا ہو جائی گی اور اقدس بچ جائے گی لیکن آخری منظر ادھورا چھوڑنے میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ مختصر سے سوال و جواب کے بعد باقی معاملہ بھی صاف ہو سکتا تھا۔ جب اقدس کے اقبال جرم سے نوکر کی آزادی کا حکم ہو سکتا تھا تو گوہر کے اقبال جرم سے بھی اقدس کی رہائی کا حکم ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ تفتیش کے دوران میں دو گولیاں چلنے کا ثبوت مثل میں موجود تھا۔ ڈرامے کے اختتام پر اقدس کی رہائی کا حکم ہو جانا چاہئے تھا تاکہ جلال اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ لے کر سٹیج سے باہر نکلتا کیونکہ منظر کی موجودہ صورت میں اقدس کو دس سال کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ اس لئے کہانی کو معطل رکھنے سے ڈرامہ کو خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا۔

کرداروں میں جلال کا کردار بلند پایہ ہے۔ وہ وکیل ہے لیکن صرف وہی مقدمات لیتا ہے جو سچے ہوں اور ان ہی کی حمایت کرتا ہے جو مظلوم ہیں۔ جب اس کو نوکر کی بے گناہی کا یقین ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی اپنے جرم کا اقبال کرتی ہے تو وہ بے حال نہیں ہوتا صرف قانون کی روح سے اس کی سزا میں **تحفیف** کراتا ہے۔ لڑکی کا باپ یعنی جلال کا سسر خود اس عدالت کا صدر ہے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہے لیکن وہ خفیہ طور پر اقدس کی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ سچا اور دیانت دار آدمی ہے تفتیش کے دوران میں ہمایوں کے کمرے میں جب وہ اقدس کا دستانہ دیکھتا ہے تو اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ سپاہی کے حوالے کرتا ہے تاکہ قاتل ڈھونڈنے میں شاید یہ چیز کوئی مدد دے سکے۔

ہمایوں جیسا کہ کہانی سے ظاہر ہے شہوت کا مارا ہوا بوالہوس نوجوان ہے لیکن موت آئی ہے تو فوراً اپنی گناہگاری کا اعتراف کرتا ہے۔

یہ ایک اجتماعی ڈرامہ ہے اور سماج کی اصلاح کے لئے اپنے اندر سبق آموز واقعات رکھتا ہے مثلاً خاوند کو اپنے بیوی بچوں کے حالات کا بھی نگران رہنا چاہئے۔ سچے اور جھوٹے دوستوں میں امتیاز کرنا چاہئے۔ بری زندگی کے برے نتائج ہوتے ہیں۔ ایک عادل مصنف کا فرض ہے کہ جب اس کی اپنی بیٹی کا مقدمہ بھی اس کے سامنے پیش ہو تو وہ منصفانہ رائے دے وغیرہ۔

ڈرامے کی ہیروئن اقدس ہے اور کہانی کا محور وہی ہے اس لئے ڈرامے کا عنوان "ناموس برباد رفتہ" اس پر صادق نہیں آتا۔ کیونکہ اس کی ناموس تو نہیں مٹی۔ اصل میں گوہر کی زندگی برباد ہوئی اور وہ شوہر اور بچی کو چھوڑ کر ایک ہوسبازی کی زندگی میں پڑ گئی اور پھر ہمایوں کی بے

وفائی سے اس نے انتقام لیا لیکن گوہر ایک امدادی کردار معلوم ہوتی ہے۔

کمدی عمہ جان

یہ ڈرامہ ایک فارس ہو کر رہ گیا ہے یہ بھی تین پردوں میں منقسم ہے۔ ڈرامے میں ایک مسلسل کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں دو ایک ایک ایکٹ کے ڈرامے بنائے جا سکتے ہیں۔ کہانی یہ ہے کہ خسرو اور سعید دو نوجوان دوست ہیں۔ پہلا متمول خوش گذران ہے' دوسرا موسیقار اور ڈرامہ نویس ہے۔ دونوں ایک مالدار تاجر محبوب کی دو لڑکیوں سے وابستہ ہیں ژالہ بڑی خسرو کی نامزد ہے۔ عفت چھوٹی سعید سے مانوس ہے۔ عفت اور سعید کے ازدواج میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ محبوب کے نزدیک سعید کی کوئی مالی حیثیت نہیں ہے۔ خسرو اور سعید اس مشکل کو حل کرنے کے لئے چال چلتے ہیں۔ خسرو ایک بڑا جشن مناتا ہے اور سعید اپنی بیوہ پھوپھی گاؤں سے بلاتا ہے تاکہ عفت کے باپ سے شادی کے لئے درخواست کرے۔ وہ اچھے خاص لباس میں بن سنور کر جشن میں شریک ہوتی ہے اور اپنے آپ کو صاحب املاک اور صاحب اسباب بناکر محبوب کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے اور باتوں باتوں میں سعید اور عفت کے ازدواج کی بات بھی آجاتی ہے۔ محبوب کا میلان اپنی طرف دیکھ کر اس سے پختہ عہد لے لینے کے لئے کہتی ہے کہ مرد دولت دیکھتے ہیں اور چار چار شادیاں کر لیتے ہیں اور ایسی شادیوں میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ جہاں صرف محبت کا رشتہ قائم ہو اور دولت نہ ہو۔ محبوب کے یقین دلانے پر کہ وہ ایسی شادیوں کا مخالف نہیں اور اس بات کا یقین دلانے پر کہ عفت سعید کو چاہتی ہے وہ شادی کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے اس شرط پر کہ وہ بھی اس کے ساتھ بیاہ کرے۔ خسرو نے رئیس دفتر کو بھی بلایا ہوتا ہے۔ اسی مجلس میں نامزدی کا اعلان ہو جاتا ہے اور تینوں بیاہ ایک رات میں انجام پا جاتے ہیں یعنی پھوپھی کی اس سازش سے عفت اور سعید کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے ایک ڈرامہ یہاں ختم ہو جاتا ہے دوسرے میں سات سال کے بعد کا ایک واقعہ ہے۔ خسرو نے اپنے للے تللوں کی وجہ سے دولت ضائع کر دیتا ہے اور ہسپتال میں بیمار ہو جاتا ہے۔ سعید کا تھیٹر کامیاب ہوتا ہے اور مالدار ہو جاتا ہے لیکن اس کسم پرسی کی حالت میں وہ اپنے دوست خسرو کی مدد کرتا ہے۔ ایک دن سعید کی بیٹی کی سالگرہ ہوتی ہے اور خسرو بھی صحت یاب ہو کر ہسپتال سے واپس ہوتا ہے ژالہ اور سعید خسرو کو لانے کے لئے جانے والے ہوتے

ہیں کہ تھیٹر سے خبر آتی ہے کہ ایک ایکٹر بیمار ہو گیا ہے اور اس دن کا کھیل نہیں ہو سکے گا۔ سعید خود اس پارٹ کو ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی جگہ ریہرسل کے لئے ژالہ اور وہ خود مل کر اس پارٹ کو پڑھتے ہیں اور وہ خود ایکٹ کرتا ہے اس پارٹ میں وہ ژالہ کے سامنے زانو جھکا کر محبت کا اظہار کرتا ہے اس کے بعد ژالہ ہسپتال کی طرف اور سعید تھیٹر کی طرف چلا جاتا ہے جب سعید کی بیوی عفت بازار سے لوٹتی ہے تو اس کی بیٹی ثریا بتاتی ہے کہ ابا جان خالہ سے اظہار عشق کر رہے تھے وہ بگڑتی اور کھولتی ہے اور متنفر ہوتی ہے جب محبوب پھوپھی، ژالہ، خسرو گھر پہنچتے ہیں تو عفت ژالہ سے ٹھیک طرح نہیں بولتی سعید آتا ہے تو اس سے بھی طنز سے گفتگو کرتی ہے۔ آخر سب کے پوچھنے پر وہ رو دیتی ہے اور ژالہ کو مجرم ٹھہراتی ہے۔ آخر تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ثریا بیٹی کے بتانے سے یہ ساری خرابی پیدا ہوئی۔ جب ساری بات کھل گئی تو سب خوش و خرم ہو گئے چنانچہ کدورت دور ہو جانے سے میاں بیوی میں صفائی ہو گئی۔

ڈرامے کے پہلے حصے میں کچھ مقصدی اہمیت پائی جاتی ہے۔ مصنف ایک تو تیاتر و موسیقی کی بے قدری کی طرف توجہ دلاتا ہے اور دوسرے ان لوگوں کی مذمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو دولت کی خاطر محبت بھرے دلوں کو نہیں ملنے دیتے۔ دوسرے حصے میں بھی کچھ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ تحقیق کئے بغیر کسی کے بیان پر یقین نہیں کر لینا چاہئے۔ شک و رقابت کی زد میں آکر اپنی زندگی کو ناراحت نہیں بنانا چاہئے۔

کرداروں میں سعید کا کردار اچھا ہے وہ محنت و صبر سے کام کرتا ہے۔ آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے لیکن متکبر نہیں ہوتا اور اپنے دوستوں کو نہیں بھلاتا۔ کسی کردار میں گہرائی نہیں۔ ژالہ بچوں کی طرح روٹھتی ہے تحفہ پا لینے پر مان جاتی ہے عفت سنجیدہ اور فہمیدہ ہے لیکن سات سال کی ازدواجی زندگی کے بعد اپنے شوہر کی اخلاقی حیثیت پر شک کرنا اس کے کردار کی کمزوری ہے۔ مصنف نے محض ایک کمدی پیدا کرنے کے لئے یہ واقعہ ایجاد کر لیا ہے۔ وگرنہ عفت کے کردار سے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے دوسرے کردار محض کٹھ پتلیاں ہیں جس طرح مصنف نے چاہا ہے ان کو نچایا ہے۔

مصنف نے ڈرامے کے دونوں حصوں میں پلاٹ کی وجہ سے سامعین کے لئے ظرافت کا سامان مہیا کیا ہے۔ پہلے حصے میں عمہ جان کی ایکٹنگ اور دوسرے میں ثریا کی فتنہ انگیز ایکٹنگ سے ظرافت کا پہلو نکل رہا ہے۔ دوسرے حصے میں اس کے سب ایکٹر اس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے عفت کی ناراضی سے سامعین کو لطف آرہا ہے پہلے حصے میں صرف خسرو اس سازش سے

واقف ہے۔ حاضرین دوسرے ایکٹروں کی بے خبری اور عمہ جان کی اداکاری سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دونوں حصوں میں کمدی کا دار ومدار سنجیدہ ایکٹنگ پر منحصر ہے۔

اس ڈرامہ میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ دو جگہ ساز پر راگ بجایا گیا ہے اور دو جگہ گیت گایا گیا ہے جس سے سعید کی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

افسانہ نویسی

ایران میں ناول سے کافی دیر بعد افسانے کا رواج ہوا۔ سب سے پہلے بہار میں اور پھر دانش کدہ' میں سعید نفیسی اور رضا ہنری نے الفوس دودہ اور موپساں کے افسانوں کا ترجمہ شائع کیا۔ اس کے بعد اور مصنفوں کے ترجمے بھی عام ہو گئے۔

تہران میں مؤسسہ خاور نے خارجی افسانوں کی ترویج اشاعت کے لئے افسانہ کے عنوان سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس نے دورہ اول 1302- 1307ھ میں دس جزو دورہ روم یعنی 1309 میں 8 جزو۔ دورہ سوم یعنی 1310 میں 60 جزو اور دورہ چہارم یعنی 1323 میں جزو شائع کئے۔

ایران میں افسانہ نویسی کے موسس محمد علی جمال زادہ ہیں۔ جنہوں نے 1339ھ میں اپنی چھ کہانیوں کا مجموعہ "یکی بود یکی نبود" کے عنوان سے برلن میں شائع کیا۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے افسانہ کی افادیت اور اہمیت بیان کی ہے کہ وہ قوم کی اخلاقی اور سماجی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور مختلف طبقات کے خیالات اور رجحانات بیان کرنے کے لئے عوامی محاورات اور اصطلاحات کے استعمال سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں طعن و مزاح کو پر لطف انداز میں استعمال کیا ہے اور اس اسلوب بیان میں جمال زادہ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ان کہانیوں میں سے درد دل ملا باقر علی خان' بہترین افسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اسی مصنف کی دوسری کتابیں۔ سرگذشت عمو حسین علی' صحرائی محشر' راہ آب نامہ' وغیرہ ہیں۔

دوسری جانب سب سے نامور افسانہ نویس صادق ہدایت تھے جنہوں نے 1953ء میں خود کشی کرلی۔ ان کی کہانیوں کے چار مجموعے اور پانچ طویل افسانے یاناولٹ الگ الگ کتاب کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ مجموعوں کے نام یہ ہیں۔

زندہ بگور 1309ھ ش' سہ قطرہ خون 1311ھ ش سایہ دردشن 1312ھ ش اور سگ و لگرد 1323ھ ش۔ ان کہانیوں میں اشخاص قصہ اکثر نچلے طبقہ کے لوگ ہیں۔ انہیں لوگوں کے ساتھ اس کی ہمدردیاں وابستہ ہیں اور ان ہی لوگوں میں اس کو انسانی کیریکٹر کی بلندیاں نظر آتی ہیں لیکن اس کے افسانوں میں متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے افراد کا بھی ذکر ہے کہانیاں زمانوں اور مکانوں سے وابستہ ہیں اور زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی کے باوجود ہر کہانی کا آغاز اور انجام ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر کہانی کا پلاٹ اور اس کی کشاد ایک دوسرے سے جدا ہے۔

صادق ہدایت بہت حساس ہے۔ اسے دنیا میں دکھ ہی دکھ نظر آتا ہے۔ وہ تڑپتے ہوئے انسانوں' زمانے کے دھتکارے ہوئے مایوس ونامراد غریبوں کو دیکھتا ہے اور اپنے درد مند دل کو دکھیا محسوس کرتا ہے۔ اس نے اپنے تخیل کی ایک حسین بہشت تیار کی ہے جب وہاں رسائی نہیں ہوتی تووہ بے قرار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے وطن سے والہانہ محبت ہے۔ وہ ایران کے تاریخی دشمنوں سے کینہ رکھتا ہے اس نے پہلوی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور پھر سے دنیا کو ایرانی عظمت سے روشناس کرایا ہے۔ صادق کی زبان پر لطف ہے۔ امثال و محاورات اور روز مرہ کے استعمال سے اس نے زبان کو وسعت بخشی ہے۔ شروع شروع میں صادق ہدایت کی بالکل قدر نہ ہوئی۔ اس نے خود اپنی کتابیں چھپوائیں۔ وہ بھی تھوڑی تعداد میں فروخت ہوئیں ادیب اسکے عامیانہ محاورات کو رکیک سمجھتے تھے بعد میں بعض مستشرقین نے اس کو ایران کا ایک بہت بڑا ادیب سمجھا۔ آہستہ آہستہ اس کی بڑی شہرت ہوئی اور اس کے بہت سے پیرو پیدا ہوگئے۔

جمال زادہ کے اتباع میں لکھنے والوں میں سے بزرگ علوی مشہور ہیں ان کی کہانیوں کا مجموعہ چمدان کے نام سے 1313ھ ش میں شائع ہوا۔ 1313 میں آزادی پسند خیالات رکھنے کے جرم میں اسے قید کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد اس نے کہانیوں کے دو مجموعے شائع کئے۔ "ورق پارہ ہای زندان" اور 53 نفر' ان میں اپنی گرفتاری مقدمہ اور قید خانے کی زندگی کی داستانیں ہیں۔ ان میں سے ایک ڈائری ہے جس میں روزانہ اپنی بیوی کو مخاطب کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں اپنی المناکی اور دردمندی کی وجہ سے بڑی موثر ہیں۔ اس کی دو اور کتابیں "نامہ ھا' اور چشمہایش" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں علوی کا اسلوب ہدایت سے ملتا جلتا ہے عبارات سادہ' رواں اور بے تکلف ہیں۔ اس کی کہانیوں سے پلاٹ کی فنی مہارت عیاں ہے اس کے کردار متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔ اجتماعی مسائل پر اس کی تنقیدیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اجتماعی زندگی کے مسائل پر لکھنے والوں میں حسین قلی مستعان کی بڑی اہم شخصیت ہے۔ وہ نہ صرف قابل قدر صحافی ہیں بلکہ ناول نگار' ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ رہا۔ انہوں نے اخبار و رسائل میں بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ اندشیہ ہائے جوانی' اورارمغان زندگی' ان کے افسانوں کے مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ 1319 اور 1320 کے درمیان انہوں نے چوبیس ناولٹ یا طویل افسانے الگ کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ ان میں سے بعض دو دو بار بھی چھپے ہیں۔ انہوں نے عیش کوش امراء بدمعاشوں' جوان مردوں اور عورتوں کے انحرافات اور سوسائٹی کے بعض ضرور رساں آداب و رسوم کو تلخ حقائق

کے ماحول میں پیش کیا ہے۔ ان کے پلاٹ کی دلبستگیاں اور کردار قصہ کی زندہ تصویریں ایرانیوں کی آپ بیتیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر بعض لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دیں۔

نئے لکھنے والے بھی ہیں جن کا مستقبل درخشندہ نظر آتا ہے اور ممکن ہے کہ ادبیات فارسی میں ان کو نیا مقام حاصل ہو جائے۔ان کا اپنا خاص اسلوب بھی ہے۔ ان لکھنے والوں میں ایک اعتماد زادہ ہے جس کے افسانوں کا مجموعہ 1323 ش میں "پراگندہ" کے نام سے ضائع ہوا۔ کہانیوں کے موضوع مختلف ہیں۔ بعض کہانیوں میں اجتماعی امور پر تنقید کی ہے اور خاص طور پر زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں کو ظاہر کیا ہے۔

انہی دنوں صادق جوبک نے معاصرین میں ایک اچھا مقام حاصل کرلیا ہے۔ اس کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں تو صرف زندگی اور انسانی رفتار و کردار کے ایک گوشہ یا ایک منظر یا ایک حادثہ کی تصویر کھینچتی ہیں۔ اس مصنف کو منظر نگاری اور انسانی رفتار و کردار کی تصویر کشی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے معمولی سے معمولی واقعہ بھی بیان کی دلکشی سے دلچسپ ہو گیا ہے۔ جمال زادہ اور صادق ہدایت کے مانند اس کی زبان بھی روز مرہ اور محاورہ کے مطابق اور عوام کے زیادہ قریب ہے۔ جلال احمد بھی زیرک لکھنے والوں میں سے ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ "دمدو باردبد" کے نام سے 1327 میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں---------اور مدرسہ بھی شائع ہوئے اس مصنف کا اسلوب بھی خاص ہے۔ یہ بھی عوام اور نچلے طبقہ کے طرز تفکر کا شارح ہے خاص کر ان کے مذہبی رجحانات بیان کرنے میں خاص مہارت کھاتا۔

حال ہی میں نوری کا نام سر زبان رہا ہے اس کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں قوس قزح' خون بہا اور خاطرات خدا ان کے علاوہ ایک طویل مختصر افسانہ پرسیلا' کے نام سے الگ بھی شائع ہوا ہے۔ نوری کی اکثر کہانیوں کاموضوع ترغیبات جنسی ہے وہ خاص خاص شخصیتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور انسان کے جنسی تقاضوں اور ان کے انحرافات کو بیان کرتا ہے۔ یہ تمام افسانے عام نفسیات کی روشنی میں لکھے گئے۔ ہیں کیونکہ نوری امریکہ میں نفسیات کا طالب علم ہے اور اس کے اکثر افسانوں کی فضا امریکائی ہے۔ افسانہ نگاری کے نئے رجحانات میں نوری کا نام قابل توجہ ہے۔ اس میں اپج موجود ہے اس کے مشاہدات لطیف ہے اسکے موضوعات میں وسعت آجانے سے اس کے افسانے مقبولیت عامہ حاصل کرنے کے عناصر اپنے اندر رکھتے ہیں

ویسے معصب حلقوں ڈ میں اس پر کڑی تنقید ہو رہی ہے۔

نئے لکھنے والوں میں رسول پرویزی، بہرم صادقی، جمالی میر صادق اور صمد بہرنگی فریدون شکایتی فہرست میں ہیں ادیب بھی افسانے کی نئی تکنیک سے آشنا ہیں۔

جمال میر صادقی

1312 ش 1933ء میں پیدا ہوئے دبیرستان تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد معلم بن گئے اور ساتھ ہی زبان و ادبیات فارسی میں بے اے کیا ملعمی و تدریسی کے بعد وہ کتاب خانہ دانش سری عالی میں کام کرتے رہے۔ پھر سازمان امورداری استخامی میں کام کیا اور کچھ عرصہ سے سامان اسناد ملی ہیں۔ محقق کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تالیفات

شاہزادہ خانم سبز چشم	12 افسانے
چشم ہای من خستہ	10 افسانے
شہای نماستاد گل زرد	8 افسانے
درازنای شب	(ناول)
ابن شکستہ ہا	6 افسانے
سوی گلہای شن	
نہ آدمی نہ صدای	

مطالعہ ای در شناخت ادبیات داستانی و نگاہی کوتاہ بہ داستان نویسی معاصر ایران(1360)

صمد بہرنگی

1318 ش 1939ء کو تبریز میں پیدا ہوئے۔ 18 سال کی عمر میں معلم روستان آذربائیجان مقرر ہوئے وہ اپنی زندگی کے اختتام تک دیہاتی بچوں کی رہنمائی میں مصروف رہے۔ اور ان کے لئے

سادہ و سہل زبان میں کتابیں لکھتے رہے۔

انہوں نے عوامی قصوں کہانیوں کو قلمبند کر کے محفوظ کیا۔

تالیفات

کندو کلو مسائل تربیتی	1344
مثلما و چیستانہا(بابہروز رہقانی)	1344 ش
پسرک لبو فروش	1346
کچل کفتر باز	1346
عروسک سخن گو	1346
افسانہای محبت	1346
ماہی سیاہ کوچولو	1347
کلاغ سیاحہ وچند قصہ دیگر برای کودکان	1348
کوراوغلو وکچل حمزہ	1348
الدوز و کلاغہا	1348
22 ساعت در خواب وبیداری	1348
خرابکار، قصہ ہای ازچند نویسندہ (ترجمہ)	1348
مجموعہ مقالہ ہا	1348
یک ہلو وہزار ہلو	1348
تلخون وچند قصہ دیگر	1349
قصہ ہای بہرنگ چاپ سوم	1356

فریدون تنکابنی

1316ء میں پیدا ہوئے ادبیات ایران میں فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ علمی و تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ افسانے اور دوسرے تنقیدی مضامین لکھتے رہے اور ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع

ہو چکی ہیں۔

مردی در قفس	1320	اسیر خاک	1321
پیادہ شطرنج	1323	ستارہ ہای شب تیرہ	1337
یاد داشت ہای شہر	1338	پول، تنہا ارزش و معیار ارزشہا	1300

اس کی کہانیاں زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں۔ اس لہجے میں طنز ہے وہ واضح و صریح نقشہ کھینچتا ہے اس کی نثر سادہ و رواں ہے۔

سید محمد علی جمال زادہ

سید صاحب 1309ھ کو اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید جمال الدین اپنے شہر کے مشہور واعظ تھے۔ جمال زادہ نے ابتدائی تعلیم اپنے شہر میں حاصل کی پھر اپنے باپ کے ہمراہ تہران میں آگئے اور محلّہ سید ناصرالدین میں مقیم ہوگئے۔ 1908ء میں بیروت گئے اور تحصیلات متوسط وہیں ختم کیں اس کے بعد قانون کی تعلیم کے لئے فرانس میں مقیم رہے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے محکمہ امور خارجہ میں ملازم ہو کر برلن میں متعین ہوئے۔ 1915ء سے 1930ء کا زمانہ برلن میں گزارا۔ 1915ء میں وہ بغداد آگئے تاکہ انگریزوں اور روسیوں کے خلاف شورش پیدا کریں کرمانشاہاں میں انہوں نے کردوں پر مشتمل ایک فوج بھی تیار کی۔ وہ 16 ماہ بعد برلن واپس آگئے۔

برلن کے دوران قیام میں وہ دوسرے ایرانیوں کی معاونت سے مشہور رسالہ کاوہ شائع کرتے رہے۔ 1931ء سے انجمن بین الاقوام کے دفتر میں ملازم ہیں اور آج تک جنیوا میں کام کر رہے ہیں۔ وہ رے نو میں 109 کی عمر میں 17 آبان 1316 ش کو فوت ہوئے۔

وہ ایران میں 1335, 1326, 1328, 1329ھ ش میں مختلف مواقع پر ایران میں آئے فارسی تو ان کی اپنی زبان ٹھہری عربی میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ وہ جابجا عربی تراکیب کو خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث پر بھی انہیں عبور ہے جس کی تصدیق کتاب "صحرائی محشر" سے ہوتی ہے۔ جہاں انہوں نے بزرگوں کے عربی اقوال، احادیث اور آیات قرآنی سے استدلال کیا ہے۔ فرانسیسی اور جرمنی زبان میں بھی ان کو دسترس حاصل ہے لیکن وہ اپنی نگارشات میں ان دونوں رسالوں کے علم و ادب سے متاثر نہیں آتے۔ جس طرح ان کے معاصر

افسانہ نگار صادق ہدایت کافکا اور دستایوسکی سے اور دیگر مفکرین سے متاثر نظر آتے ہیں۔

تالیفات

متفرق

1- گنج شایگان، ایران کے اقتصادی حالات کاجائزہ ہے۔ اس میں تجارت، زراعت، معاون، صادرات و واردات اور مالیہ ایران کی تفصیلات درج ہیں یہ کتاب برلن میں 1935ء میں شائع ہوئی تھی۔

2- ہزار پیشہ یعنی ایک ہزار مطلب سودمند، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس کتاب میں موئف نے مختلف موضوعات اور واقعات سے متعلق اپنے تاثرات، معلومات یادداشتیں، لطائف، مشہور اشعار اور اقوال جمع کر دیئے ہیں یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے اور ایک ہی جلد پر مشتمل ہے۔ اسی قسم کی دو اور کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

3- صندوقچہ اسرار 2 جلد

4- کشکول جمالی 2 جلد

5- تاریخچہ روابط روسیہ و ایران

6- قصہ قصہ ہایاقصص العلماء

7- پندنامہ سعدی

8- جنگ ہفتاد و دولت (ترجمہ)

9- سروتہ یک کرباس، 1334 میں دو جلدوں میں شائع ہوئی اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے حالات اور مختلف تاثرات بیان کئے ہیں۔ اپنی بایو گرافی کے ساتھ ساتھ اصفہان کے رہنے والوں کے آداب و رسوم، عادات و اخلاق، شاہانہ عمارتوں اور مشہور شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

10- خاک و آدم

11- زمین و ارباب و دہقان

12- بانگ نای یعنی حکایات مثنوی مولوی

13- قہوہ خانہ سورات

14- ایران و مردم ایران

15- فرہنگ لغات عامیانہ

تراجم

1- داستان بشر از وان مون
2- و یللم تل از شلر
3- ودن کارلوی از شلر
4- خسیس از مولیر 1337
5- آزادی و حیثیت انسانی مولف و مترجم 1338
6- ہفت کشور
7- داستانہای برگزیدہ از نویسندگان خارجی
8- دشمن ملت از ایبسن 1336

افسانے اور ناول

1- یکی بود یکی نبود
2- دار المجانین 1331 ش
3- عمو حسین علی باہف قصہ 1321
4- قلتش دیوان
5- صحرائی محشر 1323
6- راہ آب نامہ
7- معصومہ شیرازی
8- تلخ و شیریں 1335
9- کہنہ و نو 1338
10- غیر از خدا ہیچ کس نبود 1340
11- مرکب محو 1344

جمال زادہ کی اصلی شہرت ان کی افسانہ نگاری اور نثر نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز ہیں اور ایران میں افسانہ نگاری کے گویا موجدوں میں شمار ہوتے ہیں۔

جمال زادہ نے ایک مرتبہ افسانے کے بارے میں اپنے زاویہ نظر سے گفتگو کی تھی[(۱۱)] جس کو پیش نظر رکھنے سے ان کے افسانوں کو سمجھنے اور نظر انتقاد سے دیکھنے میں مدد ملے گی۔ ان کا خیال ہے کہ افسانے کا واقعہ مبتذل اور پیش پا افتادہ نہ ہو اور حقیقت اور واقعیت کے خلاف نہ ہو۔ اس کا بیان تعجب انگیز اور تاثر خیز ہو تاکہ قاری پڑھ کر فرحت و شگفتگی محسوس کرے۔ موضوع کپاس یا اون ہے جو ایک ماہر بافندہ کے ہاتھ میں حسین اور قیمتی کپڑا بن جاتا ہے اور ایک انجان ناتجربہ کار کے ہاتھ سے موٹا گاڑھا یا کھردرا کمبل بن جاتا ہے۔

ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں یہ کچھ ضروری نہیں کہ افسانے میں ایک اخلاقی یا اجتماعی نتیجہ بھی ہو۔ البتہ ایران جیسے ملک میں جہاں لوگ اخلاقی و اجتماعی طور پر پسماندہ ہیں اگر افسانے کا موضوع دلچسپ ہو اور ساتھ ہی اخلاقی نتیجہ بھی مد نظر ہو تو بہت اچھا اور قابل تحسین ہے تاکہ لوگ اپنے معائب و نواقص سے باخبر ہوں۔ اگر ضمناً کسی سیاسی یا عملی مشکل کا حل پیش کیا ہو تو گوارا ہو سکتا ہے۔

داستان کا خاکہ اور اس کی فکر انگیز تعمیر اور ساتھ ہی حسن بیان افسانے کی بنیادی شرائط ہیں۔ فن تعمیر کے تمام اصول و قواعد کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ اس کی ساخت میں توازن و آہنگ کے ساتھ محکمی و استواری بھی رہے جس داستان میں ان عناصر کا خیال رکھا گیا ہے وہی داستان بہتر اور اعلیٰ ہے۔

"یکی بود و یکی نبود" کے دیباچہ میں جہاں انہوں نے افسانے کی دلچسپی اور مقبولیت کا ذکر کیا ہے وہاں سب سے زیادہ افسانے کی افادیت کا یہ پہلو خاص طور پر پیش کیا ہے کہ کہانی بیان کرتے وقت زبان عام فہم لکھی جائے۔ وہ اصطلاحات محاورات استعمال کئے جائیں جو روز مرہ کی زبان میں بولے جاتے ہیں۔ ایرانی کلاسیکی زبان اور روزانہ بول چال میں جو بعد اور فرق ہے وہ افسانہ کی زبان ہی سے دور ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات و افکار کو عوام تک پہنچانے کے لئے عام فہم بولی کا استعمال ہی زیادہ موزوں سمجھا ہے اور روز مرہ اور محاورہ کو ادب میں سمونے کے لئے نمایاں خدمت انجام دی ہیں۔ بیرونی ممالک کے لوگ ایران کے کلاسیکی ادب سے تو واقف ہیں لیکن ایران کی روز مرہ زبان سے آگاہ نہیں۔ علماء طبقہ کے لوگ اب بھی عربی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یا پھر تمدن غرب سے متاثر تعلیم یافتہ یورپین زبانوں کے الفاظ

تقریر و تحریر میں استعمال کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ مصنف نے اپنے افسانہ فارسی شکراست میں اسی قسم کے اسالیب گفتگو کا مذاق اڑایا ہے۔

"یکی بود و یکی نبود" سید صاحب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے جو 1339ھ ہجری میں شائع ہوا اور چھ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

سید صاحب اپنے وطن کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی سے آگاہ ہیں اور اپنے ہموطنوں کی پستی اخلاق کو دیکھ کر ان کا دل متاثر ہوتا ہے۔ "دوستی خالہ خرس" کے سوا سب کہانیوں میں کسی نہ کسی معاشرتی خرابی کا بیان ہے۔ مذکورہ بالا کہانی میں جنگ عظیم میں روسیوں کی سنگدلی اور بیوفائی کا قصہ بیان کیا ہے۔ ایک ایرانی نے ایک زخمی روسی پر رحم کھا کر اس کی جان بچائی لیکن اس نے اپنی حد ......میں پہنچ کر ایرانی کو روسیوں کے ہاتھوں مروا ڈالا۔ رجل سیاسی میں ایک سیاستدان کا کچا چٹھا عبرت ناک صورت میں پیش کیا ہے سیاسی لیڈر اپنی خود غرضیوں کے لئے عوام کو دھوکہ دے کر کس طرح لوٹتے ہیں، درد دل ملا قربان علی، ایک روضہ خوان کی ہوس ناکی، کم علمی اور پستی اخلاق کی خود نوشت داستان ہے "بیلہ دیگ بیلہ چغندر" میں ایرانیوں کی پسماندگی، سادہ لوحی اور جہالت کے ساتھ ساتھ ایرانی سوسائٹی کے تین طبقات یعنی مزدور، نوکر اور امراء کو اخلاقی نقطہ نظر سے عریاں کر کے پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد سید صاحب کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا اور امراء نے اس کو غدار وطن کہا۔ ملاں اور واعظوں نے کفر کے فتوے دیئے۔ آخر میں اس قدر پر جوش پروپیگنڈا کی وجہ سے یہ کتاب بحق سرکار ضبط ہو گئی۔

اس مجموعے کی سب کہانیاں مقصدی ہیں اور ان کی افادی حیثیت غالب ہے۔ بیلہ بیگ بیلہ چغندر، اور ویلان الدولہ، میں تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ بیانیہ انداز میں ایران کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا حال لکھا جا رہا ہے کہانیوں کا ماحول ایرانی ہے ایرانی متمثل ہو کر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں اور اپنا اپنا حال بیان کرتے ہیں یہ کہانیاں یقیناً حاجی بابا اصفہانی اور سیاحت نامہ ابراہیم بیگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔

ان افسانوں میں کہانی کا انداز یہ نہیں ہے کہ پہلے ابتدائی مقدمات بیان ہوں پھر قصہ عروج پر پہنچے اور آخر میں زوال اور پیچیدگیوں کی کشاد ہو کہانیوں کی اٹھان اس طرح ہو کہ پڑھنے والے کی توجہ اس کی طرف کچھ جائے اور مصنف پلاٹ کو اس طرح لپیٹ کر رکھے کہ آخر تک کہانی میں دلچسپی کم نہ ہو سید صاحب کی کہانی اس پیمانے سے نہیں ناپی جا سکتی۔ کہانیاں بایوگرافی کا انداز لئے

ہوئے ہیں۔ سب کہانیوں کا کردار ایک ایک شخص ہے جو اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے دو اشخاص یا دو زاویہ نظر کا ٹکراؤ جس سے کردار ابھرتے ہیں سید صاحب کی کہانی میں موجود نہیں۔ مصنف کی اپنی شخصیت ہر کہانی میں نمایاں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک دردمند محب وطن اس لئے کہانی بیان کر رہا ہے کہ اس کے ہم وطن اپنے کرتوتوں کو پڑھیں، شرم کریں۔ غیرت میں آئیں بیدار ہوں اور اپنی اصلاح کریں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کہانیاں اپنے اندر جوش و اخلاص لئے ہوئے ہیں۔ ایرانی روز مرہ محاورہ کی چاشنی سے بیان میں ایک چٹپٹا پن پایا جاتا ہے مصنف کو عوامی بولی پر پورا عبور حاصل ہے۔

"یکی بود و یکی نبود" کو بانو استلا کورین نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔

"عمو حسین علی" سید صاحب کی سات کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کے پہلے افسانہ شاہکار میں "یکی بود و یکی نبود" کی متضاد موافقت و مخالفت کا ذکر ہے۔ اس میں مصنف نے لوگوں کی بے حسی، غفلت اور عاقبت نااندیشی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ چونکہ موخرالذکر کتاب سخت مخالفت کی وجہ سے ضبط ہو چکی تھی۔ اس لئے مصنف کے حامیوں کے نقطہ نگاہ سے یہ کتاب اس کا شاہکار ہوتے ہوئے بھی کتب فروشوں تک محجوب رہی۔ اس پہلے عنوان کی ذیل میں عمو حسین علی کا قصہ ہے جو اپنے واعظ، امام، معلم اور مفتی کے شغل منافقت سے بیزار ہو کر گاؤں میں زراعت پر مجبور ہوا اور اپنی محنت اور پسینے کی کمائی سے اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔ مصنف زراعت کو حلال روزی کے لئے سب سے افضل پیشہ سمجھتے ہیں۔ افسانہ شاہکار کی اہمیت کے پیش نظر اس کو پھیلا کر الگ شائع کر کے جلد اول قرار دیا گیا ہے اور باقی چھ افسانے دوسری جلد میں شامل کئے گئے ہیں۔ دوسرے افسانہ نوع پرست میں وہ اپنے اس خیال کو پیش کرتے ہیں کہ موجود یورپی تہذیب و تمدن اور جمہوریت کے انداز سیدھی سادہ زندگی بسر کرنے والوں میں باہمی عناد حسد اور مفاد ذاتی کے لئے کشمکش پیدا کر دیتے ہیں اور ان کی زندگی سے پہلا سا سکون اور امن اٹھ جاتا ہے۔ افسانہ کی ٹیکنیک کے اعتبار سے "پلنگ" ان کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ مصنف نے اس میں برلن کے ایک دوست، "فرتیس" کی المناک موت کا قصہ بیان کیا ہے فرتیس ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کو ہندوستان لے جانا چاہتا ہے لیکن راستے میں جہاز پر وہ لڑکی کسی اور شخص سے مانوس ہو کر مصر میں اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ فرتیس مایوس ہو کر غم کو بھلا دیتا ہے اور ہندوستان کا سفر کر کے وہاں سے ایک "پلنگ" کو تسخیر کر کے برلن لاتا ہے اور سرکس میں اپنے کمالات دکھاتا ہے اپنی مقناطیسی قوت بینائی سے شیر کو مختلف کرتب

دکھانے پر مجبور کرتا ہے _ ایک دن اس کی وہی محبوبہ سرکس دیکھنے آ جاتی ہے۔ فرتمیں اس کو دیکھ کر بے بس ہو جاتا ہے گویا اس کے ارادہ میں پہلا سا غلبہ اور اس کی آنکھوں میں پہلی سے قوت نہیں رہتی۔ اس دن کے کھیل میں شیر اس کا کہا نہیں مانتا اور چمک کر اس کی گردن پر جھپٹ پڑتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے فرتمیں پستول سے شیر کو بھی ہلاک کر دیتا ہے اس کی محبوبہ یہ ماجرا دیکھ کر اپنے آپ کو پستول مار کر فرتمیں کے سینہ پر گر پڑتی ہے۔ تماشائی یہ منظر دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اس کہانی کے شائع ہونے پر ایرانیوں نے جمال زادہ کو خطوط بھی لکھے کہ وہ ایسی المیہ کہانی لکھ کر ہم مصیبت زدوں کو اور کیوں رلاتے ہیں۔ شاید اس سے متاثر ہو کر انہوں نے کباب غاز لکھا جس میں ہنسی اور ظرافت کا خوب سامان اکٹھا کر دیا۔ اس افسانہ میں ظرافت پیدا کرنے کے لئے سید صاحب نے کئی ذرائع سے کام لیا ہے۔ ایک تو الفاظ و محاورات کا برجستہ اور شگفتہ استعمال ہلکی ظرافت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے دوسرے ان کے خیالات کی ندرت' لطافت اور ایمائیت مسکراہٹ پیدا کرتی ہے۔ تیسرے کردار قصہ کا لباس' وضع قطع اور شکل وصورت کا مبالغہ آمیز بیان اور چوتھے خود اس کی حرکات ہنسنے ہنسانے اور قہقہہ لگانے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔ "کباب غاز" میں مصطفےٰ کے کردار میں یہ تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔

صحرائی محشر کا سنہ تصنیف 1323 ہجری شمسی ہے۔ پڑھتے پڑھتے یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف نے شاید دانتے کی طربیہ آسمانی یا المعری کے رسالہ غفران سے متاثر ہو کر سیر افلاک کے بجائے صحرائے محشر کا نقشہ کھینچا ہے۔ اقبال کا جاوید نامہ بھی اسی طرح کی چیز ہے۔ اردو ادب میں محمد حسین آزاد کا شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار یا کسی صاحب کا جنت میں مشاعرہ' صحرائے محشر سے مشابہ ہیں جس طرح افلاک میں یا دربار میں یا مشاعرہ میں گزرے ہوئے شاعروں' فلسفیوں اور درویشوں سے ملاقات ہوتی ہے اور مصنف ان بزرگوں کی روحوں سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتا ہے۔ اپنی مشکلات کا حل پوچھتا ہے یا ان کے بعض افکار و خیالات کی تشریح کرتا ہے۔ صحرائی محشر کا بھی یہی انداز ہے احادیث و روایات میں میدان قیامت کا جو نقشہ ملتا ہے انہیں کی بنا پر مصنف نے اس کی ایک وسیع تخیل پیش کیا ہے۔ مختلف اقوام کے افراد اپنی قومی خصوصیات کے ساتھ قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں حاضر ہوتے ہیں یہودی اپنے روایتی بخل اور ہوس کا اظہار کرتا ہے۔ انگریز اپنی احتیاط اور نکتہ رسی کو نہیں چھوڑتا وغیرہ لوگ میزان عدل کے سامنے اپنے اعمال کا اعتراف کرتے ہوئے پیش ہوتے ہیں اور ان پر جنت اور دوزخ کے داروغے اپنے اپنے کام اور فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہیں۔ ایک فرشتہ مصنف کا راہنما ہے جو اس کو مختلف طبقات کی سیر کرا رہا ہے جہاں پاکباز اور نیک سیرت درویشوں مثلاً ابوسعید ابوالخیر کو جنت میں داخل کیا ہے۔ وہاں ان ریا کار فقیروں' معلم صوفیوں اور بے بصیرت علماء کو بھی جہنم واصل کیا ہے۔ خاص طور پر ملاؤں کی توہین و تذلیل کی ہے دربار خداوندی کے حضور بازخواست کے لئے منصور حلاج اور عمر خیام بھی پیش ہوئے ہیں۔ مصنف نے خیام کے عقائد و افکار کو زیر بحث لا کر اس کے ریب و تشکک۔ حیات و ممات عالم غیب و شہود کے مسائل لاینحل کا ذکر کیا ہے اور خدا کے حضور اس کی گستاخیوں پر تنبیہہ کی ہے مصنف نے میزان عدل کے سامنے فقیہ روسی کے عنوان سے حوادث زمانہ کی ماری ہوئی ایک مظلوم لڑکی کی درد ناک داستان بیان کی ہے جو اپنی عصمت بیچنے پر مجبور ہوئی اسپر مظالم کرنے والوں میں ایک ملا بھی ہے جو خدا کے حضور اپنے کرتوت سن کر سر بہ گریباں کھڑا ہے آخری قصہ اس شخص کا ہے جو شیطان کی وساطت سے ابدی جنت میں داخل ہوتا ہے لیکن دائمی زندگی سے اکتا کر مرنے کی خواہش کرتا ہے شیطان اب راندہ درگاہ نہیں بلکہ پھر مقرب بارگاہ خداوندی بن چکا ہے وہ انسانوں کا دشمن نہیں بلکہ وہ ان کا ممنون ہے کیونکہ انہیں کی بدولت اسے درد و اندوہ ملا ہے اس کا بیان ہے کہ خدا کے حکام سے وہ اس لئے باغی ہوا اور آدم کو سجدہ کرنے سے اس لئے منکر ہوا کہ وہ اپنی فضیلت اور آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

مصنف نے بہشت کے متعلق بعض وضعی روایات یا احادیث کو اپنے مشاہدات کی بناء پر جھوٹا اور غلط قرار دیا ہے مثلاً یہ حدیث کہ "من بشرنی بخروج الصفر بشرنہ بالجنتہ" وغیرہ۔ اس نے قرآنی آیات' احادیث مولانا روم' حافظ' سعدی کے اشعار اور خیام کی رباعیات کو مناسب موقعوں پر استعمال کر کے اپنے بیان کو تقویت دی ہے۔

اگرچہ مصنف خود عربی الفاظ بڑی مہارت اور فصاحت سے استعمال کرتے ہیں لیکن عرب اور عربی زبان کے متعلق ان کا تعصب بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے دنیا کی اتنی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب ناموزوں ہے (صفحہ 6) عرب کو حیوان خوش غلف لکھا (ص 75)_ اپنے مسلک کے متعلق ان کو اتنا یقین ہے کہ وہ صحرائے محشر میں بھی فرشتوں کو یاعلی' یا علی کہتے سنتے ہیں (ص 67) وہ لکھتے ہیں کہ میدان قیامت میں جو قطاریں باندھی گئی ہیں وہ پنج تن۔ دوازدہ امام اور چہار ازدہ معصوم کے احترام میں پانچ یا بارہ یا چودہ صفحوں پر مشتمل ہیں۔

صحرائے محشر خاص طور پر ایرانیوں کے لئے برپا کیا گیا ہے اس یوم حساب میں امراء حکام' بادشاہ

اور سرمایہ دار کم نظر آتے ہیں ملا، روضہ خوان، فقیر عورتیں اور متوسط طبقہ کے لوگ زیادہ نمایاں ہیں۔ افسانے کی ساخت تو درست ہے لیکن پلاٹ کا عروج اور اختتام نہیں۔ ناشر نے تصاویر کی مدد سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے تین ابواب کی رفتار ست ہے۔ عبارت بھی رواں دواں نہیں۔ قفیہ دروپی، میں مظلوم محمود کا کردار آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ بیان میں تصوریت موجود ہے۔ دوسرے افسانے یعنی بلای بقا اور مصیبت خلود، کا پلاٹ بھی خوب سوچ سمجھ کر ترتیب دیا گیا ہے اس میں افسانہ کی صحیح ہیئت قائم ہے۔ کہانی کے اندر ابتدا۔ عروج اور اختتام ملتا ہے کشمکش بھی نمایاں ہے۔اگرچہ کہانی کی رفتار میں روانی نہیں لیکن دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے یہ دو افسانے گویا افسانے کے اندر افسانے ہیں۔

راہ آب نامہ

ایک طویل افسانہ ہے اور ٹیکنیک کے لحاظ سے بڑی کامیاب کہانی ہے۔ افسانہ کہنے والا ایک دوست روح اللہ کو امام زادہ زید کے مزار پر ملا۔ یہ صاحب انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بہن کی شادی میں شرکت کیلئے واپس بلائے گئے یہاں طہران میں ان کے محلے میں حوض کی نالی یعنی راہ آب (جو اس افسانے کا نام ہے) بند ہو گئی تھی۔ اس نے پانچ محلّہ داروں کے مشورہ سے نالی کو درست کرانے کا ذمہ لیا طے یہ پایا کہ جتنا خرچ اٹھے گا وہ باہم برابر تقسیم کرلیں گے۔ نالی ساری اکھاڑ کر بنانی پڑ گئی۔ اس پر کافی خرچ ہو گیا۔ بعد میں محلے والوں نے اپنا حصہ دینے سے انکار کردیا۔ روح اللہ کے پاس جتنا روپیہ تھا وہ صرف ہو گیا اور وہ تعلیم جاری رکھنے کیلئے انگلستان واپس نہ جا سکا چونکہ حوض کا پانی ان کے مکان کے اندر رس رس کر داخل ہو رہا تھا۔ اس لئے مکان کا ایک کمرہ بھی بیٹھ گیا۔ اب اپنے حالات سے مجبور ہو کر اس نے امام زادہ زید میں ایک حجرہ لے لیا اور وہیں رہ کر وہ آثار قدیمہ کی تحقیق و اکتشاف کرتا تھا اور رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر گزارہ کرتا تھا۔

کہانی کی ساخت اور پلاٹ میں آغاز ارتقا اور اختتام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہانی نقطہ عروج پر بھی پہنچتی ہے۔ آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ کہانی کے پچھلے چودہ پندرہ صفحوں میں ایرانیوں کی اخلاقی خرابیوں پر تاثرات ہیں اور ایک مضمون یا مکالمہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اگر یہ حذف بھی کردیئے جاتے تو کہانی کے مجموعی تاثر میں کچھ فرق نہ پڑتا کیونکہ جن چیزوں کا ذکر کیا

جارہا ہے وہ کہانی کے کردار سے پہلے ہی نمایاں ہو چکی ہیں مصنف نے محلے کے جن پانچ اشخاص کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں شاعر آغا اور اس کی بیوی بچوں کا تعارف طویل ہو گیا ہے اور یہ لمبا بیان بذاتہ ایک افسانہ بن گیا ہے۔ ربابہ سلطان شاعر آقا کی بیوی جو افسانہ منظوم بچوں کو سنایا کرتی تھی اور شاعر آغا جو پہیلیاں سنایا کرتے تھے۔ مصنف نے روح اللہ کی زبانی وہ بھی درج کردی ہیں۔ یہ کچھ واقعیت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ روح اللہ نہ دن کو اور نہ رات کو اس نانوا کے گھر رہتا تھا نہ کبھی وہاں جاتا تھا۔ اس لئے اس کو ان کی اس قدر نجی زندگی کا کیسے علم ہو سکتا تھا۔

راہ آب نامہ کے کردار بڑے واضح اور جاندار ہیں۔ روح اللہ انگلستان سے تعلیم یافتہ حساس درد مند باتمیز نوجوان ہے۔ مسجد کا نیم ملا رجب علی، نیم حکیم مرزا موش، نیم سیاسی ملت خواہ، ادھیڑ عمر کی فیشن پرست بیگم خاں اور مزدور طبقے کا نمائندہ شاطر نانوا اور ایک فرنگی ماب معمار اور مہندس اس قصہ کے اہم کردار ہیں۔ مصنف کے اپنے بیان سے اور کرداروں کے اپنے مکالموں سے ہر ایک کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے سید جمال زادہ کے مشاہدات غائر اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے کردار نگاری میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔

راہ آب نامہ میں رضا شاہ سے پہلے اور مشروطہ کے درمیانی زمانے میں ایران کی معاشرتی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ حکومتی اداروں میں نااہلی، رشوت ستانی اور کنبہ پروری کا زور ہے۔ درمیانے اور نچلے طبقے کے لوگ پست اخلاق ہیں۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک بد معاملہ، جاہل، ریاکار، باتونی، تکلف پسند اور کام چور ہیں۔

ناولٹ کی افادی اور مقصدی حیثیت واضح ہے۔ ایرانیوں کا اپنا کردار ان کے سامنے پیش کرکے ان کے دل میں اصلاح کا ایک شعور اور احساس پیدا کرنے کی ایک بہترین کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اخلاق و کردار پر بے لاگ تنقید اور تعریض کی ہے۔

سید صاحب کو عوامانہ زبان اور اصطلاحات پر وہ عبور ہے کہ باید و شاید۔ نسوانی محاورہ کے استعمال میں بھی انہوں نے کمال انشا کا ثبوت دیا ہے۔ پانچ اشخاص قصہ کی وہ پانچ تقریریں جو انہوں نے راہ آب کی تعمیر کی حمایت میں ارشاد فرمائیں وہ ان کی انفرادی خصوصیات کی حامل ہیں اور ہر تقریر میں کردار کی انفرادیت موجود ہے اور کردار نگاری میں یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی ہے مصنف کو برمحل اشعار کہنے کا بھی خوب ملکہ حاصل ہے۔

قلتش دیوان بھی ایک طویل افسانہ ہے۔ سنہ تصنیف 1324 ہجری شمسی ہے۔ پہلے باب میں

ایک محلے کا ذکر ہے۔ اس کے رہنے والوں اور ان کے باہمی مراسم زندگی کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں اسی محلے کے ایک دیانتدار، دردمند ملت خواہ مسلمان حاج شیخ سقط فروش کا ذکر ہے جس کی ساری زندگی خدمت و ایثار کی زندگی ہے۔ تیسرے باب میں ایک مصنوعی خان جاہل، ظالم اور سنگدل افراسیاب قلتش دیوان کا ذکر ہے۔ چوتھے میں فریب و ستم کے مقابلے میں دیانت داری اور نیکی کی جنگ ہے اور پانچویں میں ظلم کی فتح ہے لیکن آخر موت کے ہاتھوں ظالم کا بھی سر نیچا ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں مصنف نے جنگ اور اس کے بعد کے زمانے کا تہران پیش کیا ہے۔ مستبد اور مشروطہ طلبوں کی باہمی آویزش جابجا نظر آتی ہے۔ وزراء، امراء، حکمران، عیاش، بے رحم اور غاصب ہیں۔ عوام غریب مصیبت زدہ اور مفلوک الحال ہیں۔ حق رسی اور داد رسی کا کوئی انتظام نہیں۔ حکام اور امراء نے بدمعاش ملازم رکھے ہوئے ہیں جو ان کے مخالفین کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ قاتل کی پناہ گاہ خود حکومت ہے۔ حکومت کے ساتھ اثر و رسوخ رکھنے والے امیر جنگ کے ناساز گار حالات سے فائدہ اٹھا کر ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں اور غریب عوام بے کاری، بیماری اور فاقہ کشی سے غریب تر ہوئے ہوجاتے ہیں۔ قلتش دیوان اپنی فریب کاریوں سے حکام اور پریس کی مدد سے نیک نام، سرپرست یتامیٰ ہو کر مرتا ہے اور حاج شیخ سقط فروش ذخیرہ اندوز ذلیل اور بدنام ہو کر جان دیتا ہے۔ افسانہ میں اس زمانے کی اقتصادی معاشرتی اور اخلاقی زندگی اپنے صحیح خط و خال میں نمایاں ہے۔

کہانی کی ساخت درست ہے۔ پلاٹ میں ارتقا موجود ہے دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے کردار پیش کرنے میں مصنف نے بہترین تجزیہ نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ افسانے کا ایک ایک کردار جیتا جاگتا شخص معلوم ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھوں میں ہوبہو اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ قلتش دیوان، حاج شیخ سقط فروش اور حاکم شہر کا کردار اپنی وضاحت اور صراحت کے لحاظ سے کامل ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

افسانے میں تین چار مناظر، کالموں کی برجستگی، ڈرامائیت اور کردار قصہ کو ابھارنے کیلئے قابل ذکر ہیں مثلاً مرزا عنایت اللہ اور قلتش کی چپقلش، حاج شیخ سقط فروش اور اس کی بیوی کا مناظرہ اور حاج شیخ اور حاکم شہر کی آویزش۔

تلخ و شیریں: سات افسانوں کا مجموعہ ہے جو 1334 ش میں شائع ہوا۔ اس میں وہ افسانے شامل ہیں جو 1321- 1322 اور 1324 میں لکھے گئے ہیں۔ صرف "پیشوا" 1332 میں لکھا گیا ہے۔

افسانہ کی ٹیکنیک کے اعتبار سے "خواستگاری" اور "پیشوا" ہی افسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں کیونکہ عموماً افسانہ کی شرائط میں یہ ضروری ہے کہ کہانی مختصر ہو، مرکزی خیال ایک ہو، کردار کی تعداد محدود ہو اور وہ آپس میں مربوط ہوں۔ کہانی میں اگر پلاٹ ہو تو اس کا آغاز و انجام ہو۔ یہ شرائط کامل طور پر کسی افسانے میں بھی موجود نہیں۔ مصنف نے ایک ایک عنوان میں دو دو تین تین کہانیاں شامل کر دی ہیں مثلاً ایک روز در ستم آباد میں گویا تین افسانے شامل ہیں۔ پہلے میں وہ ایک قہوہ خانے میں پہنچتے ہیں تو قہوہ پی کر ساری زندگی کا حال لکھ ڈالتے ہیں۔ دوسرے میں ان کے دو دوستوں میں عباس آقا اور اکبر آقا کے متخالف و متضاد نظریہ ہائے زندگی کا تذکرہ ہے تیسرے میں قہوہ خانے کے ایک مشاعرے کا کامل حال بیان کیا ہے، درویش مومیائی، میں بھی دو کہانیاں الگ الگ ہو سکتی ہیں۔ پہلے حصے میں ایک خوشحال مہمان نواز لیکن ایک متعصب شخص کا کردار پیش کیا ہے جو تورات کے خلاف عقلی بیانات سن کر اور اصل کتاب میں دیکھ کر بھی اپنے عقائد سے ذرہ بھر بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ دوسرے حصے میں ایک ایرانی باہوش و حساس نوجوان کا کردار ہے جو خدا، کائنات اور زندگی کے اسرار کو نہیں سمجھ سکا اور رنج و غم اور افلاس و بیکاری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہی ایرانی جوان ہے جس کو مصنف نے درویش مومیائی کہا ہے۔ اس لئے افسانے کے پہلے حصے کا عنوان سے کچھ تعلق نہیں۔ یہی حال آتش زیر خاکستر کا ہے۔ اس میں بھی چار پانچ کردار ہیں جن کی بذاتہ الگ الگ کہانی ہے۔ مصنف نے حکومت کی بد نظمی، لاقانونی اور افسروں اور عہدہ داروں کی رشوت خواری اور فرض ناشناسی واضح کرنے کیلئے ان سب خرابیوں کو ایک ہی جگہ اکٹھا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ رحمت اللہ کی کہانی خود علیحدہ ایک افسانہ ہے۔ تمام افسانوں میں صرف اس میں کہانی کا عنصر زیادہ ہے اور پلاٹ بھی نمایاں ہے وگرنہ باقی سب میں خاص عقاید و افکار بیان کرنے کیلئے یا کسی شخصیت کو واضح کرنے کیلئے واقعات بیان کئے ہیں مثلاً ایک روز در ستم آباد، میں دو بھائیوں کا ذکر ہے جو حافظ کے دو شعروں سے متاثر ہیں اور ان کو نصب العین بنا کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک عیش و عشرت کا دلدادہ ہے اور دوسرا فلسفہ و تصوف میں سکون پاتا ہے ایک تو اس شعر کا مرید ہے:

مباش بی می و مطرب کہ زیر طاق سپہر　　بدین ترانہ غم از دل بدر توانی کرد

اور دوسرا اس شعر پر عمل کر رہا ہے۔

تو کز سرای طبیعت نمی روی بیرون　　کجا بکوی حقیقت گزر توانی کرد

"حق و ناحق" میں زنبور و پروانہ کی زبان سے مباحثہ ہے جس سے کلیلہ و دمنہ کی یاد تازہ ہوتی

ہے "درویش مومیائی" میں ایک شکاک قنوطی اور لاادری کے خیالات بیان کئے گئے ہیں جو خیام کے ساتھ ہم نوا ہے اور کہتا ہے:

دوری کہ دراو آمدن و رفتن ماست　آنرا کہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می ترندومی در این معنی راست کاین آمدن از کجا درفتن بجاست

"خواستگاری" میں دو شخصی ایک نوجوان کے متعلق متضاد رائے کا اظہار کرتے ہیں مصنف مثنوی مولانا روم سے استخارہ کرکے رائے دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق ایک چیز کو پسند کرتا ہے۔ کسی کو زہر مفید ہے اور کسی کیلئے شہد بھی زہر کا حکم رکھتا ہے۔ "پیشوا" میں تیز و تند' پرجوش جذبات رکھنے والے نوجوانوں کو نصیحت کی ہے کہ لیڈر بننے سے پہلے جدید علوم سے استفادہ کریں۔ بین الاقوامی سیاسیات کا مطالعہ کریں اور پھر رہنما بننے کی کوشش کریں۔ محض کشت و خون اور نعروں سے وطن کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

ان افسانوں کی زبان میں پہلا سا چٹخارہ اور شگفتگی نہیں۔ وہی پہلے محاورات ہیں جو بار بار استعمال ہورہے ہیں ویسے زبان کی توانائی تو بہرحال واضح ہے۔

اکثر کہانیوں سے تصنع کی بو آتی ہے۔ حقیقت کا کم گمان ہوتا ہے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کوشش کرکے اپنے خیالات و افکار کو بیان کررہا ہے ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ کہانی کے کردار موقع موقع پر طبعی طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اکثر کہانیوں میں مباحث کا عنصر زیادہ ہے "آتش زیر خاکستر" میں کہانی اور پلاٹ موجود ہے لیکن مصنف کے معہود فی الذہن چند چیزیں ہیں جن کو نمایاں کرنے کیلئے SITUATION بنائے جارہا ہے۔ پولیس کی سختی اور تشدد دکھانے کیلئے عنایت کے گھر میں اچانک پولیس چھاپہ مارتی ہے۔ ہسپتالوں میں غیر ذمہ دار عملے کی بے پروائی اور سنگدلی دکھانے کیلئے زن کدخدا کا بچہ بیمار بنا کر اس کو شہر بھجوا دیا جاتا ہے حالانکہ کہانی سے اس کا اضافی تعلق ہے۔

جمال زادہ پر یہ اعتراض کیا جارہا ہے کہ وہ بیس تیس سال سے اپنے وطن سے باہر ہیں۔ اس لئے انہوں نے یہاں کے تحولات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ سنی سنائی باتوں کو ذہن میں رکھ کر نقشے کھینچتے ہیں۔

"تلخ و شیریں" کو پڑھ کر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مصنف کا کمال سمجھنا چاہئے کہ وہ اب بھی ایرانیوں کے اطوار اس صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ ہوبہو آنکھوں کے سامنے تصویریں کھنچ جاتی ہیں۔ ان کا تخیل واضح ہے اور اس کے بیان میں صراحت

موجود ہے۔ ایرانیوں سے دوری کی وجہ سے اخلاص کی کمی کا احساس ہوتا ہے ان افسانوں میں کہیں کہیں وعظ و خطابہ کا لہجہ بھی پایا جاتا ہے۔

غیراز خدا ہیچکس نبود:

جمال زادہ کی کہانیوں کا یہ آخری مجموعہ ہے جو 1340ھ ش میں شائع ہوا۔ مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں کہ کہانیوں کا پہلا مجموعہ چالیس سال پہلے "یکی بود و یکی نبود" کے عنوان سے چھپا تھا۔ جس طرح کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "غیراز خدا ہیچکس نبود" ان موجودہ کہانیوں کا نام "غیراز خدا ہیچکس نبود" اس لئے رکھا گیا ہے کہ شاید ایران و ایرانیوں کی زندگی کے متعلق یہ میری آخری داستانیں ہوں۔

اس مجموعے میں پانچ افسانے ہیں۔ اخوندواریم و اخوند' ڈرامہ ہے اور قیصر و ایلچی ایک مقالہ ہے جس میں ان تفاصیل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو قیصر روم کالیگولا کے دربار میں شہنشاہ اشکانی اردوان سوم کے ایلچی نے اس زمانے کے متعلق لکھی تھیں اور جو اب سپین میں قدیم شہر' **ایمپوریا** کی کھدائی پر دستاویزات کے انکشاف پر معلوم ہوئی ہیں۔

افسانوں کے نام یہ ہیں: حسابہای کہ ..... (آواز در گرمابہ) قلب ماہیت' دو **آتشہ** میرزا خطاب اور **امینت** شکم۔ یہ افسانے 1958 سے 1962 کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان سب میں ایرانی کردار محور سخن ہے۔ تمام کہانیاں مقصدی ہیں۔ مصنف کو اب بھی ایران میں امام زادوں کے مزار پر ایسے سجادہ نشین نظر آتے ہیں جو عوام کو فریب دیکر ان کا مال لوٹتے ہیں۔ ایسے اشخاص موجود ہیں جو ایران قدیم سے محبت رکھتے ہیں ہر قدیم چیز پر فخر کرتے ہیں اور ایران کو تمام علوم و فنون کا منبع سمجھتے ہیں۔ فرنگیوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن خود وہ ہر فرنگی چیز استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا' کھانا پینا سب یورپ امریکہ سے آتا ہے۔ ایک صاحب ہیں جو ایک سرکاری ادارہ میں ملازم ہیں لیکن ایران کا وزیراعظم بننے کے منصوبے سوچتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں اور خیال آرائیاں کرتے ہیں۔ میرزا خطاب ایک نازک بدن فیشن پرست دھان پان قسم کے استاد ہیں جو فارسی رسم الخط کی ترمیم و اصلاح کے مدعی ہیں اور بچوں کو آسان طریق پر لکھنا سکھاتے ہیں مگر قدامت پرست **متعصب** اشخاص کی طرف سے ان کی مخالفت ہوتی ہے۔ وہ خود کمزور ہیں لیکن ورزش کے استاد ہیں۔ جمناسٹک کا مظاہرہ کرتے وقت آلہ ورزشی پر ہی ان کی

جان نکل جاتی ہے۔ "امینت شکم" میں مصنف نے یہ گر بتایا ہے کہ جس شخص کی آمدن زیادہ ہو اور خرچ کم کرتا ہو اور پس انداز کرتا ہو وہ یقیناً ہشاش بشاش مطمئن اور آسودہ حال رہے گا۔

مصنف نے "آواز درگرمابہ" اور دو آتشہ میں طنز و تعریض سے کام لیا ہے اور ایرانی نظامیہ اور ایرانی معاشرہ کے عیوب کو اجاگر کیا ہے۔ بعض کہانیوں میں تصنع کی جھلک نمایاں ہے اور مضمون کا شبہ ہوتا ہے۔ "قلب ماہیت' آواز درگرمابہ اور امینت شکم" کے انجام میں کچھ تعجب موجود ہے جس سے شگفتگی کا امکان ہے۔

مصنف کے اسلوب بیان میں کمال کی صراحت و وضاحت ہے اس کو اپنے کلام پر غایت قدر حاصل ہے۔ "دو آتشہ" میں معاہدہ کی دستاویز اور ابوتراب کے متعلق دن رات کی کارگزاری پر رپورٹ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اب مصنف کا لہجہ دھیما ہوگیا ہے اور متانت آگئی ہے۔ وہ پہلا سا جوش و تشدد نہیں رہا۔

صادق ہدایت

صادق ہدایت 18 بہمن 1281 ہجری شمسی (1903ء) میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی زندگی تہران میں گزری۔ دبیرستان فرانسہ میں تعلیم حاصل کی۔ جوانی میں تعلیم کیلئے فرانس گئے لیکن خاص علم و فن میں تحصیلات نہ کرسکے۔ وہ مغربی انداز و فکر و تحقیق سے ضرور آشنا ہوئے اور مصنّفین کے نئے مکاتیب فکر کا ضرور مطالعہ کیا اور اپنی خلاق اور ذہین فکر سے لکھنے کا نیا انداز سیکھا۔ فرانس کے دوران قیام میں ہی انہوں نے افسانے لکھے جو بعد میں زندہ بگور اور سہ قطرۂ خون کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے پروین (ڈرامہ) افسانہ آفرینش اور کتاب فواید گیاہ خواری اسی عرصہ میں لکھی گئیں۔ 1311 سے 1313 تک وہ ادارہ کل تجارت کے رکن بنے۔ 1314 میں وزارت خارجہ میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد شرکت سہامی **ساختمانی** میں شامل ہوگئے لیکن ان کاموں سے اکتا کر 1315 میں بمبئی گئے اور پہلوی زبان سیکھی۔ وہاں سے واپس آکر ایک سال تک بانک ملی ایران میں ملازمت کی۔ 1324 میں ایک دو مہینوں کیلئے تاشقند گئے اور وہاں کی یونیورسٹی میں قلمی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ عمر کا زیادہ تر حصہ تہران میں بسر کیا۔ کئی سال تک دانش کدہ ہنرہای زیبا میں مترجم کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ صبح و شام ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں گزارتے۔ وہیں شراب پیتے اور سبزی خوری کرتے اور وہیں دوستوں سے صحبتیں اور ملاقاتیں ہوتیں۔

صادق ہدایت نے ساری عمر ایک سادہ زندگی بسر کی۔ اس کے خاندان کے لوگ حکومت اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے لیکن انہوں نے جاہ و حشم سے بے نیاز ہوکر ساری زندگی باپ کے گھر تجرد میں گزاردی۔ ہندوستان کے دوران قیام میں اسے دو ایرانی شہکار حسن لڑکیاں نظر آئی تھیں۔ وہ شادی پر رضامند بھی ہوگئے تھے لیکن لڑکی ان سے شادی پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس لئے ان کو بہت صدمہ ہوا۔ انسانوں سے بیزار ہوکر انہوں نے حیوانوں سے لو لگائی۔ گھر میں ایک بلی پال رکھی تھی۔ اس سے غایت محبت رکھتے تھے۔ کھلاتے پلاتے' کھیلتے' باتیں کرتے۔ وہ تنہائی میں اس کی مونس و غمگسار تھی ایک دن اتفاقاً وہ آئے تو گھر میں نہیں تھی۔ ہمسائیگی میں ایک نر ہم جنس کی آواز سن کر وہ نہ رہ سکی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جب لمبی غیر حاضری کے بعد لوٹی تو صادق کو بہت غصہ آیا کہ یہ بھی بے وفا نکلی۔ پستول اٹھایا اور اسے وہیں ہلاک کردیا۔

ان کی آوارہ گردی اور لاابالیانہ زندگی سب کی نظروں میں کھٹکتی تھی لیکن انہوں نے اپنا

وقت ضائع نہیں کیا۔ خوب فکر کیا۔ خوب مطالعہ کیا اور 1306 سے 1329 یعنی 23 سالہ ادبی زندگی میں انہوں نے جو معنوی یادگاریں چھوڑی ہیں وہ ان کی ظاہری لا ابالی زندگی کی بے مثال تلافی کرتی ہیں۔

صادق اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بیزار تھے۔ انہوں نے اکتوبر 1948ء میں جمال زادہ کو لکھا تھا "اب میں زندگی سے تھک ہار گیا ہوں۔ اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب نہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہوں اور نہ مجھے خود کشی کی غیرت ہے" وہ ہاتھی اور بلی کی طرح تنہائی میں مرجانا چاہتے تھے۔ وہ جوانی میں ہی آزردہ خاطر رہتے تھے۔ اجتماعی زندگی سے ان کو انس نہیں تھا۔ وہ حیات و ممات کی کشمکش میں زندگی گزارتے رہے آخر وہ پیرس گئے اور 19 فروردین 1330 شمسی (1951ء) کے دن بے قابو ہو کر انہوں نے خود کشی کرلی۔

صادق ہدایت کا مطالعہ وسیع تھا وہ اتنی انگریزی جانتے تھے کہ اس زبان کے سرمایہ علم و ادب سے استفادہ کرسکیں۔ فرانسیسی پر تو ان کو عبور تھا۔ انہوں نے تین کہانیاں فرانسیسی میں لکھیں تھیں۔ انہوخ نے چخوف، دستایوسکی، پو اور کافکا جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصنفوں کا مطالعہ فرانسیسی کے توسط سے کیا اور بعض کے ترجمے بھی فارسی میں کئے۔ فارسی شاعروں میں حافظ اور خیام ان کو بہت مرغوب تھے۔ فرانسیسی مصنفین میں سے سارتر اور بودلر شاعر ان کو بہت پسند تھے۔ کبھی کبھی موسیقی ان کو مست و دیوانہ بناتی تھی۔ ان کو نقاشی سے بھی دل بستگی تھی۔ **نیزنگستان** اور بوف کور کے سرورق پر اپنے ہاتھوں سے تصویریں بنائی تھیں۔

اسلام پر صادق کی تنقید مشہور ہے۔ وہ اپنی موت کے سال یورپ کو اس غرض کیلئے بھاگ جانا چاہتے تھے تاکہ ان کی وفات کے بعد مذہبی رسوم نہ ادا کی جاسکیں کیونکہ ان سے وہ سخت متنفر تھے۔ انہوں نے افسانہ آفرینش میں طنزیہ طور پر قصہ آدم و حوا کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ افسانے 1349ھ میں لکھا گیا تھا لیکن مذہبی مخالفت کے پیش نظر 1365ھ میں ایران سے باہر شائع ہوسکا۔ ایران باستان اور **مزدیسنا** کے قوانین سے انہیں محبت تھی۔ اس لئے انہوں نے مندرجہ ذیل کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرکے اپنی دل بستگی کا ثبوت دیا۔

1- **گنیجنہ** پالیش
2- کارنامہ اردشیر بابکان
3- گزارش کمان شکن
4- یادگار جاماسپ
5- زند وھومن لیسن
6- شہرستانہای ایران شہر
7- آمدن شاہ بہرام درجاوند

ہندوستان کے آداب و رسوم سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ بدھا کا عرفان اور نروان انہیں پسند تھا۔ انہوں نے سبزی خوری کی عادت بھی ہندی افکار سے متاثر ہوکر اختیار کی تھی۔

اپنی وطن پرستی کی بنا پر عرب و مغل حملہ آوروں کے خلاف ان کا تعصب بھی جا بجا ظاہر ہے۔ "سایہ مغول" میں خاص طور پر یہ تعصب شدت سے نمایاں ہے وہ عربوں کو تمدن ایران کو نیست و نابود کرنے والے تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے ترانہای عامیانہ اور جادوگری ایران پر مقالات لکھے اور عقاید و آداب و رسوم ایران کے بارے میں "نیرنگستان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس سے ان کی ایران شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔

وطن کے سیاسی اور اجتماعی فسادی عناصر کے خلاف عملی جدوجہد کی خاطر وہ حزب تودہ کے فعال رکن بن گئے تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ اس پارٹی کے اکثر کارکن رذیل جاسوس اور روس کے نوکر ہیں تو انہوں نے کنارہ کشی کرلی۔

تصانیف و تالیفات

داستانہا

زندہ بگور 1309، آب زندگی 1320، علویہ خانم، سایہ روشن 1312 سگ دلگرد، بوف کور 1315، سہ قطرۂ خون 1311، فردا، ولنگاری 1944ء قضیہ توپ مروارید حاجی آقا 1324_

ان میں سے بعض تو افسانوں کے مجموعے ہیں اور بعض صرف طویل افسانے ہیں جو الگ کتاب کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق تفصیلی بحث آگے آتی ہے۔

بزرگ علوی، شین پرتو اور صادق ہدایت نے تین کہانیاں لکھ کر "انیران" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس میں "سایہ مغول" صادق ہدایت کی کہانی ہے۔ وغ وغ ساھاب، طنز و ہجو آمیز قطعات ہیں جو مسعود فرزاد کی شرکت میں لکھے گئے ہیں۔

1328ش میں درد دل مرزا ید اللہ کے عنوان سے مجموعہ حکایات شائع ہوا۔ اس میں صادق ہدایت کے مصنفہ افسانے نے حکایت با نتیجہ، شب ہای ورامین اور درد دل مرزا ید اللہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ تین ترجمے بھی شامل تھے۔

ڈرامے

پروین دختر ساسان، مازیار، افسانہ آفرینش (خیمہ شب بازی در سہ پردہ)

تحقیقی مقالات

قواید گیاہ خواری، انسان و حیوان	ترانہای خیام، پیام کافکا
چند نکتہ دربارۂ دیس ورامین	خط پہلوی و الفبائی صوتی

سفرنامے

اصفہان نصف جہاں، درجادۂ نمناک

فرہنگ تودہ

اوسانہ (ترانہ ہای عامیانہ) نیرنگستان (عقاید و اوہام مذہبی) فلکوریا فرہنگ تودہ جو مجلّہ سخن سال دوم شمارہ 3، 4، 5، 6 میں شائع ہوا۔ طرح کلی برای کاوش یک منطقہ (مقالہ) ترانہ ہای عامیانہ (مقالہ) مثلہای فارسی (مقالہ)۔

ترجمے

مرداب حبشہ	از گاستن شرا
کلاغ پیر	الانژ گیسیلاند
تمشک تیغ دار	از آنتوان چخوف

مسخ، کراکوس شکارچی، شغال و عرب دربرابر قانون ہرسہ مولہ فرانتس کافکا

صادق ہدایت پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں افسانہ نویسی کی بنیاد رکھی انہوں نے اپنے کامیاب افسانوں کے توسط سے ایرانی ادب و زبان کو یورپ میں آشنا کرایا۔ ژون ریشار دبلوک جسے صلح عالمگیر کا انعام ملا تھا۔ اس نے لکھا۔

"صادق ہدایت سے کہو کہ وہ لوگوں سے کنارہ نہ کرے جہاں اس کا محتاج ہے" سید محمد علی جمال زادہ ان کے ہم عصر رہے ہیں۔ افسانہ نویسی میں ان کا نام بھی سابقون الاولون میں شمار ہوتا ہے لیکن ان کے افسانے صرف ایرانی اور ایرانی کرداروں تک محدود ہیں۔ صادق کے کردار قصہ اپنے اندر ایک دنیا لئے ہوئے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ایک عالمگیریت ہے۔ ان کے اشخاص قصہ انسان ہیں جو ایران میں بھی پائے جاتے ہیں اور تمام دنیا میں بھی۔ جمال زادہ کے اکثر کردار آپ کو صرف ایران میں ہی ملیں گے۔

صادق ہدایت کے متعلق ایک مستشرق کی جامع رائے یہ ہے۔

" کنجکاوی دامنہ داری دربارۂ مردم و اشیاء، قدرت مشاہدہ، **مخیلہ** مستعد حتی آمادہ برای **تخیلات** عجیب، مطالعات وسیع فارسی و اروپائی"

حساسیت دقیق ہنری، استعداد عظیم در پرداختن (استانہا و تسلط کاملی برزمان، مجموع این چیزہا **کافیست** کہ **مشخصات** استثنائی و جالبی باآثار اومی بخشند)

سخزانی زیلیزلازار، یا دبودنامہ ہدایت، ص 415

سایہ روشن

صادق کی نگاہ وسیع ہے وہ انسانی فطرت سے بحث کرتا ہے۔ جذبات، ہیجانات اور احساسات کو ماہر نفسیات کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں مضامین کا تنوع ہے۔ وہ اپنا مخصوص زاویہ نظر اور فلسفہ فکر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے زندگی ایک افسانہ ہے یا ایک دیوانے کا خواب ہے (سایہ روشن ص 111) وہ خیام کی طرح اسرار کائنات و حیات کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور یہاں کیوں سرگرداں ہیں وہ لکھتا ہے "نہ تو دانی و نہ من" (ص 113 سایہ روشن) ہماری زندگی ایک وہم ہے ایک فریب ہے۔ ہم افکار پریشاں کا ایک مجموعہ ہیں (ص 114) آئندہ دنیا کوئی چیز نہیں۔ کوئی شخص وہاں سے نہیں آتا جو وہاں کی خبریں لاتا ہے "شب ہای ورامین" میں اسی عقیدے کا مذاق اڑایا ہے۔ لوگ قائل تھے کہ مردوں کی روحیں واپس آکر

اپنے عزیزوں کو دیکھتی ہیں۔ **فرنگیس** کی وفات کے بعد ویران گھر سے جو ساز کی آواز آتی تھی لوگ سمجھے کہ **فرنگیس** کی روح آکر اپنا ساز بجایا کرتی تھی۔ فریدوں اس کا شوہر جو اپنی باسلیقہ بیوی کی وفات پر غمگین تھا۔ جب اس نے اس مسئلہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کی اپنی بہن' **فرنگیں** کے ویران کمرے میں اپنے چاہنے والے کے ہمراہ رات کے سناٹے میں ساز بجایا کرتی ہے۔ صادق اس بات کا بھی قائل نہیں کہ مردوں کی روحیں انتظار میں رہتی ہیں کہ ان کے اعزا و اقرباء ان کی یاد میں درود و فاتحہ بھیجیں تاکہ ان کا دل ٹھنڈا ہو۔ صادق نے اپنے افسانہ افرینگان میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مادی دنیا میں رہنے والے اپنے اپنے مشاغل میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ اپنے مردہ عزیزوں کو تھوڑے ہی عرصے میں فراموش کر دیتے ہیں۔ ایرانیوں کی زبان سے صادق نے عربوں کے خلاف ملی تعصب کو بھی ہوا دی ہے "آخرین لب خند" میں لکھتے ہی "ان کی نسل اور ہماری نسل ان کی فکر اور ہماری فکر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم نے ان کی وحشی اور سرکش روح کو متمدن بنایا مگر ان سوسمار شکار کرنے والوں' موش خواروں اور شاش و **پشکل** شتر میں پرورش پانے والوں کے افکار کیا بہتر ہوسکتے ہیں (ص 144 سایہ روشن)"

صادق نے بڑا ذہن رسا پایا ہے۔ وہ کہانی کا پلاٹ بڑی باریک نگی اور مہارت سے بنتا ہے اختتام خاص طور پر تعجب خیز ہوتا ہے جیسا کہ اس کے افسانوں' عروسک پشت پردہ' آفرین لب خند' میں ظاہر ہے۔ اس کے کرداروں میں اندرونی یا بیرونی کشمکش کا سراغ ملتا ہے۔ صادق محسوس کرتا ہے کہ زندگی میں دکھ اور غم ہے۔ بھوک پیاس ہے۔ شہوت رانی ہے' ظلم ہے۔ زبردست اپنی طاقت کے بل پر کمزوروں کو کچل کر اپنی ہوس پوری کرتا ہے۔

سہ قطرۂ خون

سہ قطرۂ خون میں کہانیاں شامل ہیں۔ اکثر و بیشتر میں ناکام محبتوں کی داستانیں ہیں اور اس کے نتیجہ میں خانہ خرابیاں اور **خودکشیاں** ہیں۔ گرداب میں ہمایوں ایک زبردست رقیبانہ شک کی بنا پر کہ اس کی بیوی اس کے معتمد علیہ دولت کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے اور اس کی بیٹی انہی کے مجرمانہ اختلاط کا نتیجہ ہے' بیوی بچوں کو گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ داش آکل' میں ایک مرد باہمت و ایثار پیشہ ایک ایسی کم سن لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے جس کا خاندان باپ کی وصیت کی بنا پر

اس کی کفالت میں دیا گیا ہے۔ اس لئے جب لڑکی کا بیاہ ہونے لگتا ہے تو وہ مایوسی میں دشمن کے ہاتھوں قتل ہوجاتا ہے۔ آئینہ شکستہ میں ایک عورت سفر میں گئے ہوئے دوست سے مایوس ہو کر خودکشی کرلیتی ہے۔ لالہ' **صورتکہا** اور محل بھی اسی قبیل کی داستانیں ہیں۔

زنیکہ مردش راگم کرد' میں مصنف نے زریں کلاہ کے شدید جذبہ آزار خواہی کی طرف اشارہ ہے جسے نفسیات میں MASOCHISN سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا رواں رواں پھڑکتا ہے کہ اس کا شوہر اس کو چابک سے مارے۔ پھر وہ اس کے مضبوط بازوؤں اور اس کے طویلہ کی سی بو والے جسم سے چپک جائے اور اپنی حس شہوت کو سرد کرے۔

ان کہانیوں سے صادق ہدایت کے معتقدات پر اور روشنی پڑتی ہے۔ مروی کہ نفس راکشت' میں انہوں نے درویشانہ اور صوفیانہ زندگی پر ایک کاری طنز کی ہے۔ ان کے نزدیک وہ لوگ جو صوفیائے قدیم کی تقلید میں نفس کشی اور ترک علائق سے روحانی آزادی' نجات اخروی اور وصل خداوندی کے خواہاں ہیں' وہ خود فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ وہ زندگی کی تلخیوں اور مادی دنیا کی **کشمکشوں** سے گھبرا کر تصوف کی آڑ لیتے ہیں۔ طلب آمرزش' میں بھی صادق ہدایت نے عوام فریب ملاؤں کے اس عقیدے کا خاکہ اڑایا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے گناہ کر کے بھی جو شخص روضہ امام شہید پر جاتا ہے وہ طیب و طاہر ہو کر آتا ہے۔ سفر کربلا میں تین چار اشخاص اکٹھے ہو کر اپنے اپنے خفیہ جرائم کے قصے سناتے ہیں اور طلب آمرزش کی امید میں سفر کی صعوبتیں جھیل کر وہاں پہنچتے ہیں۔

کہانیوں کا اختتام تعجب خیز ہے۔ اکثر کردار قصہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں ان کی شخصیتیں نمایاں ہیں۔ مصنف ایک ممتاز شخص کی زندگی میں کسی نہ کسی اندرونی کشمکش' غم اور دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ زبردستوں کا ان پر ظلم بیان کر کے ہم کو ان کے درد میں شریک غم بنا کر غمناک کرتا ہے اور مسائل زندگی پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

صادق کا انداز بیان دلچسپ ہے وہ دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں میں بسنے والوں اور شہر کے نچلے طبقے والوں کی زبان خوب لکھتا ہے۔ محمد علی جمال زادہ کی طرح اسے بھی عوام کی بولی لکھنے پر قدرت حاصل ہے لیکن اس کے بیان میں وہ روزمرہ کی چاٹ اور محاورہ کی شگفتگی نہیں جو جمال زادہ کے اسلوب میں موجود ہے مگر صادق ہدایت نے مغربی مفکرین کی تصانیف کے بعد اپنے فکر کو جلا دی اور اس کو اپنے خیالات کی ترجمانی کیلئے نئی اصطلاحات کنایات اور استعارات استعمال کرنے پڑے۔ اس سے یقینی طور پر فارسی زبان کی ثروت اور تنوع میں افسانہ ہوا۔

بوف کور

ایک عجیب سے رویائی کہانی ہے۔ ظاہری طور پر کہانی کے اشخاص ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک چیز لکھتا لکھتا بھول گیا ہے۔ پھر بار بار اس کو دہراتا ہے۔ کہانی کہیں ٹوٹتی ہے کہیں جڑتی ہے۔ سطحی طور پر یہ ایک ہی کہانی ہے مگر اس کے دو نمایاں حصے ہیں۔ مختصراً اس کا ڈھانچہ یہ ہے۔

ایک نوجوان قلمدان کی جلدوں پر نقاشی کرکے گزر اوقات کرتا ہے۔ اس کا باپ اور چچا ہندوستان میں تجارت کرتے تھے۔ باپ نے ایک ہندو مندر کی رقاصہ سے شادی کرلی۔ دونوں بھائی ہم شکل تھے۔ دونوں اس لڑکی پر فدا تھے۔ لڑکی نے شرط باندھی کہ دونوں کو ایک تاریک کمرے میں پھن والے ناگ کے سامنے پھینک دیا جائے جو بچ نکلے گا وہی اس کا رفیق ہوسکے گا۔ نوجوان کا باپ مرگیا لیکن چچا بھی زہر کے اثر سے گویا بوڑھا ہوگیا۔ بال جھڑ گئے اور وہ لنڈ منڈ سا رہ گیا۔ جب چچا ایران واپس آیا تو لڑکے کو اپنی بہن کے ہاں چھوڑ گیا۔ اس نوجوان کے گھر میں ہندوستان کا بنا ہوا ایک پردہ آویزاں تھا جس پر ایک جوگی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس کے سامنے ایک نہایت خوبصورت درشت تیز اور سحر آگیں آنکھوں والی لڑکی پیالہ پیش کررہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک نہر حائل ہے۔ یہ تصویر نوجوان کو اس قدر مرغوب تھی کہ وہ قلمدانوں کے پر یہی تصویر بنایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی نظروں کے سامنے ہو بہو یہی نقشہ زندہ صورت میں نظر آیا۔ وہ اس لڑکی کو پانے کیلئے بے تاب رہنے لگا۔ اس کے غم عشق کو بھلانے کیلئے اس نے شراب و افیون کی عادت کرلی۔ ایک دن وہ اچانک باہر سے آیا تو وہی درشت آنکھوں والی لڑکی اس کے کمرے کے باہر بیٹھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا وہ اندر آئی اور چارپائی پر لیٹ گئی نوجوان نے اس کو ٹھنڈا محسوس کیا۔ اس نے طاق سے شراب کی بوتل نکال کر اس کے حلق میں انڈیل دی۔ وہ اسی جگہ ڈھیر ہوگئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شراب میں زہر ملا ہوا تھا اور یہ شراب باپ کے ترکہ میں اس کے پاس محفوظ تھی۔ نوجوان نے مجرمانہ خوف و ہراس میں لڑکی کے ٹکڑے کئے اور صندوق میں بند کردیا۔ ایک بوڑھا آدمی مردہ کھینچنے والی گاڑی لایا۔ اس کی وساطت سے دو پہاڑوں کی تنہائیوں میں اس صندوق کو دفن کیا۔ ایک کہانی تو یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ دوسری کہانی میں یہی نوجوان اپنی **پھپھیری** بہن سے شادی کرتا ہے مگر وہ اس کے پاس

نہیں آتی اور دوسرے فاسقوں سے اختلاط رکھتی ہے۔ حاملہ ہوکر بچہ بھی جنتی ہے اور نوجوان الگ تھا شرم و ذلت میں اپنی جان ہلکان کرتا ہے لیکن لڑکی اس سے بے گانہ اور بے پروا ہے۔ ایک دن وہ جوش میں آکر چاقو ہاتھ میں لیکر لڑکی کے کمرے میں جا گھستا ہے اور اس کے ساتھ لیٹ جاتا ہے۔ وہ اس کو اس زور سے بھینچتی ہے اور ہونٹوں کو کاٹتی ہے کہ یہ تلملا کر اس سے جدا ہوجاتا ہے اور خنجر سے اسے ہلاک کردیتا ہے لیکن جب آئینے میں آکر اپنی صورت دیکھتا ہے تو اس کو وہی لنڈ منڈ بوڑھی شکل نظر آتی ہے جو اس کو بازار کے بساطی کی نظر آتی تھی جو اس کے مکان کے سامنے بیٹھتا تھا اور اس کی بیوی کے پاس بھی آتا تھا۔

اگر صرف کہانی کے پلاٹ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں چند چیزیں غیر طبعی، پر اسرار اور غیر واضح نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ درشت آنکھوں والی لڑکی چپکے سے کہاں سے آدھمکی۔ دوسرے وہ بوڑھا کون تھا جس کی رہنمائی میں وہ لاش دفن کرکے آیا۔ اس بوڑھے نے مزدوری نہیں لی بلکہ نوجوان کو رومال میں بندھا ہوا ایک کوزہ دیا جو قبر کھودتے ہوئے وہاں سے برآمد ہوا تھا اور یہی بوڑھا نوجوان بیوی مرجانے پر چپکے سے اس کے گھر میں داخل ہوا اور کوزہ واپس لے گیا۔ نوجوان کی **پھپھیری** بہن نے خود ہی محبت کا اظہار کیا اور بعد میں فاسقانہ زندگی کیوں شروع کی۔ کیا اس کے اندر زہر بھرا ہوا تھا کہ جب اس نے اپنے ہونٹوں سے نوجوان کو کاٹا تو اس کی ہیئت مسخ ہوگئی۔ اسی طرح جیسا کہ ناگ کی پھنکار سے اس کے چچا کی حالت بدل گئی تھی۔

اگر ان چیزوں کو واقعات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے بلکہ یہ خیال رکھا جائے کہ مصنف نے ان سب واقعات اور کرداروں کو علامات کے طور پر استعمال کیا ہے تو اس ظاہری کہانی کے پس پشت مطالب جھلکتے نظر آئیں گے داستان کا ہیرو نوجوان ایک محبوب کی تلاش میں ہے جو اسے زندگی کی مستیاں عطا کرسکتی ہے لیکن اس کو حاصل کرنے میں رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس کے دل و دماغ کی زبردست کوشش و کاوش کے بعد اس کو وہ لڑکی ملتی ہے لیکن بالکل بیمار اور مردہ حالت میں اس کے مرجانے کے بعد اس کو **پھپھیری** بہن کی صورت میں زندگی کی تمنائیں پوری ہونے کی امید نظر آتی ہے لیکن وہ فاسقہ اس کو ترساتی ہے اور دوسروں کے کام آتی ہے۔ خیالی طور پر یہ نئی لڑکی اس کی پہلی محبوب کا روپ دھار کر سامنے آتی ہے اور اب کے پھر وہ اپنے اپنی مراد پانے میں ناکام رہا گویا لوگ اس کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈال کر اس کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ پردے کی نقاشی کا بوڑھا وہی شخص ہے جو اس کی خوابوں کی ملکہ کو دفن کرنے میں مدد دیتا ہے بعد میں اس کی بیوی سے لطف اندوز ہونے والا بساطی یا قصاب بھی وہی ہے جو اپنی دوسری ہیئت میں

نمودار ہوا ہے۔ اس تخیل کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں نااہل' بدمعاش اور مالدار تو زبردستی دوسروں کا حق غصب کر کے زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور شریف حساس نوجوان گھل گھل کر بے بس تماشا دیکھتے ہیں اور جان پر صبر کرتے ہیں۔ اس قسم کی تعبیرات سے بوف کور کے ہیرو کی دماغی کیفیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بوف کور کوئی واقعی کہانی نہیں بلکہ مصنف نے اپنے دل و دماغ کی کیفیات بیان کرنے کیلئے نوجوان کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنی نامرادیوں اور مایوسیوں میں کھویا ہوا ہے۔ بیمار ہے گندے غلیظ مکان میں رہتا ہے۔ کسمپرسی میں پڑا بخار میں کراہتا ہے۔ جان گھلاتا ہے۔ خواب دیکھتا ہے۔ پریشان خیالات' ڈراؤنے افکار اس کے دماغ کو مختل کرتے ہیں۔ وہ کئی بار خودکشی کرنا چاہتا ہے اور موت کو اپنی تمام مصائب کا علاج جانتا ہے۔ اس کی زندگی مرگ و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ غم' ہراس اور پریشانیوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مصنف کئی مرتبہ اس کے غلیظ بستر' تاریک کمرے' شراب افیون' دوا اور اس کی مکروہ دایہ کا ذکر کرتا ہے کہ پڑھ کر گھن آنے لگتی ہے۔ یہ ایک بیمار ذہن کی داستان ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ قصہ ناکام آرزوؤں سے فرار کا نام ہے یہ دنیا میرے لئے نہیں بے حیاگداؤں' معلومات فروشوں' ڈاکوؤں اور ہوس پرستوں کے لئے ہے۔ سب لوگ جھوٹے دغاباز ہیں۔ صرف ایک موت ہے جو جھوٹ نہیں بولتی (ص 99) یہ تمام موہومات کو نیست و نابود کرتی ہے۔ (ص 101)صادق نے اپنی دوسری کہانی زندہ بگور میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا ایک بازیچہ' یک ننگ' یک چیز پوچ و بی معنی است" موت ایک ایسی نعمت ہے جو آسانی سے کسی کو نہیں دیتے۔ خودکشی بعض کی سرشت اور خمیر میں داخل ہے۔ اسی قسم کے تفکرات تھے جن سے ان کا دل و دماغ ماؤف ہوگیا اور آخر انہوں نے خودکشی کرلی۔

صادق نے یہ کتاب 1315 ش میں بمبئی جا کر ایک دستی مشین کے ساتھ چھاپ کر پہلی مرتبہ شائع کی تھی۔ رضا شاہ کبیر کا زمانہ زبان و قلم کی آزادی کا زمانہ نہیں تھا' مصنف کو اپنے گرد و نواح میں ہرج و مرج' فقر و مسکنت' دغاو فریب نظر آتے تھے وہ کھلم کھلا نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شخصیت کو مخفی کر کے بوف کور کی زبان سے ان تلخ حقائق کا اعلان کیا اور زمانہ کے اشخاص کے خلاف کینہ و طعن کی زبان کھولی۔

روژہ لسکو نے فرانسیسی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کو پڑھ کر "آندرہ روسو" نے کہا کہ اس کا مصنف ہمارے زمانے کے پر معنی ترین مصنفوں میں شمار ہوگا۔

D.P.COSTELLO نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا(1957ء)

مجلہ سخن دورہ چہارم شمارہ نمبر9

حاجی آقا' ایک طویل افسانہ ہے۔ اس کہانی میں نہ تو ایک موضوع ہے اور ایک خاص واقعہ ہے جس کے گرد ایک افسانہ بنا گیا ہو۔ حاجی آقا ایران کا ایک مخصوص کردار ہے بلکہ یہ کہئے کہ حاجی آقا کی صورت میں رجعت پسند ایران متمثل ہے۔ وہ ستر سالہ بوڑھا ہے مگر گھر میں پانچ پانچ عورتیں ڈال رکھی ہیں۔ وزراء اور اعیان سلطنت سے بھی راہ و رسم ہے۔ سفارت ہائے خارجہ سے بھی اس کے تعلقات ہیں اخباروں کے مدیر اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں۔ تجارت کی راہیں کھلی ہیں۔ اس کی زندگی کا مطمع نظر روپیہ حاصل کرنا ہے۔ ریاکاری' مکر و فریب' خوشامد اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ایسی غاصبانہ زندگی کے خلاف ایک نوجوان یعنی منادی الحق اپنی آواز اٹھا رہا ہے اور ایسے اشخاص کا تار و پود بکھیرنا چاہتا ہے۔ ایران کی اس بیدار روح کے خلاف حاجی آقا مذہبی ملا یعنی حجتہ الشریعہ کو روپیہ دیکر عوام میں رجعت پسندانہ خیالات و افکار کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے وہ اس کو تاکید کرتا ہے کہ میری اور تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ لوگوں کو پرانے آداب و رسوم میں مبتلا رکھو۔ عورتوں کو حجاب میں رکھو۔ تعزیہ ماتم' روضہ خوانی اور سینہ کوبی کو عام کرو۔ عوام میں مذہبی تعصب پھیلاؤ۔ ان کو نئی تعلیمات سے بے بہرہ رکھو تاکہ وہ ہمارے محتاج رہیں۔ انہیں غریب رہنے دو تاکہ گداگری کیلئے ہمارے پاس آئیں۔

اس کہانی کو پڑھ کر صادق ہدایت کے افکار و آراء پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک عظیم مفکر اور مصلح قوم کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ قوم کی خرابیوں پر ان کی نگاہ ہے۔ ان کا خیال ہے وہ نوجوان جو یورپ سے تعلیم پاکر صرف قمار بازی شراب خواری اور فیشن پرستی سیکھتے ہیں اور اپنے ملک کی ہر چیز کو تنفر اور حقارت سے دیکھتے ہیں وطن کے بدخواہ اور دشمن ہیں۔ دوسری طرف بے علم' جاہل' متعصب اور اوہام پرست تو بہرحال ملکی ترقی و خوشحالی کا دشمن ہے۔ امیروں کیلئے ایسے دردمند نوجوانوں کی ضرورت ہے جو باہوش' بیدار دل اور غیرت مند ہوں جو وطن فروشوں' ریاکاروں تجارت کے اجارہ داروں' بزدلوں اور مجرموں کی سرکوبی کریں۔ ملکی ترقی میں ان پتھروں کو راستے سے ہٹائیں۔ حاجی آقا جیسے مہذب بدمعاشوں کو اس افسانے میں عبرتناک انجام کی بشارت بھی ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ایک روحانی کرب اور کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

مصنف نے حاجی آقا کے کرداروں کو ایسے نام دیکر جو ان کی شخصیت کو واضح کرتے ہیں۔ ایک غیر حقیقی اور مصنوعی کردار بنادیا ہے مثلاً دوام الوزرا' مزلقات گل و بلبل' منادی الحق' حجتہ

الشریعہ وغیرہ۔

زندہ بگور کے افسانوں سے صادق کے ایک اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ آبجی خانم اور داؤد کوز پشت میں قدرت کی بے رحمیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ آبجی خانم ایک دبلی پتلی بدصورت لڑکی ہے۔ اس میں جذبات و احساسات ہیں لیکن اسے کوئی شوہر نہیں مل سکتا جب اس کی بہن کی کامیاب شادی ہوتی ہے تو وہ حسد و رقابت میں اپنی بے بسی پر رو کر خودکشی کرلیتی ہے۔ اسی طرح داؤد کوز پشت کو کوئی عورت پسند نہیں کرتی اور وہ بھی ایک نامراد اور مایوس زندگی بسر کرتا ہے۔ صادق یاسیت اور قنوطیت کا مبلغ ہے۔ دنیا میں اسے حسن، نیکی اور صداقت نظر نہیں آتی۔ بدھ کا تحقیر آمیز لب خند گویا زندگی کی طرف اس کے نقطہ کو واضح کرتا ہے۔ یہی رجحان اس کہانی "بن بست" سے ظاہر ہے۔ شریف کا جانی دوست سمندر میں ڈوب کر مرجاتا ہے۔ ابھی اس کی شادی ہوئی تھی اور اس کی بیوی امید سے تھی۔ بیس سال بعد شریف کے دفتر میں ایک نوجوان ملازم ہوکر آیا۔ شکل و شباہت میں وہ محسن کا بیٹا نظر آتا تھا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ محسن کا بیٹا ہے۔ شریف کی تنہا اداس زندگی میں رونق آگئی۔ وہ اسے گھر لے گیا اور اسے اپنے پاس ٹھہرایا لیکن چند دنوں بعد وہ بھی حوض میں ڈوب کر مرگیا۔ قدرت کی بے رحمیوں سے بیزار ہوکر صادق پوچھتا ہے کہ "چرا این طور اتفاق می افتند□"

بزرگ علوی

ان کا نام تو سید مجتبیٰ ہے لیکن وہ بزرگ علوی کے نام سے معروف ہیں ان کے والد سید ابوالحسن تھے۔ بزرگ علوی 1285 شمسی تہران میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی اور دبیرستان کی تعلیم تو تہران میں تمام کی۔ بعد میں جرمنی گئے۔ آٹھ سال تک علمی مشاغل میں مصروف رہے وہیں، مدرسہ **نویسندگی** میں انہوں نے تصنیف و تالیف کا فن سیکھا۔ 1930 میں اپنے وطن واپس آگئے اور بعد میں ہنرسرای عالی تہران میں جرمن کے استاد مقرر ہوئے۔ 1317 سے 1320 تک وہ جیل میں بند رہے۔ ان کے اشتراکی خیالات کی بنا پر رضا شاہ کبیر کی حکومت نے دوسرے آزادی خواہ اور روسی نظام کے طرفداروں کے ساتھ ان کو بھی قید کردیا۔ قید و بند کے ان دردناک مصائب کا ذکر، ورق پارہ ہائی زندان اور 53 نفر میں ملتا ہے۔

1323 تا 1324 میں وہ انجمن فرہنگ ایران و شوروی کے سیکرٹری رہے اور ایک رسالہ بھی نکالتے رہے۔ 1332 تک وہ تہران میں اپنی پرانی ملازمت پر متعین رہے یعنی ہنرسرای عالی میں جرمن کی درس و تدریس میں مشغول رہے سیاسی فضا ناسازگار ہونے کی وجہ سے ایران چھوڑ کر پھر جرمنی شرقی میں چلے گئے اور وہیں ہمبو یونیورسٹی میں استاد زبان فارسی، ادبیات و تاریخ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

وہ فرانسیسی، انگریزی، جرمنی اور روسی زبانیں اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے علوم و ادبیات سے روشناس ہیں۔ روسی اور جرمنی پر تو انہیں خاصا عبور ہے انہوں نے غیر زبانوں سے جن کتابوں کے ترجمے کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

دوشیزہ اورلئان	از، شیلر
مستنطق	از، **پریسٹلی**
دوازدہ ماہ	از، مارشاک
باغ آلبالو	از، چیخوف
کسب وکار مسزوارن	از، برنارڈشا
حماسہ ملی ایران	از، نولدکہ

انہوں نے برلن میں فارسی، جرمنی لغات، جرمن زبان والوں کیلئے فارسی کی درسی کتاب اور تاریخ ادبیات جدید ایران شائع کی۔ ایک جرمن شاعر کی مدد سے رباعیات عمر خیام "کرکشور گل و

بلبل" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ازبکستان کا جغرافیہ تاریخ اور ازبکوں کی خصوصیات کے بارے میں بھی "ازبکہا" کے نام سے کتاب تالیف کی ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ انہیں کتابوں کی بنا پر افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔

چمدان' ورق پارہ ہائی زندان' پنجاہ وسہ نفر' نامہ ہا' چشم ہایش' (ناول) میرزا' سالاریہا (ناول)

بزرگ علوی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "چمدان" کے نام سے 1313ھ شمسی میں شائع ہوا اس میں چھ کہانیاں شامل ہیں۔ چمدان' قربانی' عروس ہزار داماد' **تاریخچه** طاق من اور سرباز سربی۔ ان سب میں مرکزی کردار دعوت ہے۔ چمدان میں عورت' دولت اور شہرت کیلئے بوڑھے مرد سے شادی کرنے پر رضامند ہوجاتی ہے۔ قربانی میں ایک نوجوان عورت ایک مسلول سے شادی کرکے خود بھی سل میں مبتلا ہوکر جان دے دیتی ہے۔ عروس ہزار داماد' میں ایک کافہ دار عورت کی زندگی کا نقشہ ہے۔ **تاریخچه** طارق من' میں ایک جوان جرمنی عورت اپنے اندھے شوہر کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر دوسرے نوجوان سے ہوسبازی کرتی ہے اور سرباز سربی' میں ایک بے کس عورت اپنے حالات سے مجبور کر ذلیل زندگی بسر کرنے کیلئے راضی ہوجاتی ہے۔ ان کہانیوں کا مرکزی نقطہ خیال یہی ہے کہ بری عورت اجتماعی فساد کی جڑ ہے لیکن مصنف کا یہ طرز فکر نہیں ہے کہ عورت فطری طور پر بر ہے اور جہاں جائے گی خرابیاں پھیلائے گی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطری تقاضے اور زنا کی ناسازگار فضا سے مجبور ہوکر ایسے کام کرتی ہے۔ "چمدان" میں وہ روسی مہاجر عورت نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ "سرباز سربی" میں کوکب "ف" کے ساتھ شادی پر رضامند ہے لیکن وہ دیوانہ اس کو ماں کا بت بنا کر اس کی پرستش کرنا چاہتا ہے۔

آخری کہانی مروی کہ پالتوی شیک **قنشن** بود' ایک یورپ زدہ' منور **الفکر** متجدد نوجوان پر طنز اور ہجو ہے۔ ان نوجوانوں کا خاکہ اڑایا ہے جو لباس کے فیشن اور تزئین کے دلدادہ ہیں۔ انگریزی' فرانسیسی مصنفوں کے نام اور ان کی تالیفات کے نام لیکر اپنی ناقص معلومات کے باوجود اپنی علمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اروپائی ممالک کی سیاحت کے بعد اخباروں میں ایک آدھ مضمون لکھ کر پراپیگنڈا کے ذریعے شہرت چاہتے ہیں یہ افسانہ اپنے اندر بیان کی وجہ سے ایک مضمون کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ مصنف باجابار مرکزی کردار نوجوان کیلئے "منور **الفکر** و متجدد" کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور قصہ گو کیلئے راقم این سطور عبد ضعیف ایسا انداز کرنے سے کہانی میں ایک تکلف اور تصنع آگیا ہے۔

آخری کہانی کو چھوڑ کر تکنیک کے اعتبار سے باقی سب کامیاب افسانے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا بڑے سلیقے سے بنایا گیا ہے۔ ہر افسانے کے قدرتی اور حقیقی ہونے کی جھلک نمایاں ہے کوئی غیر طبعی اور غیر فطری چیز معلوم نہیں ہوتی۔ انداز بیان جچا تلا اور متوازن ہے شروع سے لیکر آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ زبان سادہ اور رواں ہے اور روزمرہ محاورہ کے مطابق کہانی کے ساتھ ساتھ کردار خود بخود ابھرتے آتے ہیں۔ ان کے متعلق یک جا تفصیلی معلومات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ "سرباز سربی" میں آقائی "ف" کا مطالعہ خصوصی خوب چیز ہے۔ ایک شخص جس کو لڑکپن سے ماں کے ساتھ والہانہ محبت ہے اس کی وفات کے بعد جس عورت سے اس کو واسطہ پڑتا ہے وہ اس کو بھی ماں کی طرح ہی رکھنا اور پیار کرنا چاہتا ہے لیکن نوجوان عورت تو جذبات شہوت کی تسکین چاہتی ہے عورت نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے کہ وہ مرد نہیں تھا صرف ہوس کی تسکین کیلئے ایسی عورت کی معیت چاہتا تھا جو ماں کی طرح اس کو آغوش میں لے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔

نامہ ھا

بزرگ علوی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ سب افسانے اپنے مضمون کے اعتبار سے اجتماعی اصلاح کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کا انداز بالکل ہمارے ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف افسانہ کے دل پذیر فن سے کام لیکر اجتماعی مفاسد کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ "نامہ ھا" میں قاضی عدالت کی بے انصافی اور ظلم کی نمائش کی ہے۔ "رسوائی" میں اعیان و وزراء کی پس پردہ زندگی بے نقاب کی ہے۔ "خاین" میں انتخابات میں حکومت کی طرف سے زبردستیوں اور دخل اندازیوں کا بیان ہے۔ پنج و قیفہ پس ازدوازدہ میں سرکاری اداروں میں رشوت کی آزاد رو خرابی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

اکثر کہانیوں سے ایرانی سماج کے عبوری دور کا علم ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ افلاس اور بیکاری ہے کہ مکان کا کرایہ تک نہیں دیا جاسکتا اور نہ بیٹی کا بیاہ ہوسکتا ہے۔ "اجارہ خانہ" میں ایک خاندان کی درد بھری داستان بیان کی ہے۔ دوسری طرف رومانی تقلید میں فیشن کی رو نوجوانوں کو بہائے لئے جارہی ہے۔ رقص و سرور کی محفلیں ہیں۔ غریب نوجوان لڑکی شہر کی نئی فضا میں کھو کر اپنے غریب باپ کو بھلا دیتی ہے جس نے اپنی اکلوتی بیٹی کو اس لئے شہر بھیجا تھا کہ وہ

دایہ یا ڈاکٹر بنے اور اپنے گاؤں والوں کی خدمت کرے۔ کیونکہ لڑکی کی ماں دوا دارو اور طبی امداد نہ ہونے کی وجہ سے مرگئی تھی "دژ آشوب" کا یہی موضوع ہے۔ "یک زن خوش بخت" میں رسم و رواج کے ایک نازک موضوع کی طرف اشارہ موجود ہے۔ لڑکوں لڑکیوں کی مرضی کے بغیر جو شادیاں ہوتی ہیں ان کے عبرتناک نتائج کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے مگر ساتھ ساتھ تقابلی مطالعہ بھی موجود ہے اور ان لڑکوں کی پر امن زندگی کی طرف اشارہ ہے جن کی شادیاں ماں باپ کے انتخاب سے عمل میں آتی ہیں۔

کردار کے اعتبار سے تین کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ "نامہ ھا" گیلہ مرد اور زن خوش بخت" "نامہ ھا" میں ایک قاضی کی زندگی کا احتساب ہے جس کی صورت کے ساتھ سیرت بھی بری ہے۔ دنیا میں ایک بیٹی ہے جو اسے عزیز سمجھتی ہے لیکن جب اس کو اپنے باپ کے اعمال کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ اس کو چھوڑ دیتی ہے اور خفیہ خط لکھ کر اس کے ضمیر کو ملامت کرکے راہ راست پر لانا چاہتی ہے اور وہ ایک زبردست روحانی کرب و عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔ لڑکی کی بے باک بلند سیرت قابل تقلید ہے اور باپ کی پست فطرت قابل مذمت ہے۔ یہ ایک درد انگیز داستان ہے۔ تکنیکی اعتبار سے بھی بہت اچھا افسانہ ہے جس میں کہانی کا ارتقاء بھی موجود ہے اور کردار کی تصریحیت بھی۔ گیلہ مرد' میں کردار کی بلندی کی طرف اشارہ ہے کہ ایک غریب دشمن پر اختیار رکھتا ہوا بھی رحم دل ہے۔ زمیندار' جاگیردار' غریب کاشتکاروں کا گھر لوٹ لیتے ہیں۔ آپس کی جھڑپ میں گیلہ مرد کی بیوی قتل ہوجاتی ہے اور اس کا بچہ بے سہارا رہ جاتا ہے پولیس کے دو بے دل اکھڑ مسلح سپاہی اس کو اپنی حراست میں گرفتار کرکے محاکمہ کیلئے جارہے ہیں۔ محمد ولی وکیل باشی جو ان دونوں میں زیادہ ستم آزار تھا۔ گیلہ مرد کے ہاتھوں بے بس ہوجاتا ہے لیکن جب وہ اپنی بیوی اور پانچ بچوں کا واسطہ دیکر جان بخشی کی بھیک مانگتا ہے تو وہ اس کو معاف کردیتا ہے لیکن جب وہ خود بھاگنے لگتا ہے تو دوسرے کی گولی سے ہلاک ہوجاتا ہے۔

"یک زن خوش بخت" میں ڈاکٹر کا سنجیدہ اور گہرا کردار جاذب نظر ہے۔ لڑکی کی پروقار شخصیت بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ شوہر کے انتخاب میں جذبات و احساسات کی جو کشمکش ہوتی ہے افسانے میں اس کا اچھا تجزیہ موجود ہے۔

مصنف اپنے خیالات اور افکار کو پڑھنے والے پر ٹھونسنا نہیں چاہتا اور نہ خطابہ اور وعظ کہتا ہے بلکہ کہانی اور اشخاص کے واقعات سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ خود بخود پڑھنے والے کے ذہن میں مرتسم ہوتے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کی شخصیت پس پردہ رہتی ہے۔ کردار جو بیان دیتا

ہے وہ اس کی شخصیت کے عین مطابق ہوتا ہے اور کردار نگاری میں یہ اہم نکتہ ہے جس میں بزرگ علوی بڑے کامیاب ہیں۔

افسانہ نگار کہیں کہیں رمزوایمائیت اور طنز سے بھی کام لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں گہرے معانی چھپا دیتے ہیں مثلاً ایک باپ جو آگاہ ہوچکا ہے کہ اس کی لڑکی کے اطوار مشتبہ ہیں۔ جب وہ لڑکی رات کو دیر سے گھر لوٹتی ہے تو وہ اس سے پوچھتا ہے کہ اتنی دیر کہاں رہی ہو۔ لڑکی جواب دیتی ہے "باوختر مرزا بودم" اسی ایک جملے سے لڑکی کا سارا جھوٹ واضح ہوجاتا ہے۔ صبح اٹھ کر باپ لڑکی کا بیاہ کردیتا ہے یا اس جملہ کو دیکھئے' کہنا یہ مقصود تھا کہ قید خانے میں بہت برا سلوک ہوتا ہے۔ اس مطلب کو اس طنزیہ انداز میں کہا ہے "در زندان خوب پذیرائی کردند" اس عبارت کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس میں بھی طنز کا ایک چبھتا ہوا تیر ہے۔ "در موقع رقص زناں درحالانکہ لذت از چشمہائی آنہا نوازش میکرد' گونہ ہائی خود را بگونہ ہائی مرد ہا چسپانده و ازصفائی باطن کہ قلب آنہا را روشن میکرد بہره می برونده' بدون انیکه کسی کینہ دارو بخیل باشدو یا اینکہ کار بجدال بکشد' زنان لازم بنود بشوہران خود دروغ بگویند زیرا ہر کس واضح و آشکار میدید کہ زنس از مرد دیگری کہ باوی رقصید خشنود است"

مصنف عوامانہ زبان بھی خوب لکھتے ہیں اور "آواز دار" کلمات استعمال کرنے کا بھی ان کو خیال رہتا ہے مثلاً یہ جملے دیکھئے۔ کنجشک جیک جیک میرد' مگس و زوز میکرد' شرشرباران' خرخرنفس' ولم پرپری زد' وغیرہ

چشمہایش

بزرگ علوی کا ایک مقبول دلچسپ طویل مختصر افسانہ ہے۔ کہانی کا پھیلاؤ اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ ناول کی صورت اختیار کرگیا ہے لیکن موضوع اور مرکزی نقطہ خیال ایک ہے۔ اس لئے تکنیکی اعتبار سے طویل مختصر افسانہ کہنا ہی موزوں ہوگا۔ اس میں دو کردار نمایاں ہیں۔ ایک تو استاد ماکان کا اور دوسرا فرنگیس کا' استاد ماکان' ایران کے ایک ماہر فن باکمال مصور ہیں جو خوددار اور غیرت مند ہوتے ہوئے غریبوں اور مظلوموں کے حامی اور مددگار ہیں وہ رضاشاہ کبیر کی حکومت کے استبداد کے خلاف اپنے آرٹ سے اور خفیہ طور پر اخبار کے ذریعہ مخالفت کرتے رہے۔ ان کی زندگی میں عورت دخیل نہیں ہوسکی لیکن صرف فرنگیس جو امیر گھرانے کی لڑکی

تھی۔ وہ پیرس میں آرٹ سیکھنے گئی۔ اس نے اپنے حسن و زیبائش سے بھی بہتوں کو رلایا اور ہلاک کیا۔ وہیں سے اس نے خدمت خلق کا جذبہ سیکھا اور استاد ماکان کی شہرت اور شخصیت کا اس کو علم ہوا۔ تہران میں آکر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی، ٹائپ کرنا سیکھا اور خفیہ طور پر استاد کی رہنمائی میں کام کیا اور اس کے دل میں اپنی محبت کیلئے جگہ بنالی لیکن استاد ماکان کی نگاہوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان میں سے ایک قسم کی بے وفائی اور فریب کی جھلک نظر آتی تھی اس لئے ایک دفعہ باہمی عشق کے بعد کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ استاد کو گرفتار کرلیا گیا اور ممکن تھا کہ اس کو قتل کردیا جاتا لیکن فرنگیس نے رئیس شہربانی سے جو پیرس کے زمانے میں اس کا دوست تھا شادی کا وعدہ کرکے اس کو رہائی دلائی یعنی اس کو کلات میں جلا وطن کردیا گیا۔ جب کاستاد کو اس شادی کا علم ہوا تو اس نے فرنگیس کی تصویر بنائی جس میں اس کی آنکھوں میں مخصوص کوائف کا اظہار کیا۔ یہ تصویر استاد ماکان کے مدرسہ میں نمائش کیلئے رکھی گئی تھی۔ کسی شخص کو اس تصویر کے پس منظر کا علم نہیں تھا۔ ناظم مدرسہ استاد کے حالات زندگی اکٹھا کرنے کیلئے کوشاں تھے۔ انہوں نے اس تصویر کی اصل شخصیت کو ڈھونڈ نکالا اور اس سے استاد کی زندگی کے اس چھپے ہوئے گوشے کو بے نقاب کیا۔ فرنگیس نے یہ ثابت کیا کہ استاد نے ایسی آنکھیں بنا کر اس کیلئے روحانی اذیت کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس نے سمجھنے میں غلطی کی۔ یہ آنکھیں اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔

اس کہانی میں استاد ماکان کی شخصیت حقیقی ہونے پر یقین آتا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس میں ایران کے نامور مصور کمال الملک کی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ تہران میں آجکل اس کے نام سے ہنرہائی زیبا کا مدرسہ بھی قائم ہے۔ کہانی کی جزئیات واقعی معلوم ہوتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص شہر کی اندرونی سیاست سے آشنا اور لوگوں کی زندگی سے واقف ہے اور اپنی آپ بیتی بیان کررہا ہے۔ ناظم مدرسہ جو استاد کے آرٹ کا والہ وشیدا ہے اور فن کی جزئیات کو سمجھتا ہے۔ اس کی زبان سے یہ قصہ بیان ہوا ہے اس لئے جب وہ بعض تصویروں کی خصوصیات بیان کرتا ہے تو واقعیت کا یقین ہوتا ہے۔

فرنگیس تکنیک کے اعتبار سے یہ افسانہ بہت خوب ہے۔ کہانی کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ فرنگیس کے دل و دماغ کی کیفیات کا بڑا حسین تجزیہ کیا ہے اگرچہ کہیں کہیں بعض گزشتہ واقعات کی جزئیات کو اس قدر باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے کہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو پرانے واقعات اس ڈرامائی انداز میں کیسے یاد رہ سکتے ہیں لیکن افسانہ اور ڈرامہ میں اس

قدر "غیراغلبیت" جائز سمجھی جاتی ہے۔

"ورق پارہ ہائی زندان" میں وہ کہانیاں شامل ہیں جو بزرگ علوی کے زمانہ قید یعنی 1317 سے 1320 کے متعلق ہیں ان میں رضا شاہ کبیر کے عہد حکومت میں استبداد و جبر کا علانیہ ذکر ہے۔ قید خانے میں سیاسی قیدیوں کی بدحالی اور کرب و ابتلاء سے پر زندگی کا بیان ہے بعض قیدیوں کی دردناک داستانیں ہیں۔ "عفو عمومی" میں ایک قیدی اپنی بیوی کے نام روزانہ ایک خط لکھتا ہے۔ یہ افسانہ اپنے درد اور خلوص کے اعتبار سے المناک اور دل ہلا دینے والا ہے۔ قید خانے کے افسروں اور پہرہ داروں کی سختی، ظلم اور بے رحمی کا بھی عبرتناک تذکرہ ہے۔ اسی زمانے میں موجودہ محمد رضا شاہ کی شادی کا بھی ذکر ہے جس کی مسرت میں قیدیوں کو "عفو عمومی" کی امید تھی۔ ان کہانیوں سے حکومت اور اس کے کارکنوں کے خلاف سخت نفرت اور غضب کا اظہار ہے۔

53 نفر

بزرگ علوی کا ایک کامیاب رپورتاژ ہے۔ 1316 میں رضا شاہ کے حکم سے کمیونزم کے حامیوں میں سے 53 شخص گرفتار کئے گئے اور 1320 میں رہا ہوئے یعنی اس وقت جب رضا شاہ استعفیٰ دیکر چلے گئے اور روسیوں اور انگریزوں نے اپنی فوجیں سرزمین ایران میں داخل کردیں۔ اس کتاب میں گرفتاری سے لیکر مقدمہ، سزا اور رہائی تک کے واقعات کا ذکر ہے۔ مصنف نے اس دور سیاہ میں حکومت اور اس کے اعمال کے ہاتھوں جو جو سختیاں برداشت کیں، ان کو صحافتی دیانتداری سے بیان کیا ہے۔ قیدیوں کی پست حالی، جیل کے منصب داروں کی بے رحمی اور ساتھ ساتھ رشوت خوری، سیاسی قیدیوں کی پامردی، کتاب، اخبار، کاغذ، سیاہی اور اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے جدوجہد، رئیس محکمہ اور وکلاء کی بے بسی کے تمام واقعات بڑی صراحت اور دل پسندانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ ساری کتاب مصنف کے خلوص اور سوز دروں کی آئینہ دار ہے۔ مصنف نے اپنے سیاسی مسلک کو بھی واضح کیا ہے اور کہا ہے کہ محض اقتصادی یا اجتماعی نظریات کے متعلق کتابیں پڑھنا اور اپنے اس فلسفہ کو عملی بنانے کیلئے کوشش کرنا جرم نہیں ہے۔ رضاخاں کی مطلق العنان حکومت کے خلاف چوری چھپے عوام اور اروپائی مدرسوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں جو آزادی خواہی اور خود مختاری کے احساسات پائے جاتے تھے۔ اس کتاب میں ان کی ایک کامیاب جھلک نظر آتی ہے۔

علی دشتی

علی دشتی 1275 شمسی کو کربلا میں پیدا ہوئے۔ وہیں قدیمی مدرسوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فقہ، اصول فقہ اور معانی اپنے وقت کے برگزیدہ استادوں سے پڑھے۔ جنگ عظیم اول کے اواخر میں شیراز چلے آئے۔ وہاں سے کچھ عرصہ کیلئے اصفہان چلے گئے۔ اصفہان میں ہی انہوں نے 1919 کی قرارداد یعنی معاہدہ انگلیسی کے خلاف زوردار مضامین لکھے۔ شیراز میں بھی انہوں نے ادب و اجتماع پر مضامین لکھے تھے مگر اصفہان کے مضامین میں اس نوجوان کا سیاسی شعور نمایاں ہوا اور حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ تہران میں آئے تو وہاں بھی وثوق الدولہ وزیراعظم کے خلاف 'شب ناموں' میں تیز و تند مقالے لکھے جس کی بنا پر قید کر دیئے گئے۔ بعد میں ایران سے خارج کر دینے کا حکم جاری ہوا اور فوراً تہران سے باہر بھیج دیئے گئے۔ قزوین تک پیدل چلے تو بیمار پڑ گئے۔ دس روز کے بعد ڈاک گاڑی میں بٹھا کر ان کو ہمدان بھیجا گیا۔ ہمدان کے علماء نے ان کی گرفتاری پر اعتراض کیا اور مرکز میں تار بھیجے لیکن جواب پہنچنے سے پہلے ان کو کرمانشاہ روانہ کر دیا گیا تھا۔ سپہدار کی وزارت کے دوران میں تہران آئے لیکن وہاں بھی ایک ہفتہ کیلئے مقید رہے۔ اس قید و بند کی تفصیل انہوں نے اپنی کتاب "ایام مجلس" میں لکھی ہے۔

تہران میں انہوں نے اپنی صحافتی زندگی شروع کی اور ابتدا میں تین ماہ کیلئے روزنامہ "ستارۂ ایران" کے چیف ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد مرزا حسین علی خاں صبا کے ساتھ روزنامہ "ایران آزاد" میں کام کرتے رہے۔ جب وہ اخبار بند ہوگیا تو 1300 شمسی میں انہوں نے اپنا مستقل اخبار "شفق سرخ" جاری کیا جو ہفتہ میں تین مرتبہ چھپتا تھا۔ یہ اخبار تیرہ سال تک وقفوں کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ پہلے دور میں پانچ سال تک جاری رہا۔ ایک مقالہ بعنوان "کشتار ہولناک بختیاری" چھاپنے کی بنا پر حکومت نے اس کی اشاعت روک دی۔ بعد میں انہوں نے "عصر انقلاب" اور "عہد انقلاب" کے نام سے بھی دو اخبار نکالے اور حکومت کے خلاف نقطہ چینی سے باز نہ آئے۔ کئی اور آزادی خواہ اخبار "شفق سرخ" کی حمایت کی وجہ سے بھی بند کر دیئے گئے۔

دوسرے دور میں چوتھے سال کے نصف سے آٹھویں سال تک، شفق سرخ، یومیہ شائع ہوتا رہا اور اس کی روش بھی نرم اور مثبت ہوگئی۔ تیسرے دور میں نویں سال سے تیرہویں سال تک یہ اخبار مایل تولیسرکانی کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ 1313 میں دشتی بھی قید ہوئے اور ان کا اخبار بھی بند ہوگیا اور پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ دشتی اس مرتبہ چودہ مہینے تک قید رہے۔

اس صحافتی زندگی کے دوران میں دشتی روسی انقلاب کی دسویں برسی کے جشن میں شریک ہونے کیلئے دیگر اخبار نویسوں کے ہمراہ ماسکو گئے اور پھر ساڑھے تین ماہ تک اروپائی ممالک کی بھی سیر کی۔

وہ کئی بار مجلس شوریٰ ملی کے نمائندہ منتخب ہوئے۔ چھٹے سے نویں دور میں بوشہر اور بارہویں اور تیرہویں دور میں دوماند اور چودھویں دور میں تہران کی طرف سے نمائندہ انتخاب ہوئے۔

حکومت کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے 1325 ش میں قوام **السلطنتہ** کے حکم سے پھر قید کردیئے گئے اور بعد میں اپنی شخصی اقامت گاہ میں نظربند رہے، پابندی سے آزاد ہونے کے بعد فرانس چلے گئے اور وہاں بیس ماہ کے قیام کے بعد 1327 میں واپس تہران آئے۔ اسی سال وہ مصر میں سفیر کبیر ایران کی حیثیت سے متعین ہوئے۔

پچھلے تین چار سالوں سے ان کی صحت خراب رہتی تھی اور وہ کم آمیز ہوگئے تھے اور اسی عرصہ میں وہ دو تین مرتبہ لمبے وقفوں کیلئے پیرس میں مقیم رہے۔ اس کے بعد دوسرے ممالک میں سفیر ایران کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

علی دشتی بڑے صاحب ذوق واقع ہوئے ہیں۔ جمالیات سے انہیں خوب لگاؤ ہے۔ پھولوں سے محبت ہے تہران میں انہوں نے مصوری اور نقاشی کا حسین سے حسین شاہکار ڈھونڈ کر اکٹھا کیا تھا۔ سنتور کی موسیقی ان کو دیوانہ بناتی تھی۔ حبیب سنتور زن پر وہ فدا تھے۔ مغربی موسیقی سے بھی وہ لطف اٹھاتے ہیں۔ لباس و غذا کی نفاست اور نظافت بھی ان کی زبان زد خاص ہے۔ سینما سے زیادہ تھیٹر کے بڑے شائق ہیں۔ پیرس میں وہ تھیٹر دیکھے بغیر رہ نہیں سکتے حسن و جمال اور صورت کے متعلق ان کے خاص نظریئے ہیں جو جابجا ان کے مقالات اور افسانوں میں نمایاں ہیں۔

ایرانی شعراء میں سے وہ حافظ کے عاشق ہیں۔ سعدی کو بھی وہ خداوند زبان فارسی کہتے ہیں لیکن حافظ کی زیبائی تخیل، آزادی فکر، سرشار احساسات اور بلند روح کے وہ گرویدہ ہیں۔

مغربی مصنفین میں سے اناطول فرانس، مارسل پروسٹ، اسکاروائلڈ، رنان، موپاساں، داستایوسکی، گورکی، ترگنیف، آلفونس دوده کا انہوں نے خوب مطالعہ کیا ہے اناطول فرانس سے انہیں خاص عقیدت ہے۔ ایک مقالہ میں' بادشاہ نثر کے عنوان سے اس کی خصوصیات کو بیان کیا ہے اور اس کے طرز نگارش کی بہت تعریف کی ہے۔

فرانسیسی زبان میں انہیں مہارت حاصل ہے اور اسی زبان کی وساطت سے انہوں نے مغربی علماء کے افکار و عقاید کا مطالعہ کیا ہے اور مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔

(1) سر تفوق انگلوساکسون (2) تطور ملل (3) اعتماد بنفس

ان کی اپنی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

1- فتنہ 2- سایہ 3- ہندو 4- جادو 5- ایام مجلس

"قلمرو سعدی" سیردر دیوان شمس 1335 ش" نقشی از حافظ 1332 شاعر دیر آشنا (خاقانی)

افسانہ نگار کی حیثیت سے تو شاید علی دشتی کو بلند وبالا مقام حاصل نہ ہو لیکن نثر کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند ہے ان کی نثر میں جوش و شوریدگی ہے جو کچھ لکھتے ہیں سوز و اخلاص سے لکھتے ہیں۔ واردات و احساسات کے تجزیہ میں انہیں کمال حاصل ہے۔ زبان وبیان پر ان کی قدرت محکم ہے اکثر ان کی نثر میں شاعرانہ لطافت پائی جاتی ہے ان کے نامصالحانہ عقاید سیاسی کی بنا پر تو ان کے مخالف موجود ہیں لیکن ان کی عمدہ طرز نگارش کے سب مداح ہیں۔

فتنہ کے اکثر موضوع ازدواجی مسائل پر مبنی ہیں۔ فتنہ' ماجرای آں شب' دونامہ' میں حاصل بحث عورت کی متلون مزاجی اور بے وفائی ہے۔ فتنہ نامناسب شوہر رکھتے ہوئے اپنی طنازی اور زیبای سے فرامرز کو اپنے اوپر فریفتہ کرلیتی ہے اور اپنے سوز عشق کا بھی یقین دلاتی ہے لیکن اس کے باوجود ایک بدشکل متمول اور زائد العمر شخص سے درپردہ تسکین شہوت کے لئے ساز باز کرتی ہے۔ ماجرای آں شب میں ایک شخص دو سالہ تک صبرو پائیداری سے ہر ممکن تدبیر سے ایک با کمال حسینہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنی مراد پالنے کے بعد اپنے آپ کو خوش بخت ترین شخص تصور کرتا ہے لیکن عین اس سرور میں عورت کے اس اقرار سے کہ اس سے پہلے وہ کسی اور شخص کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے اس کو نامراد و شکستہ دل بنا دیتی ہے۔ دونامہ میں بھی ایک عورت کی سخت دلی' ریاکاری اور ستم ظریفی کی طرف اشارہ ہے۔ دفتر ششم میں ازدواجی مسائل کی بحث متوازن ہو گئی اور عورت و مرد کے حقوق میں تجاوز و غفلت پر مخالف و موافق رائے کا اظہار ہے۔ نامہ یک زن' میں خصوصاً عورت مرد کے ظالم و غاصب

ہونے کی شکوہ گزار ہے اور اپنی مظلومیت اور بے بسی کے خلاف فریاد کرتی ہے۔

مصنف کے دو نظریئے تو ایک دوسرے کے متوازی جابجا نظر آتے ہیں جب وہ مردوں کی طرف گفتگو کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ عورتیں حسن و آرائش کے جال بچھا کر اپنی سحر آگیں آنکھوں اور امید افزا تبسم سے مردوں کو فریفتہ کرتی ہیں اور یاس و امید کی چکی میں پیس کر ان کو رلاتی ہیں۔ مرد کے مردانہ غرور' جذبہ ملکیت اور غاصبانہ زور کو توڑ کر اسے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں اور لذت حاصل کرتی ہیں۔ یہ گویا انتقام ہے اس زبوں حالی اور پستی کا کہ مرد مدتوں سے قوانین اجتماعی اور زمین و اموال پر دسترس رکھتا ہوا عورت کو پامال کرتا رہا ہے۔ مرد عورت کی بے وفائی کج نظری اور کمزوری کا شاکی ہے۔ عورت عشق اور ہنر سے زیادہ روپیہ اور منصب پر جان دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت کی طرف سے جب گفتگو کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مرد ہوا و ہوس کا پتلا ہے۔ عورت کو اپنی شہوت کی آماجگاہ سمجھتا ہے۔ وہ اس کو اپنی مقبوضہ اور مملوکہ چیز جانتا ہے اپنے آپ کو حاکم علی الاقتدار سمجھتا ہے۔ خود جس طرح چاہے عزت کے منافی عمل کرتا ہے لیکن اگر عورت کی طرف سے کوئی ایسی حرکت سرزرد ہو جائے تو آتش زیر پا ہو جاتا ہے اور جنگ و طلاق پر نوبت آتی ہے۔......"مرگ مادر" میں ایک عورت اپنے بچوں کو چھوڑ کر خودکشی کرلیتی ہے۔ آخرین ملجاء میں جوان الھڑ عورت ایک نوجوان کے فریب میں آکر بیاہ کرلیتی ہے اور وہ اس کو چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔ حاملہ ہونے کی وجہ سے اسے کوئی قبول نہیں کرتا۔ بعد میں قحبہ خانہ میں جاکر سل میں مبتلا ہو کر جان دیتی ہے ان دونوں کہانیوں میں مرد کی بے اعتنائی اور سنگدلی پر واضح تنقید ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اگر عورت عیاری یا جھوٹ سے کام لے کر جنسی معاملات میں لغزش کھا جاتی ہے تو اس میں اس نظام اجتماعی کا قصور ہے جس میں وہ پرورش پا رہی ہے ایسا کرنے میں وہ مجبور ہے۔

مصنف نے جابجا متوازن رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ عورت پر مرد کی طرف سے کیا فرائض ہیں۔ عورت کیلئے گھربار کی ذمہ داریاں سنبھالنے' بچوں کی تربیت کرنے اور شوہر کی خدمت اور وفاداری پر زور دیا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کے ساتھ زندگی کے حقوق میں مساوی درجہ دینے اور بیوی کے ساتھ وفادار رہنے کی تلقین کی ہے۔

فتنہ کے تمام افسانوں میں دل و دماغ کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ جذبات کا ٹکراؤ ہے خیالات کا تصادم ہے۔ ازدواجی زندگی کی تلخیاں ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے باہمی تعلقات پر ایک بلند نظر اور باریک بین شخص کا تبصرہ ہے۔

فتنہ کے ان تمام افسانوں میں جتنے بھی کردار بولتے ہیں تقریباً وہ سب جوان ہیں یا ادھیڑ عمر کے ہیں۔ سب شاعر، ادیب اور فلسفی ہیں۔ گفتگو کے دوران میں بھی مناظر یا طبیعت کی ایسی جزئیات بیان کرتے ہیں جو بڑے غور و فکر اور قلم کے دیر مشق عمل کے بعد ہی لکھے جاسکتے ہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اگر اس نے مرد کے جذبات کی حیثیت سے بیان کا حق ادا کیا ہے اس لحاظ سے " نامہ یک زن" ایک شاہکار ہے۔ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ واقعی ایک عورت اپنے احساسات کو شور و ہیجان کے ساتھ جزئی صداقتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتی جاتی ہے۔ مرگ مادر اور آخرین ملجاء اپنے سوز و خلوص و واقعاتی صداقت اور سماج کے خلاف تنفر اور تعریض کے اعتبار سے بڑی کامیاب چیزیں ہیں۔ مصنف کی شخصیت ہر جگہ چھائی ہوئی ہے۔

جادو میں دو افسانے ہیں یعنی جادو اور پلنگ اور تیرا پاریس پر مضمون ہے جس میں مصنف نے پیرس کی گوناگوں زندگی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ عورتوں کی گرمی احساس اور آزادی فکر کے متعلق خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ضمناً ایرانی عورت کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ فتنہ' کے شائع ہونے پر عورتوں نے مصنف پر اعتراض کیا تھا کہ اس کو عورت کی صرف بے وفائی اور بے اعتنائی کا مضمون پسند آیا ہے تو اس نے "فتنہ" کی اشاعت دوم میں جواب یوں دیا تھا کہ وہ سراسر عورت کی ان ہی خصوصیات کو ابھارنا نہیں چاہتا بلکہ انہوں نے کردار خصوصی انتخاب کئے تھے۔ "فتنہ" میں تو انہوں نے اپنے خیالات کو دوسرے کی زبان میں افسانوی رنگ میں پیش کیا تھا۔ لیکن "پاریس" میں انہوں نے اپنی زبانی واضح طور پر کہا ہے ایرانی عورت جب یہ دیکھتی ہے کہ کوئی شخص اس سے محبت کرتا ہے تو وہ مستبد اور فرعون بن جاتی ہے اور جب اسے کوئی شخص پسند آتا ہے تو اس خیال سے کہ کوئی دوسرا اس بات کو نہ پالے۔ اس سے نفرت بے اعتنائی اور دوری اختیار کرتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھاگ کر اس بیچارے کو بھی میدان سے فرار کراتی ہے اور جب کسی سے عشق کرتی ہے تو اس میں آخر رسوائی تک نوبت پہنچتی ہے۔ اس کا عشق خود غرضی، خود پسندی اور ذاتی مفاد کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ ایرانی عورت جب فکر و رائے کی آزادی کا اظہار کرتی ہے تو جبر سے مرد پر اپنے خیالات کا بار ڈالتی ہے اور جب تواضع اور موافقت کا اظہار کرتی ہے تو خدمت گزاری اور عبودیت تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ایرانی عورت سے ناخوش ہیں۔

"پلنگ" میں ایک خطرناک حسینہ جب سوئڈی نقاش سے اپنے متعلق بے اعتنائی دیکھتی ہے تو مصر تک پہنچ کر انتقام لینے کیلئے اس کو قتل کر ڈالتی ہے۔ "جادو" طویل افسانہ ہے اور کتاب کے

138 صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ مختصراً کہانی یہ ہے کہ ایک باسلیقہ شریف بیاہتا عورت اپنے شوہر کے ایک باکمال سیاستدان، خوبرو اور ہردلعزیز دوست کے متعلق اپنے دل میں محبت کے جذبات پیدا کرلیتی ہے اور بڑی کشمکش کے بعد ایک مرتبہ معانقہ و طویل بوسہ کے ساتھ اظہار محبت ہوجاتا ہے چونکہ شخص محبوب زن دوست نظرباز ہے جب بھی وہ کسی عورت کو مسکرا کر دیکھتا ہے تو محبوبہ کے دل میں رقابت اور حسد کے جذبات شعلہ زن ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ رقص کے دوران وہ کسی جوان عورت کی طرف نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اس کو چھوڑ کر جدا ہوجاتی ہے۔ بعد میں وہ بھی اس کی اس حس رشک سے تنگ آکر کنارہ کشی کرتا ہے لیکن وہ اتفاقاً سیاسی وجوہ کی بنا پر گرفتار ہوکر جیل میں ٹائفائیڈ سے مرجاتا ہے۔ عورت پہلے سے اس کے فراق میں بیمار ہوکر اپنے حواس کھوئی ہوتی ہے لیکن جب اس کو اپنے محبوب کی خبر وفات ملتی ہے، تو دیوانی ہوجاتی ہے۔

اس کہانی کو وہ ڈاکٹر بیان کرتا ہے جو اس عورت یعنی "جادو" کے معالجہ کیلئے بلایا گیا تھا۔ ضیافتوں کا ذکر، عورتوں مردوں سے ملاقاتیں، دل کے جذبات اور ان کی کشمکش، عاشق و معشوق کی ملاقاتیں اور دوسری جزئیات کا بیان صاف گواہی دیتا ہے کہ ایک ڈاکٹر ان جزئیات سے کیسے آشنا ہوگیا۔ وہ سعدی کی تحریروں اور اناطول فرانس کی تصانیف اور دوسرے فلاسفہ کے عقائد کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مصنف خود بول رہا ہے۔ ایک بات اور اس بیان کو غیر طبعی بنا دیتی ہے وہ یہ کہ بعض فلسفیانہ دقایق ایسی مجلس کے سامنے بیان کئے جاتے ہیں جن میں ایک بے سواد عورت اور ایک سکول کا طالب علم شامل ہے۔ عورت کا غیر معمولی نام " جادو" اور ایک متمول شخص کا نام "گراہدنست" کہانی کے مصنوعی ہونے میں اضافہ کررہا ہے۔

"جادو" میں کہانی کا عنصر کم ہے۔ دل و دماغ کی کیفیات کا بیان زیادہ ہے۔ مصنف عشق و محبت کے میلانات کا بیان اس شدت اور عریانی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے میں ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ "جادو" کا انداز بھی فتنہ کی بیشتر کہانیوں سے ملتا جلتا ہے۔ ایرانی عورت کا عشق مصنف کا من بھاتا موضوع ہے۔

جادو کے بعض جملوں اور عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنی زبان میں نہیں سوچتے بلکہ فرانسیسی میں سوچتے اور لکھتے ہیں اس لئے اکثر جگہ فرانسیسی کلمات استعمال کرتے ہیں۔ ان جملوں کی بندش بھی غیر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کہانی کے بعض جملوں سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ فرانسیسی سے ترجمہ کررہے ہیں۔ فقط اس کہانی میں مندرجہ ذیل کلمات استعمال کئے ہیں۔

انتر کسیون، فورمول، کارکتر **یستیک** ، کسرل، اید آل، متودی، **الکتریکی** ، لاواند، سورپریزها، شاپو، رژیم، اوریژنل، **جنتلمین**، مانورها، کبیه، شانس، آشریک، ارستوکراسی۔

"جادو" کی نثر میں فتنہ جیسی شگفتگی و روانی نہیں۔ سنجیدگی و متانت زیادہ ہے۔ فکر اور سوچ میں ٹھہراؤ ہے۔ معلوم ہوتا ہے دماغ پر زور دے کر لکھا جارہا ہے۔ اس کہانی میں گویا ہر خیال اور واقعہ کی نفسیاتی تفسیر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب مصنف جزئیات میں مصروف ہوجاتے ہیں تو کہانی کی رفتار ست ہوجاتی ہے۔

سایہ

علی دشتی کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اس میں ادبی انتقادی اور اجتماعی موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ کچھ ترجمے ہیں اور کچھ تاثراتی قطعات ہیں۔

علی دشت کی نظر وسیع ہے۔ خیالات میں گہرائی ہے۔ بڑے جچے تلے انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ ان کے طرز بیان میں **منطقیانہ** استدلال ہے۔ بزرگ ترین شاعر ایران کی تشخیص کے بارے میں جس طرح شعراء کی شخصیت اور ان کے کلام کا تجزیہ کیا ہے وہ خیال انگیز اور قابل قبول ہے۔ قاآنی کی شخصیت اور اس کی شاعری پر تبصرہ **منطقیانہ** صحت پر مبنی ہے لیکن اس میں اختلاف آراء کی گنجائش ہے۔

اخلاقی اور اجتماعی موضوعات پر ان کے نظریئے متوازن رائے کے حامل ہیں اور اپنے خلوص اور استدلال کی وجہ سے تاثیر رکھتے ہیں۔

اناطول فرانس ان کا محبوب مصنف ہے جس پر ایک مضمون استادو نثر کے عنوان سے لکھا ہے اور اس کے مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔

ان ہی مضامین سے دشتی کی نثرنگاری میں قوت و قدرت کا اندازہ لگتا ہے۔ ان کی نثر سادہ ہے یعنی جملوں میں پیچیدگی نہیں۔ مطالب میں ابہام نہیں۔ حجازی اور دشتی کی نثر کو ایک دوسرے کے مقابل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ جن نثر کے ٹکڑوں میں انہوں نے اپنے احساسات اور تاثرات بیان کئے ہیں گویا نثر میں شاعری کی ہے۔ تاثرات میں ایک ولولہ ہیجان ہے۔ جملے جملے سے اخلاص عیاں ہے۔ ان کے بیان میں قطعیت و صراحت موجود ہے۔ ان کی تشبیہات واضح اور خیال انگیز ہیں۔ اولین بوسہ، او آمد، تپہ ہائی **الٰہیہ** اور خاطرات میں جابجا اس ادب

لطیف کے نمونے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ٹکڑہ ملاحظہ کیجئے۔

"لب ہای تو مرا مست و بیہوش کردہ بود۔ کاش **میتوانستم** ترا مثل یک شراب کہنہ و گوارای بنوشم۔ ولم میخواست ترا مثل **نسیمہائی** نوازش کنندہ ای کہ تابستا نہاز از فراز قلل البرز میوزو بما حیات و نشاط می دہد، بلعم، آرزو میکردم کہ ترا مثل عطر خفیف و ملائم کہ شب ہا از یک چمن اطلسی متصاعد میشود **استنشاق کنم**"

"ایام مجلس" تین حصوں میں منقسم ہے۔ 1299 میں سید ضیاء الدین برسر اقتدار ہوئے تو انہوں نے تیزوتند سیاست دانوں اور آزادی پسند مصنفوں کو قید کردیا۔ علی دشتی بھی تین ماہ تک قید رہے۔ پہلے حصے میں اسی زمانہ قید کے تاثرات درج ہیں۔

1919 میں جب وثوق الدولہ وزیراعظم ہوئے تو علی دشتی اپنے زوردار "شب نامہ ہا" کی وجہ سے پھر کرمان شاہ میں نظر بند کردیئے گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے تپتی دھوپ میں قزوین تک چھ روز پیادہ سفر کیا اور بیمار ہوگئے۔ ایام مجلس کے دوسرے حصے میں "دو ماہ" کے زیر عنوان اس نظر بندی اور جلاوطنی کے تاثرات درج ہیں۔

علی دشتی کی تیسری گرفتاری خرداد 1313 میں ہوئی۔ خرابی صحت کی وجہ سے پانچ مہینے پولیس کی نگرانی میں صاحب فراش رہے۔ اس کے بعد اپنے گھر میں نظر بند رہے۔ خط لکھنے ٹیلی فون استعمال کرنے یا گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تیسرا حصہ یادداشتوں پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً اس دوران میں قلمبند ہوئیں۔

ایام مجلس کے پہلے دو حصے "شفق سرخ" میں چھپے تھے پھر کتابی صورت میں بھی تین مرتبہ شائع ہوئے۔ چوتھی مرتبہ تیسرا حصہ شامل کرکے یہ کتاب 1326 میں شائع ہوئی۔

بزرگ علوی نے بھی اپنے زمانہ مجلس کے متعلق "ورق پارہ ہای زنداں" اور "53 نفر" کے عنوان سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بیان میں احساساتی کیفیت زیادہ ہے جذباتی شوروہیجان ہے۔ نفرت اور تلخی ہے۔ داستانی عنصر زیادہ ہے اور بیان میں ایک روانی اور بہاؤ ہے۔ ایام مجلس میں ٹھہراؤ ہے۔ تخیل کی گہرائی ہے۔ ایک متفکر کے نظریات کا بیان ہے۔ واقعات پر تبصرہ ہے۔ کہیں کہیں تخیل کی پرواز اور شاعری بھی ہے بیان میں سوز اور اخلاص موجود ہے۔

ایام مجلس کے تیسرے حصہ میں آزادی، کار، عوامل جرم، قوت ارادہ اور زندگی کے مختلف گوشوں پر سبق آموز اور قابل عمل نکات ہیں۔

حسین قلی مستعان

حسین قلی مستعان 1283 شمسی کو تہران میں پیدا ہوئے ابتدائی اور متوسط تعلیم یہیں حاصل کی۔ خصوصاً مکتبی یعنی اخوندی مدارس سے زیادہ استفادہ کیا۔ فلسفہ قدیم و جدید اور فقہ کی تعلیم کی خاص خاص استادوں سے تکمیل کی۔ فرانسیسی اپنے والد سے پڑھی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہنے کا شوق تھا۔ حمید یا مدہوش تخلص کرتے تھے۔ "نسیم شمال" میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ چھوٹی عمر سے ہی اخبار نویسی کی طرف رجحان تھا۔ شروع شروع میں خود "ندائی اموات" کے نام سے اخبار نکالا۔ ان کی صحافتی زندگی 1302 میں شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے خبرنگاری، ترجمہ، دفتر کی کلرکی اور کمپوزیٹری تک کام کیا اور آخر میں ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر تک فرائض انجام دیتے رہے۔ 1302 میں ہی EUG 'ENE 'SUE کے ناول یہودی سرگردان کا ترجمہ روزنامہ "ایران" میں باقساط چھپنا شروع ہوگیا تھا۔ 1307 سے 1318 تک وہ روزنامہ "ایران" سے وابستہ رہے۔ فلسفہ و حکمت اجتماعی اور عائلی زندگی کے متعلق مضامین لکھتے رہے اور فرانسیسی، عربی اور انگریزی سے ترجمے بھی کرتے رہے۔ اس دوران میں مجید مؤقر کے ہمراہ مجلّہ مہر کے ایڈیٹر بھی رہے اور اسی مجلّہ میں ان کی کہانیاں چھپتی رہیں جو بعد میں "اندیشہ ہائے جوانی" کے نام سے شائع ہوئیں۔ وہ مجلّہ شہربانی میں بھی دس سال تک پولسی یا جاسوسی کہانیاں لکھتے رہے۔ 1318 سے 1320 تک انہوں نے ہر مہینہ ایک مستقل افسانہ یا ناولٹ الگ کتابی صورت میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس قسم کے چوبیس ناولٹ شائع ہوئے۔ اس زمانے میں انہوں نے "رہنمائی زندگی" کے نام سے بھی ایک مجلّہ ہفتگی جاری کیا۔ ایران میں شاید یہ پہلا مصور مجلّہ تھا۔ بہت سا کام خود کرتے تھے۔ بیس مختلف ناموں سے مضامین لکھتے تھے۔ 1320 کے بعد روزنامہ "اخبار" اور روزنامہ "گیہان" کے مدیر رہے۔ 1324 میں انہوں نے خود بھی روزنامہ "اخبار" اور روزنامہ "دستور" جاری کئے جو قوام السلطنت اور مظفر فیروز کے دوران اقتدار میں تیز و تند سیاسی مقالات کی بنا پر بند کردیئے گئے۔ 1324 سے تہران مصور مجلّہ ہفتگی ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اب بھی اسی مجلّہ سے وابستہ ہیں۔ ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی افسانہ یا طویل ناول باقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کا ایک ناول "آفت" چھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ پڑھنے

والوں کی طرف سے ہر قسم کے سوالات جو مدیر مجلّہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ ان کے جوابات بھی مستعان صاحب ہی لکھتے ہیں جو "دوست شما اندرز میگوید و رہنمائی میکنذ" کے عنوان کے تحت ہر ہفتہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مستعان کا مطالعہ اور تجربہ بڑا وسیع ہے۔ فرانسیسی اور انگریزی اتنی جانتے ہیں کہ فارسی میں ترجمہ کرسکتے ہیں۔ جرمنی، ترکی اور روسی صرف پڑھ سکتے ہیں اور ان کے مطالب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ یورپ میں دو مرتبہ سفر کیا ہے اور مصر بھی گئے ہیں۔ ادبیات فرانسہ میں تقریباً تمام مشہور مصنف پڑھتے ہیں۔ شیکسپئر سارا پڑھا ہے۔ ادبیات عرب سے خوب آشنا ہیں۔ ٹیگور کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

انہیں ڈراما سے بڑا لگاؤ تھا۔ مرحوم شہرزاد کے ساتھ کام کرتے رہے۔ انہوں نے خود چالیس پچاس ڈرامے لکھے اور سٹیج بھی کئے جو بہت مقبول ہوئے۔ شوہرہای مریم خانہ، عروس مرمرالملوک اور ہالو ان کے بہترین ڈرامے شمار ہوتے ہیں۔ 1312 میں ان کا ایک ڈرامہ فرشتہ اسٹیج ہونے والا تھا۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلی رات ہی دس راتوں کے ٹکٹ بک ہوچکے تھے۔ رقیبوں اور حاسدوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گیا تھا۔ انہوں نے ڈرامہ کو ناکام بنانے کیلئے ہڑبونگ مچادی۔ فرنیچر توڑ ڈالا۔ بجلی خراب کردی لیکن لوگوں کا شوق بدستور قائم رہا۔ انہوں نے چراغ کی روشنی میں ڈرامہ دیکھا۔ تاثر کا یہ عالم تھا کہ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے تر نہ ہو۔ 1326 کے بعد انہوں نے ڈرامہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

دنیائے ادب میں بہت کم ایسے مصنف ملیں گے جو حسین قلی مستعان جیسی محنت اور ہمت کے عادی ہوں۔ ان کو شروع جوانی سے ہی محنت کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے "شہرزاد" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ رات دن میں صرف چار گھنٹے سوتے تھے اور کبھی کبھی کئی راتوں تک نہیں سوتے تھے۔ ان کی انتھک ہمت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل ضخیم کتابوں کا ترجمہ کیا۔

زندگی مردان بزرگ	از پلوتارک	(2 جلد اور آٹھ ہزار صفحے)
بینوایان	وکٹر ہوگو	(5 جلد)
یہودی سرگردان	از اوژن سو	(5 جلد)

ان کے اپنے طبع زاد ناولوں میں سے مندرجہ ذیل نے بڑی شہرت پائی۔

تاریخی

1- رابعہ 2- پسر رابعہ

اجتماعی

1- شہر آشوب 2- "آفت" جو مسلسل باقساط شائع ہوا 3- از شمع پر س قصہ ای

ان کے طویل افسانے یا ناولٹ جو الگ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں- ان کی تعداد چوبیس ہے- ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں-

نرگس، بہشت روی زمین، گلی، عشق آزاد، وسوسہ، مہربانی، افسردہ دل، لذت، پشیمان، شہرزاد، آفرین، نوری، شیدہ، ازیتا، شوریدہ، افتراء ولارام، ناز، عروس، غزالہ، آلامد، استخوان زیرپی، عشق مقدس، قصہ رسوائی-

ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانوں کی تعداد تو ان کے اپنے قول کے مطابق ہزار تک پہنچتی ہوگی- لیکن ان کے دو مجموعے الگ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں-

1- اندیشہ ہای جوانی 8 افسانے

2- ارمغان زندگی 20 افسانے

وہ مندرجہ ذیل مختلف ناموں سے مضامین افسانے اور ناول لکھتے رہے ہیں-

حمید، حبیب، انوشہ، یکی از نویسندگان، نویسندۂ کہن، مینو، مراد، پیرانا وغیرہ-

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی مصنف ہو جس نے مستعان کی اس عمر تک اتنی تعداد میں صفحات لکھے ہوں- واقعی وہ بڑی ہی استعداد اور قابلیت کے مالک ہیں اور ایران میں محبوب ترین مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں- انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے- اپنی صحافتی اور ڈرامائی زندگی کے ہر شعبے سے تجربہ حاصل کیا- بہت سے کرداروں کا مطالعہ کیا- سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی زندگی کے تمام عیوب و نقائص ان کی نظر میں واضح ہیں- جب انہوں نے قلم سنبھالا تو پہلے دھیمے انداز میں عائلی اور اجتماعی زندگی کی خرابیوں کے گوشے بے نقاب کئے- جوں جوں ان کے عقائد و افکار پختہ ہوتے گئے، ان کا قلم بھی بیباک ہوتا گیا- پھر انہوں نے تیز نشتر چلانے شروع کئے- تیز و تند تنقیدیں کیں- سماج کے گندے مواد کو کھول کے رکھ دیا- سوسائٹی کے جس فرد پر

زد پڑتی تھی وہ اپنی داستان پڑھ کر چلا اٹھتا- ان کا نیا ناول "از شمع پر س قصہ ای" اس قدر اثر انداز ہے کہ لوگ گمنام چٹھیاں لکھ کر قتل کی دھمکیاں دیتے تھے- اس کہانی کو " شلاق اور صاعقہ " کہہ کر پکارتے تھے-

ان کے افسانہ نگاری کا محور عائلی اور اجتماعی زندگی ہے- خصوصاً نوجوان کی بے راہ رویوں اور ہوس بازیوں پر خاص طور پر تنبیہہ کرتے ہیں- وہ نوجوان مرد عورت کی شخصیت کو خوب سمجھتے ہیں- عیاشیوں، بدمعاشوں، بگڑے ہوئے دولت مندوں کی بھی خوب گت بناتے ہیں- ان کی عیاریوں کو فاش کر کے عبرت کا سامان مہیا کرتے ہیں-

کہانی کا پلاٹ بنانے میں بھی انہیں خوب مہارت ہے- ڈرامائی محاکات پیش کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے- اکثر کہانیاں منطقی استدلال لئے ہوئے ہوتی ہیں- ابتدائی کہانیوں میں خامی نظر آتی ہے جیسا کہ "اندیشہ ہای جوانی" کی بعض کہانیوں سے واضح ہوتا ہے اکثر کہانیوں رواں چلتی ہیں اور ان کی دلچسپی آخر تک رہتی ہے ان کا تخیل بڑا واضح ہے، جس جس جگہ کا وہ نقشہ کھینچتے ہیں اس کی تصویر ہوبہو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے- پڑھنے والا اپنے آپ کو خود اس ماحول میں محسوس کرتا ہے-

مستعان کو فنون لطیفہ سے طبعی ذوق ہے- شعر، نقاشی اور موسیقی کا جہاں بھی ذکر آیا ہے انہوں نے بڑی لطافت اور فن شناس تحسین سے اس پر نظر ڈالی ہے اور اپنے لطیف ذوق کو نمایاں کیا ہے-

اندیشہ ہای جوانی

مستعان کی مندرجہ ذیل آٹھ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو 1315 شمسی میں شائع ہوا-

1- بازگشت بجوانی 2- دختر بہشت 3- دل شکستہ 4- چرخ پاداش 5- ہیچ کس جزتو 6- پیوند دل 7- بار خاطر اور 8- گوہر- جیسا کہ نام سے ظاہر ہے- یہ افسانے مصنف کی ابتدائی کوششوں کے نمونے ہیں- پہلی تین کہانیوں میں مصنف پر فلسفیانہ اور متفکرانہ خیالات کا غلبہ ہے اور اپنے خیالات کو علامات اور اشارات سے بیان کرنا چاہتا ہے- زندگی کی کسی حقیقت کو واشگاف کرنے کیلئے کہانی کا سہارا لیتا ہے اور اس میں ماورائی عنصر بھی داخل کرتا ہے- "بازگشت بجوانی" میں وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ بوڑھے ہو کر پھر جوانی کی آرزو کرنا ایک عبث فعل ہے اور

افسردگی و ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ اس مقصد کو وہ ایک Allegory کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ پچاس سال کی عمر کا ایک شخص اس فکر میں تھا کہ کوئی راستہ ہے جس سے انسان ہمیشہ جوان رہ سکے۔ وہ اپنی بستی سے باہر پہاڑ کے غار میں رہنے والے پیر مرد سے یہ راز دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ جب 80 سال کی عمر کو پہنچو گے تو پھر اس کا راز بتاؤں گا۔ جب وہ شخص 80 سال کا ہوا تو پیر مرد نے بتایا کہ توانائی و استقلال سے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر پھر سوچنا۔ اگر تمہارا ارادہ ہوا تو پھر پہاڑ کی دوسری طرف تمہیں جوانی کی طرف واپسی کا راز معلوم ہوجائے گا جب وہ شخص خستگی کے بعد وہاں پہنچا تو اس نے جوانی کی آرزو اپنے دل میں مضبوط پائی پہاڑ کی دوسری طرف دور سے خوشنما وادی نظر آئی اور وہ خوشی خوشی اس پر چل پڑا۔ راستے میں پہلے اکا دکا پھر قطار در قطار آدمی اس کے بالمقابل پہاڑ پر چڑھتے آرہے تھے وہ اس کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے تھے نیچے جاکر اس نے دیکھا کہ نوجوان مرد عورتیں شہوت اور ہوس میں غلطاں پھر رہے ہیں اور آخر ایک اندھیرے غار میں گرتے جاتے ہیں۔ اس شخص کا بھی یہی حشر ہوا۔ کوشش کے باوجود بھی لڑھکتا ہوا اسی غار میں فنا ہوگیا۔ "دختر بہشت" میں تمثیلی تخیل ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ عشق و ہوس کی گرفتاری میں حقیقی جنت کھوجاتی ہے۔ ایک لڑکی بہشت میں پھولوں میں رہتی ہوئی درد و اندوہ سے بھری ہوئی دلخراش آواز نکالتی ہے۔ باغبان اور ان کے سردار مشورہ کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کو دنیا میں بھیجا جائے تاکہ تجربوں سے گزر کر بہشت میں آئے تو پھر اس کو راحت و سکون کی قدر معلوم ہو۔ دوسری لڑکیوں کے کندھوں پر' پر لگے ہیں اور وہ خوشیوں میں ادھر ادھر اڑتی ہیں اور مزے لیتی ہیں۔ قرار یہ پایا کہ ایک عورت اس کے ساتھ جائے اور اس کو زندگی کے تجارب میں رہنمائی کرتی رہے۔ یہ عورت دوسروں کو دکھائی نہیں دیتی تھی جب وہ لڑکی زندگی کے بھرپور عیش و عشرت کے جشن میں پہنچی تو شراب و ہوس اور عشق کے چکر میں پڑگئی۔ نوجوان اس پر ڈورے ڈالنے لگے اور وہ رقابتوں کا شکار ہونے لگی۔ اس کی رہنما اسے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی لیکن وہ ہوس کی راہوں میں اس طرح کھوگئی کہ اس نے اپنی دوست رہنما کی آواز پر کان نہ دھرا۔ آخر اسے چھوڑ دینے پر مجبور کیا وہ اڑ کر بہشت میں چلی گئی اور دو بھائیوں کی رقابت میں گرفتار ہوکر ان کی موت کا باعث بھی بنی اور بعد میں خود بھی ہلاک ہوگئی۔ تیسری کہانی "چرخ پاداش" میں بھی ایک قوی ہیکل شخص نمودار ہوتا ہے۔ ایک غاصب اور ناپاک شخص سے انتقام لینے کیلئے اس کے گھربار کو جلا دیتا ہے اور کئی جانوں کو ہلاک کردیتا ہے۔ پھر ایک فرشتہ صفت نوجوان نمودار ہوتا ہے جو اس دیو سیرت

شخص کو اس تباہی سے روکتا ہے اور دو نوجوان میاں بیوی اور دو بچوں کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے والد نے اس طرح اپنی زندگی میں دو بچوں کو پناہ دی تھی۔ یہ گویا نیکی کا معاوضہ اور وہ بدی کا انتقام تھا یعنی "چرخ پاداش"۔

باقی کہانیوں میں یہ تمثیلی کیفیت نہیں۔ اب مصنف براہ راست زندگی میں داخل ہورہے ہیں۔ زندگی کی ناہمواریوں پر ان کی نظر ہے۔ امراء کی عیش کوشی' غارت گری اور ظلم کو دیکھتے ہیں۔ نوجوانوں کی محبتوں اور ہوس کاریوں' شادیوں' وفاداریوں اور بیوفاؤں کی داستانیں بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنے غم میں شریک کرتے ہیں۔ "ہیچ کس بجز تو" میں سچی محبت کا واقع ہے۔ لڑکی کے والدین ایک ناموزوں نوجوان یعنی اس کے چچیرے بھائی سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے محبوب نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ وہ دونوں سمندر میں کشتی پر سوار ہوتے ہیں کہ طوفان کی زد میں آکر لڑکی آغوش گرداب میں پھنس کر جان دیتی ہے۔ "دل شکستہ" میں نوجوان ایک لڑکی سے عشق کرکے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ محبت میں دغا دیکر اس کی زندگی کو تلخ کام بنا دیتا ہے۔ "بار خاطر" میں لڑکی کسی فریب کار نوجوان کے دام میں پھنس کر حاملہ ہوجاتی ہے۔ شادی ہوجاتی ہے تو اس کا پاک وفادار شوہر اپنے بچے کی امید میں خوشحال ہوتا ہے لیکن جب لڑکی راز بتاتی ہے تو دونوں کی زندگیاں تلخیوں سے بھر جاتی ہیں۔ "پیوند دل" میں میاں بیوی کی محبت میں ایک دوسرے کی طرف سے خیانت کا ذکر ہے اور پھر اس کی پاداش کا بیان ہے۔ "گوہر" ایک طویل کہانی ہے اور اس میں ان سب چیزوں کا ذکر ہے۔

ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف میں ابھی کہانی کے تاروپود کو پختگی سے درست کرنے کی قابلیت پیدا ہورہی ہے۔ پلاٹ کی دلبستگی کم ہے۔ کہانی میں واقعات بہت کم ہیں۔ مثلاً "ہیچ کس بجز تو" اور "دل شکستہ" کے پلاٹ میں تصنع بھی موجود ہے واقعات کے حقیقی ہونے پر شبہ ہوتا ہے۔ "بار خاطر" میں میاں بیوی خوبصورت کار میں سفر کو نکلتے ہیں۔ راستے میں کھیتوں کے کنارے ایک کٹیا میں اترنا پڑتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو رات شیر کھڑکی کے اندر پھاند کر بچے کو اٹھا لے جاتا ہے۔ "پیوند دل" میں بیوی خاوند کی غیر موجودگی میں کسی دوسرے نوجوان کو لب چومنے کا موقع دیتی ہے بعد میں اپنی خیانت پر پشیمان ہوکر ہونٹ کو اس طرح کاٹتی ہے کہ اس پر زخم ہوجاتا ہے جو آہستہ آہستہ خراب ہوجاتا ہے۔ سرجن خاوند کی ران سے گوشت کاٹ کر لبوں کو درست کرتا ہے۔ گوشت اتفاق سے ران کے اس حصے سے کاٹا جاتا ہے جہاں کسی غیر عورت نے بوسہ دیا تھا جب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں تھا اور اپنی بیوی سے

خیانت کر کے دوسرے کے دام محبت میں گرفتار ہو چلا تھا لیکن بعد میں بچ گیا تھا یعنی دونوں میاں بیوی نے اپنی خیانت کی سزا پائی۔

"گوہر" میں یہ نقص بھی نمایاں ہے کہ مصنف واقعات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں اور افسانہ کی حدود سے نکل جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے کرداروں کو بھی ابھارتے آتے ہیں جس کا موضوع سے کم واسطہ ہوتا ہے۔ موضوع بھی ایک سے زیادہ سامنے آتے جاتے ہیں۔ مثلاً اسی کہانی میں آدھی سے زیادہ کہانی پڑھ چکنے کے بعد گوہر کا کردار سامنے نہیں آتا پہلے جلیل اور اس کی بیوی کو پوری زندگی سامنے آتی ہے پھر سنگدل ظالم یعنی غضنفر کی ساری زندگی اور اس کا کردار سامنے آتا ہے جس نے سود در سود پر قرضے دیکر پہلے جلیل کا مکان ہتھیا لیا اور اس کے خاندان کو دربدر کردیا۔ پھر وبا پھوٹنے کا اچھا خاصا طویل ذکر ہے۔ کئی موتوں کا بیان ہے۔ ان تمام واقعات کا ذکر ضمناً آنا چاہئے تھا۔ گوہر کا اصلی کردار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ اور اس کی فرضی بہن ایک ہی آدمی سے محبت کرتی ہے۔

نتیجہ کے لحاظ سے سب کہانیوں میں عبرت کا ایک نہ ایک سبق موجود ہے۔ بے راہ نوجوانوں کیلئے ایک سرزنش اور تنبیہہ ملتی ہے۔ بعد کی کہانیوں میں مصنف کا یہ شعور پختہ ہوگیا ہے۔ فن کی پختگی بھی نمایاں ہوتی جارہی ہے وہ اجتماعی زندگی کی خرابیوں پر زور سے بحث کرتے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا بننے میں بھی ان کو مہارت ہوگئی ہے۔

"شہرزاد" ایک عاشق مرد ایک عاشق عورت کی داستان ہے۔ دونوں صورت و سیرت کے لحاظ سے بلند مقام تھے۔ مہذب و ہنرمند۔ مرد زندگی کے ایک محبوب رفیق کی تلاش میں تھا۔ اسے ایک دل پسند ہمہ صفت موصوف عورت ملی لیکن وہ بے انتہا آزردہ دل رہتی تھی۔ وہ بھی عشق میں ناکام و نامراد ہو چکی تھی۔ اسے کبھی ایک ادیب و شاعر و انسان دوست مرد سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ شخص بھی انسانوں کی بے وفائیوں کا مارا ہوا تھا اور زندگی سے مایوس ہو کر اندرونی سوز و رنج میں گھلا جاتا تھا جب تین چار مرتبہ کے عشق کے بعد اسے نئی عورت سے محبت ہوئی تو اسے اپنی زندگی میں کچھ سہارا ملا لیکن اس عورت نے غفلت سے اس کے دل کی کیفیتوں کو نہ سمجھا اور اس کے عشق کو تیزوتند کرنے کیلئے فراق کی بھٹی میں جھونکنا چاہا۔ خود سفر پر چلی گئی لیکن عاشق مفارقت کی تاب نہ لا سکا اور اس کی غیر حاضری میں اس نے جان دیدی۔ عورت کا نام شہرزاد ہے وہ اپنی حرکت پر اس قدر پشیمان ہوئی کہ دل شکستہ ہو کر نامرادیوں اور ناکامیوں کا ڈھیر بن گئی، اس لئے وہ کسی دوسرے کی محبت کا جواب نہ سکی۔ اس نے اپنے چاہنے والے کو اپنی زندگی کی اس

داستان کو سنایا اور کہا کیا دل کی اس حالت کے ساتھ میں کسی سے محبت کرنے کے لائق ہوں اور اس سے درخواست کی کہ وہ میرا غمگسار بھائی بنے اور مجھے اپنی دکھیا بہن سمجھے۔

اس کہانی میں مصنف کے دوست "شہرزاد" کی تلخ زندگی کا ایک خاکہ ملتا ہے۔ شہرزاد جوانی تک خوشحالی کی آغوش میں پلے تھے۔ پاکیزہ صورت و سیرت سے آراستہ تھے۔ بلیغ فکر شاعر، عمدہ ڈرامہ نویس اور موسیقی اور نقاشی سے آشنا شخص تھے۔ انہوں نے بھی ناسازگار زمانہ سے تنگ آکر خودکشی کرلی تھی اور ہر لحاظ سے حسین زندگی کو برباد کر کے اعزاء و احباب کو غمناک بنا دیا تھا۔ اس کہانی میں شہرزاد کا نام عورت کو دیدیا اور "وفا" دراصل "شہرزاد" ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر مصنف کی قوت تحریر سے آدمی متاثر ہوتا ہے وہ احساسات و جذبات کا بلیغ ترجمان ہے۔ عاشق و معشوق کے درمیان جو مراسلات لکھے گئے ہیں ان میں کراہتے ہوئے دلوں کی پکار اور ہجر و وصال کی کشمکش میں گرفتار انسانوں کی داستان سنائی دیتی ہے وہ خطوط انشاء کے بھی بہترین نمونے شمار ہوسکتے ہیں اگرچہ مراسلات کی طوالت اور وفا کے نظریات کا طویل بیان پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی ہے لیکن ساری داستان میں پڑھنے والا اپنے آپ کو عاشق و معشوق کے اضطراب میں شریک سمجھتا ہے اور زندگی میں ایسی تلخ ناکامیوں کو دیکھ کر آہ بھرتا ہے اور اپنے دل میں یاس و نامرادی کا سایہ محسوس کرتا ہے۔

وسوسہ

مستعان کی ایک مضبوط کہانی ہے۔ جب تنومند ماں باپ کا بیٹا یتیم رہ گیا تو اپنی خالہ زاد بہن کے گھر میں پرورش پاتا رہا۔ خود بھی پڑھتا رہا اور خالہ زاد بہن کی لڑکی کو بھی پڑھاتا رہا۔ جب وہ جوان ہوئے تو محبت کا اظہار ہونے لگا۔ غزالہ کے سخت گیر متعصب باپ نے شکوک و بدنامی کے خوف سے لڑکے کو گھر سے باہر نکال دیا۔ غزالہ پھلی پھولی اور اس کو ایک نوجوان فوجی افسر سے بیاہ دیا گیا۔ میاں بیوی محبت کی سرمستیوں میں ڈوب گئے۔ حبیب نے محبت زندہ رکھی اور فراق میں گھلتا رہا۔ تہران چھوڑ کر اپنے آبائی وطن تبریز میں چلا گیا۔ اتفاق سے غزالہ، اس کا شوہر اور شوہر کی بہن بھی ملازمت کے سلسلے میں تبریز گئے۔ راستے میں ان کی گاڑی ٹوٹ گئی۔ کردوں نے حملہ کر کے ہوشنگ اور سیارہ یعنی بہن بھائیوں کو قتل کردیا۔ غزالہ وحشت سے دیوانہ ہوگئی۔ گاڑی والا اسی حالت میں غزالہ کو تبریز لے آیا۔ وہاں حبیب سے اتفاقی طور پر ملاقات ہوگئی تو وہ

اس کو اپنے گھر لے گیا اور اس کا علاج کرتا رہا لیکن اس کا دماغ صحیح نہ ہوا۔ آخر بہتر علاج کیلئے اس کو ماں باپ کے پاس تہران لے آیا۔ دو تین مہینوں کے عرصہ میں حبیب نے اس کی تیمارداری میں اپنی جان کھپائی۔ اس کو نہلانے دھلانے کپڑے پہنانے سلانے کیلئے اس کے عریاں سڈول جسم کا نظارہ بھی کرتا رہا۔ غزالہ اپنی دیوانگی کے عالم میں ہوس و شہوت کی تسکین کیلئے جذبات مشتعل کرنے کے اسباب فراہم کرتی رہی لیکن حبیب نے عفت و تقویٰ کو نہ چھوڑا جب اسے ہوش آیا تو اس کی غمزدہ روح میں روشنی کی امید ہوئی کہ شاید غزالہ کیلئے بھی سعادت و خوش بختی کا موقع مل جائے لیکن دردناک حوادث کا اس کے دل پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ نئی زندگی شروع کرنے کیلئے رضامند نہ ہوئی۔ آخر اسی دور میں اس کی جان گئی اور حبیب نامراد و ناکام غم و اندوں میں ڈوبا رہا۔

کہانی کی **واقعیت** میں نقص رہ گیا ہے کیونکہ یہ بات غیر اغلب ہے کہ ایک فوجی افسر اور اس کی بہن قتل ہوجائے اور پھر پولیس اور فوج قاتلوں کو گرفتار کرکے ان کو گولی کا نشانہ بھی بنائے اور اس واقعہ کی خبر ان کے ماں باپ اور سسرال کو نہ ہو اور حبیب غزالہ کے دستخط کے متشابہ خط لکھ کر صرف اس کے ماں باپ کو صحت و سلامتی کے خط لکھتا رہے اور دو تین مہینوں تک اصل کیفیت سے بے خبر رکھے اور بعد میں اطلاع دے۔

اجتماعی نقطہ نظر سے اخلاقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ متعصب شخص نے محض دنیاوی نام و نمود کی خاطر دو محبت بھرے دلوں کو ملنے سے روک دیا جس کے نتیجہ میں ایک حساس جوان کی زندگی غم و اندوہ میں غرق ہوگئی۔ دوسری چیز جو مصنف کے مدنظر معلوم ہوتی ہے وہ اس نوجوان کا بے مثل کردار ہے جس نے عقل و شہوت کی کشمکش میں جذبات کے ہیجان کو عقل پر غالب نہ ہونے دیا۔

کیفیات ذہنی بیان کرنے میں مصنف کو جو ملکہ حاصل ہے وہ اس کہانی سے ظاہر ہے۔ عالم دیوانگی کی حرکات کا بیان بھی اس کی گہری نظر اور تجربہ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ واقعات کا واضح بیان آنکھوں کے سامنے تصویریں پیش کرتا ہے جو کہانی کے پڑھ لینے کے بعد بھی خیال میں ہو بہو موجود رہتی ہے۔

آفرین

مستعان کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس کے فاضل دوست نے لکھا تھا کہ "آفرین

کامل ترین و سودمند ترین داستانی است کہ تاکنوں خواندہ ام" مصنف کے ذہن میں اجتماعی اصلاح کا جذبہ کارفرما تھا جب اس نے آفرین لکھی۔ ایران کی نئی سوسائٹی میں تہذیب نو کے ساتھ نئے فیشن اور حسن کی نمائش کے سامان بھی فراہم ہوئے۔ ہوس بازی اور شہوت رانی کا بازار گرم ہوا اور سوسائٹی' بدکاریوں' گناہوں اور فساد اخلاق کا مرکز بن گئی کہانی کے جتنے کردار ہیں سب اسی قسم کی زندگی کا شکار ہوئے ہیں۔ کمال ایک دولت مند شخص' ادھیڑ عمر میں ایک شہوت ران عورت کے پنجہ ہوس میں گرفتار ہوگیا۔ کمال کی بیوی نوشین اس قصہ کی سب سے بدکردار عورت ہے۔ اس نے پہلے بھی کئی شوہر دیکھے اور سب کو اپنی بے پایاں شہوت کی تسکین کا سامان بنایا۔ کمال کو چھوڑ کر اپنی بیٹی "آفرین" کے محبوب "دارا" سے عشق کرنا شروع کیا اور اپنے شوہر کی پہلی بیٹی "ہما" سے "دارا" کی شادی کرانے کی سازش کی تاکہ اس کی دولت کو ہتھیا کر اس کو چھوڑ دیا جائے۔ نوشین کا پہلا خاوند اور آفرین و ہما کا باپ رحیم بھی اس عورت کا شکار ہوچکا تھا۔ اس نے بھی اپنی جوانی میں ایک معصوم لڑکی سے عشق کرکے حاملہ کی صورت میں اس کو گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ "دارا" ایک حسین نوجوان ہے جو شہوت و ہوس بازی کا مثالی نمونہ ہے جو نوجوان لڑکیوں کو اپنے دام ہوس میں پھنسانے کیلئے ظاہری عشق کا اظہار کرتا ہے۔ حبیب و ہما دونوں بہن بھائی کی طرح جوان ہوئے تھے۔ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ بہن بھائی نہیں ہیں وہ بھی شہوت کا شکار ہوگئے' لیکن بعد میں نادم اور پشیمان ہوئے لیکن جب باپ نے بتایا کہ وہ بہن بھائی نہیں ہیں بلکہ ہما نوشین کی بیٹی ہے۔ نوشین کو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے اسی وقت کی پہلی بیوی کو بھی لڑکی پیدا ہوئی تھی لیکن وہ پیدا ہوتے ہی مرگئی تھی۔ دایہ نے اس خیال سے کہ بیمار ماں کو صدمہ نہ ہو مردہ بچے کو نوشین کے پاس چھوڑ دیا اور زندہ بچہ کمال کی بیوی کے پاس رکھ دیا اور ماں کو خبر نہ ہونے دی۔

کہانی کا پلاٹ خوب بنایا گیا ہے۔ ایک ایک منظر ڈرامائی تشکیل کی طرح سامنے آتا جاتا ہے۔ پہلے دو تین مناظر میں کہانی کا آغاز سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ متفرق مناظر ہیں جن کو مصنف بیان کئے جاتا ہے کہانی کے دو تہائی حصے تک پلاٹ میں گرہیں پڑتی جاتی ہیں۔ پڑھنے والا تعطل میں رہتا ہے اور کہانی کا انجام نہیں پاسکتا۔ کمال کے اقدام قتل کے جرم میں رحیم کی گرفتاری عین اس موقع پر ہوئی جب اس حملہ آور کمال کو زخمی کرکے بھاگ گیا تھا۔ رحیم کی ہیئت کذائی اور اس کے اپنے بیان کے مطابق اور دوسری شہادت کے بغیر قرائن سے

وہی مجرم ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی کیفیت پیدا کرنے کیلئے مصنف کا تخیل سزاوار تحسین ہے۔

مصنف کے بیان میں بڑی وضاحت اور صراحت ہے۔ وہ ہر منظر کو واقعیت کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ محبت اور شہوت کے عالم میں دو شخصوں میں جو کیفیات گزرتی ہیں ان کو برملا بیان کرتا ہے۔ اس لئے دلچسپی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ زیادہ عریاں نگاری تو نہیں لیکن لذت بخش ضرور ہے۔

گلی

ایک بڑی دردناک داستان ہے۔ مازندران میں حکومت نے چھوٹے بڑے زمینداروں سے ان کی زمینیں خرید لیں۔ کھیتی باڑی ختم کردی۔ کارخانے قائم کئے۔ سڑکیں بنوائیں۔ اس سلسلے میں آس پاس کے گاؤں والوں کو زبردستی بیگار پر لگا لیتے تھے۔ املاک کے رئیس اور حکومت کے کارکن بے چارے سادہ لوح دیہاتیوں پر بڑے ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔ یہ ایک رئیس کا قصہ ہے جو دولت اکٹھی کرکے عیش و عشرت میں غرض رہتا تھا۔ تہران کے ہوٹلوں میں آکر پیتا پلاتا تھا اور عورتوں سے شہوت رانی کرتا تھا۔ مازندران کے کسی شہر میں بھی اس نے اپنا مکان تمام تزئینات سے غرق کر رکھا تھا اور جہاں کہیں آبادیوں میں خوبصورت سادہ لڑکیوں کو دیکھ لیتا۔ ان کی عصمتوں کو خراب کرتا۔ "گلی" بھی ایک ایسی ہی گاؤں کی معطر فضاؤں میں پلی ہوئی لڑکی تھی جو اپنے نامزد کے ساتھ مستقبل کے جنتی خوابوں میں زندگی گزار رہی تھی کہ اس رئیس نے دیکھ لیا اور اس کو حاصل کرنے کیلئے چالیں چلنا شروع کیں۔ اس کے باپ کو قید کردیا۔ بوڑھی پرستار مرگئی۔ نامزد دور کارخانے میں لے جاکر بند کردیا گیا۔ آخر اسے اس قدر مجبور کردیا کہ وہ رات کو بارہ بجے اس کے پاس آئے مگر اس بہادر باغیرت عورت نے اپنے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگا کر جان دیدی۔

مصنف نے رئیس کے کردار کو بڑے ہی گھناؤنے اور نفرت انگیز طریق پر پیش کیا ہے۔ وہ عیاری، ستمگری اور شہوت کا سراپا دوزخی نمونہ ہے۔ وہ اس قدر سنگدل ہے کہ اپنی آنکھوں سے گلی کو نیم سوختہ دیکھ کر آیا ہے لیکن جب اسے دوسری لڑکی نظر آتی ہے تو اس کو پکڑ کر ہوس کی تسکین کیلئے اپنے کمرے میں لے جاتا ہے۔

کہانی اس انداز سے بیان ہوئی ہے کہ آدمی پڑھ کر بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں بدمعاش امراء کے خلاف نفرت و بغاوت کے جذبات امنڈ آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے محلوں اور کارخانوں کو آگ لگادے اور ان کی تکہ بوٹی کردے۔

مصنف کے مشاہدات بڑے غائر ہیں۔ وہ مناظر کی ہوبہو تصویریں کھینچتا چلا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے وہ روزمرہ کی زندگی بیان کررہا ہے۔ اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے۔ سوسائٹی میں جہاں جہاں اسے ناسور نظر آتے ہیں ان کو بری طرح نشتر سے چیرتا چلا جاتا ہے۔

کہانی پلاٹ کے لحاظ سے بھی دلچسپ اور مکمل ہے سب کردار واضح اور جیتے جاگتے ہیں۔ "آلامد" ایک ناتمام کہانی ہے جس میں مصنف نے ایسے آزادانہ رقص کی مذمت کی ہے جو اروپائی تقلید میں اکثر محفلوں میں مرد عورتیں باہم مل کر کرتے ہیں۔ ایک نوجوان جو صورت و سیرت کے لحاظ سے ہر جگہ مرغوب ہے اور ایک نغز گو شاعر بھی ہے لوگ اس کے خیالات کی قدر کرتے ہیں لیکن دوستوں کے کہنے سننے پر۔ وہ ایک محفل رقص میں شامل ہوتا ہے لیکن وہ رقص نہیں کرتا بلکہ اس کی مذمت کرتا ہے۔ میزبان حسین عورت اس کو اپنی ملامت اور نفرت کا نشانہ بناتی ہے اور اس کو آجکل کی سوسائٹی کا مرد نہیں سمجھتی۔ لیکن بعد میں اس کا اصلی نام جان لینے سے معذرت کا اظہار کرتی ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کو غیرت دلائی ہے کہ وہ کس طرح گوارا کرتے ہیں کہ ان کی بہو اور بیٹیاں بیگانے مردوں کے ساتھ سینہ بہ سینہ رقص کریں۔

کہانی میں مکالمہ اور بحث کا حصہ زیادہ ہے۔

افسردہ دل

ایک طویل کہانی ہے جس میں ایک بوڑھے کی عیاری فریب کاری اور شہوت پرستی کی داستان بیان کی گئی ہے جو اپنے نوکر کی سازش سے روپیہ چراتا ہے۔ اپنے سوتیلے بیٹے کی بیوی کو رشوت پر حاصل کئے ہوئے نکاح نامے کے بل پر اپنا لیتا ہے بعد میں اس کی فریب کاری کھلتی ہے تو موت کی سزا پاتا ہے۔ بڑے گھناؤنے جرم کا قصہ ہے وہ شراب میں خواب آور دوا ڈال کر فیروزہ کو بیہوش کرکے اس کو حاملہ کردیتا ہے۔ اپنے سمدھی کو چوری کے جرم میں جیل بھجوادیتا ہے۔ بیٹے کی جشن عروسی میں مہمانوں کے لئے دور شراب کے بعد ایک عورت بھی مہیا کرتا ہے۔ مصنف نے اس قسم کے بدکار حاجی احسان کی زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔

کہانی کا پلاٹ قابل غور ہے مصنف نے ماہر تفتیش کی حیثیت سے حاجی احسان اور اس کے نوکر عبداللہ کی فریب کاری کو ہوشیاری سے کھول کر رکھ دیا ہے۔ کہانی کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ کردار بھی واضح ہیں۔ افسردہ دل نوجوان بخت خان ہے جس کو حاجی احسان تہران سے دور شہروں میں تجارت کی غرض سے بھیجتا رہتا ہے تاکہ وہ خود فیروزہ سے استفادہ کر سکے۔ وہ بیچارہ جب اپنی بیوی کو حاملہ دیکھتا ہے اور بعد میں جب وہ دیوانہ ہو جاتی ہے تو اس کو دیکھ دیکھ کر افسردہ ہوتا ہے۔ فیروزہ اپنے حسن وجمال کے ساتھ ساتھ تار بجانے میں بھی ماہر ہے۔ تار بجاتے ہوئے خود بھی کیف و سوز میں گھل جاتی ہے اور سننے والوں کو بھی مست بناتی ہے۔ آخر اس تار کی کیف آور موسیقی سے ہی اس کی دیوانگی دور ہوتی ہے۔ یہ کہانی مصنف کی زور دار کہانیوں میں شمار ہونے کے لائق نہیں کیونکہ اس میں جوش و اخلاص کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ پلاٹ میں بھی تصنع معلوم ہوتا ہے۔

عشق آزاد

اس کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ ایک لائق حکیم و جراح کا بیٹا بھی لائق ڈاکٹر نکلا۔ اس کا باپ نوجوانی میں ہی مر گیا۔ وہ خود اروپائی مدرسوں میں تعلیم پاکر ماہر طب ہوا لیکن زندگی میں خوش بختی نصیب نہ ہوئی۔ وہ مارے مارے شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ ایک گاؤں میں ایک مریض کے علاج کو پہنچا لیکن وہ شدت مرض سے جان بحق ہوگیا۔ اس کی بیوی بھی شدت صدمہ سے مر گئی۔ ان دونوں کی ایک اکلوتی بیٹی "فاقان" رہ گئی جس کو وہ اپنے ساتھ لے آیا۔ اس خوبصورت بچی کو بہترین تعلیم دلائی موسیقی نقاشی اور رقص کے فن سے آشنا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں تنہا اور یہ بھی تنہا۔ اگر وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے رضامند ہو جائے تو شاید اس اندوہناک زندگی میں روشنی آجائے مگر وہ انس کو باپ کے بغیر کچھ اور سمجھنے کے لئے تصور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس سچی محبت کا جواب ہنسی اور مذاق میں ٹال دیتی۔ آہستہ آہستہ دوسرے نوجوانوں کی طرف مائل ہونا چاہتی تھی۔ سب اس کے حسن وجمال کے دلدادہ تھے۔ ڈاکٹر یاس و غم کی آگ میں جل رہا تھا۔ جب اس کی محبت و شیفتگی کا جواب نہ ملا تو اس نے آتش تب میں جل کر جان دے دی۔ جب وہ مر گیا تو پھر فاقان کو اس کی سچی تڑپ کا احساس ہوا۔ یہ عورت یکہ و تنہا زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اپنے دل کی ڈھارس کے لئے سہارا ڈھونڈتی رہی، اسے ہر قدم ٹھوکر لگی

جس نوجوان کو وہ چاہتی تھی اس نے ایک اور دولت مند عورت سے شادی کر لی۔ اس نے ایک اور نوجوان پسند کیا۔ لیکن وہ بھی اس کو صرف ہوس کی تسکین کے لئے چاہتا تھا۔ اس طرح پے در پے شکستوں کے بعد اس نے عشق آزاد کرنا شروع کیا۔ کئی نوجوانوں سے عشق کیا۔ ایک سے جی بھر گیا تو دوسرے کو اپنا لیا۔ آخر ایک پاکباز کو پالیا جس کی پہلی پیش کش کو اس نے ٹھکرا دیا تھا لیکن بعد میں در در کی ٹھوکریں کھا کر اس کو اپنا شوہر قبول کر لیا۔ اپنی ناکامیوں اور تلخ کامیوں کے بعد ڈاکٹر کی یاد اس کا گلا گھونٹتی رہی۔

اگر مصنف کا مقصود عشق آزاد کے نتائج بد دکھانا تھا تو اس طویل افسانے کا پہلا حصہ زائد معلوم ہوتا ہے یعنی ڈاکٹر کی ساری بے کیف زندگی۔ ڈاکٹر تمام معنوی خوبیوں سے آراستہ تھا اگر وہ کوشش کرتا تو ممکن تھا کہ اسے حسب منشا رفیقہ حیات مل جاتی اور خوشحال زندگی بسر کر سکتا۔ لیکن جب اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو گئی اور ادھیڑ عمر کا معلوم ہونے لگا اور اس کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا جس کو اس نے بیٹی کی طرح پالا اور تمام دنیا بھی اس کو ڈاکٹر کی بیٹی سمجھتی تھی اور لڑکی خود اس کو باپ کے برابر سمجھتی تھی۔ اس لئے لڑکی کے عشق میں ڈاکٹر کا گھل گھل کر مرجانا کچھ طبعی اور منطقی نتیجہ نہیں رکھتا۔ نوجوان ارمانوں سے بھرپور لڑکی کو بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی تمام آرزوؤں کا خون کر کے بوڑھے آدمی سے شادی کرے اور اگر مصنف ڈاکٹر کی موت کے بعد عورت کو عشق کی ناکامیوں میں مبتلا کر کے سزا کا تصور دلانا چاہتا تھا تو یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا اگرچہ فاقان کو ناکامیوں کے بعد ڈاکٹر کی یاد بھی آتی ہے لیکن اس پہلی کہانی کے نہ ہوتے ہوئے بھی عشق آزاد کے نتائج بد سے آگاہ کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر جیسا کردار شوہر کی زندگی میں بھی نمایاں ہو سکتا ہے کیونکہ وہ شرمیلا پاکدامن اور سچا آدمی تھا۔ عورت نے اس کی سچی دوستی کا جواب نہ دیا لیکن بعد میں عشق آزاد سے ہار کھا کر دو تین سال بعد انس کو شوہر قبول کر لیا۔ اتنی کہانی سے بھی موضوع افسانہ کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

کہانی کے دونوں حصے بیان کی خوبیوں سے مالامال ہیں۔ تخیل اس قدر واضح ہے کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کے نقشے اپنے سامنے دیکھتے جا رہے ہیں۔ دل و دماغ کی کیفیات بیان کرنے میں مصنف کو جو ملکہ حاصل ہے اس کا اظہار بھی اس کی کہانی کے بعض ٹکڑوں سے واضح ہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے ڈرامائی منظر پیش کرنے میں بھی مصنف کی مہارت ظاہر ہے۔

صادق چوبک

صادق چوبک 1912ء میں بوشہر میں پیدا ہوئے۔ شیراز میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر تہران کے امریکن کالج میں داخل ہوئے۔ 1937ء میں بی اے کیا۔ صادق چوکب فارغ التحصیل ہو کر پہلے وزارت فرہنگ میں ملازم ہوئے پھر شرکت ملی۔ ایران میں ملازمت کرلی۔ 1334 میں ہارووڈ یونیورسٹی امریکہ کی دعوت پر چند مہینوں کیلئے امریکہ گئے امریکن ریڈیو میں فارسی کے سرپرست ہوئے۔ ایران میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر کچھ عرصہ انگلینڈ میں رہے۔ بعد میں امریکہ چلے گئے اور 1377 (1999ء) میں شہرال سرنیو ریاست کیلی فورنیا میں انتقال ہوگیا۔

تالیفات

1- خیمہ شب بازی 1945ء
2- انتری کہ لوطیش مردہ بود 1950ء
3- روز اول قبر 1950ء
4- توپ لاستیکی (ایک ایکٹ کا ڈرامہ)
5- سنگ صبوری
6- چراغ آخر
7- آہ انسان (نظم آزاد کا مجموعہ)
8 آدمک چوبی (ترجمہ PINOCHIO)

1342ھ ش 1963ء میں "تنگ سیر" کے نام سے ان کا ایک ناول شائع ہوا ہے۔

صادق چوبک پیچ دار کہانیاں نہیں لکھتے جس میں آغاز و انجام ہو یا اتار چڑھاؤ ہو۔ وہ زندگی کے کسی روزمرہ حادثہ سے متاثر ہوتے ہیں اور کسی شخصیت سے وابستہ کر کے ان کو بیان کر دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ آپ کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔ چلتے چلتے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں جو دل کو لگتی ہے اور عبرتناک بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کہانیوں میں سے عدل، آخر شب اور یحییٰ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ عدل میں ایک زخمی گھوڑا نالی میں گرا پڑا ہے۔ ایک ایک راہ گیر اس کے پاس سے گزرتا ہے۔ مختلف لوگ بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ سپاہی، نامہ نگار، اجنبی سب

اس کو باہر نکالنے یا اس کی جان خلاصی کیلئے مشورے دیتے ہیں لیکن عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی جگہ جان دے دیتا ہے۔ "یحییٰ" میں ایک لڑکا انگریزی اخبار "ڈیلی نیوز" کا نام یاد کر کے بازاروں میں بیچنا شروع کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد نام بھول جاتا ہے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آخر "ڈیلی نیوز" کے بجائے "پریموس" کہہ کر سمجھتا ہے کہ اس نے اصلی نام پالیا ہے۔ "آخر شب" میں رات کے وقت جب دکانیں بند ہونے والی ہوتی ہیں تو دو مزدور یا معمار شراب فروش کی دکان پر پہنچے گویا شراب کے بغیر زندگی دو بھر ہو رہی تھی۔ ایک نے شراب کی بوتل ہاتھ میں لی۔ اس کا نشان دیکھا۔ مہر پر نظر کی۔ اپنے ساتھی کے ہاتھ میں دی ہوگی کہ وہیں اس کا سر چکرایا۔ اس نے تھوکا۔ دو تین مرتبہ تھوک پھینکی اور وہیں تھوک کے اوپر ہی گر کر ڈھیر ہوگیا۔

صادق چوبک عوام کا افسانہ نگار ہے۔ اس کی کہانیوں کے تمام کردار نچلے طبقہ کے لوگ ہیں یا کہیں متوسط طبقہ کے آدمی ہیں۔ اس نے ان کی شخصیتوں کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ ان کے خیالات اور احساسات انہیں کی بولی میں لکھتا ہے یعنی عموماً عامیانہ زبان استعمال کرتا ہے۔ میرا خیال ہے جو اس بولی سے آشنا نہیں، اس کو مطالب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے ٹھیٹ محاورے میں لکھتا ہے اور املا بھی ان کے تلفظ کے مطابق لکھتا ہے۔ ہر کردار کی شخصیت عین اس کی گفتگو کے مطابق ابھرتی نظر آتی ہے۔ مصنف کے مشاہدات غائر ہیں۔ وہ ان کی عادتوں، ان کے طور طریق اور ان کے رہن سہن کے انداز کا ماہر ہے۔ جزئیات پر اس کی نظر رہتی ہے۔ وہ جب بھی کسی کردار کی شخصیت بیان کرتا ہے۔ اس کا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے وہ کردار کو خود بولنے کا اور سوچنے کا موقع دیتا ہے۔ "نفتی" میں ایک نوجوان عورت امام زادہ کی ضریح کے ساتھ دھاگہ باندھ کر منت مانتی ہے اور دعا مانگتی ہے کہ اسے شوہر مل جائے کوئی آدمی اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ بس میں سوار ہونے لگتی ہے تو ڈرائیور کے پٹرول سے آلودہ موٹے کھردرے ہاتھ اس کو بغل سے پکڑ کر بس میں بٹھاتے ہیں تو اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور وہ لذت محسوس کرتی ہے۔ اس کے دل کی تپش قائم ہے۔ آخر وہ مجبور ہو کر اس گئے گزرے شخص مٹی کا تیل بیچنے والے کی طرف کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو روز اس کی گلی میں آتا ہے لیکن جب کسی بہانے وہ اس سے پوچھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اپنی اس ظاہر اقتصادی بدحالی کے باوجود خیر سے دو تین عورتیں رکھتا ہے لیکن کسی میں سے اس کو بچہ نہیں ہوا۔ وہ اس کو لقمہ دیتی ہے کہ چوتھی بھی تو حلال ہے۔ ممکن ہے اس سے اولاد ہو جائے

لیکن وہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے اماں ابا کے لئے کیا کیا ہے کہ ہماری اولاد ہمارے لئے کرے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے۔ عورت دور سے اس کی آواز سنتی ہے۔ "مردی قفس" میں ایک شخصیت کا مطالعہ ہے۔ سید حسن ہندوستان میں پیدا ہوا۔ وہیں جوان ہوا۔ اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ بیاہ ہوا تو چند دن کے بعد نوجوان بیوی مرگئی۔ وہ اپنی بے کیف زندگی کے ساتھ تنہا رہ گیا اس نے ایک کتیا پال رکھی تھی۔ اس سے دل بہلاتا تھا۔ خود تریاک پیتا تھا اور اس کو بھی دھواں دیتا تھا۔ اس کی نامراد زندگی میں وہی اس کی رفیق تھی۔ ایک طوفانی رات مکان کے پھاٹک پر کتے بھونک رہے تھے۔ اندر سے اس کی کتیا بے چین ہو رہی تھی۔ سید حسن اس کے جذبات کو سمجھ گیا۔ آخر لکڑیوں کے سہارے اٹھ کر اس نے دروازہ کھولا اور کتے کو اندر داخل کیا۔ اس کی نامرادی کی انتہا ہو گئی کہ اس کی زندگی کا یہ ساتھی بھی اس کے ہاتھوں گیا جس کی جدائی کو وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ "زیر چراغ قرمز" میں دو نوجوان عورتوں کی درد ناک زندگی کے گوشے بے نقاب کئے ہیں۔ وہ ایک دلالہ کے ہاں پڑی اپنا گوشت بیچنے پر مجبور ہیں۔ ٹھٹھری ہوئی رات میں لحاف نیچے دبکی ہیں۔ انگیٹھی بجھا چاہتی ہے لیکن مہمان پر مہمان آئے جاتے ہیں۔ وقفوں میں وہ اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات سناتی ہیں۔ "پیراہن زرشک" میں اسی قبیل کی بوڑھی عورتیں ہیں جو مردہ شوئی کی خدمت پر مامور ہیں۔ وہ بھی شوہروں سے اکتائی ہوئی اور معاش کی خاطر یا جنسی تسکین کی خاطر زبردستوں کے پنجوں میں آئی ہیں لیکن اب بھی حرص و آز کو دل میں چھپائے ہوئے ہیں۔ مردوں کو نہلاتی بھی ہیں اور باتیں بھی کرتی جاتی ہیں۔ گفتگو کے دوران میں ہی ان کی شخصیتیں کھلتی آتی ہیں۔ "میسوالیاس" میں ایک یہودی کے بخل اور پستی کو عجیب انداز میں پیش کیا ہے اور اصل میں مرزا محمود کردار بھی نمایاں کیا ہے۔ وہ وزارت مالیہ میں خدمت کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا تھا لیکن انسانی ہمدردی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دکھیا شخص کو دیکھ کر جب تک اس کی مدد نہ کر لیتا مضطرب اور پریشان رہتا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں بیاہنے کے لائق گھر میں پڑی تھیں۔ اس فیاضانہ عادت کی وجہ سے اس کا گزارہ بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ وہ ایک بڑی عمارت کے دو کمروں میں رہتا تھا۔ جس میں مختلف قسم کے کرایہ دار رہتے تھے۔ اس عمارت میں صرف ایک کوٹھڑی خالی تھی۔ جس میں سے گندی نالی گزرتی تھی اور اس میں فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ انسانی بودو باش کے لئے ہرگز قابل نہ تھی۔ ایک صبح مرزا محمود نے پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عورت کو دیکھا۔ دو بچے اس کے ساتھ تھے۔ ایک گود میں ننھا۔ اس کا آدمی بھی مزدوروں جیسی ہیئت کذائی رکھتا تھا۔ اس کنبے کو دیکھتے ہی اس کا دل

بے چین ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کوٹھڑی میں رہنے کو آئے ہیں۔ اپنی بیوی بچوں میں بیٹھا اداس ان کی حالت زار پر افسوس کر رہا تھا اور ان کی مدد کی صورت سوچ رہا تھا کہ اچانک اس عمارت کی پہلی **منتظمہ** نے آکر بتایا کہ اب اس مکان کے نئے مالک آگئے ہیں اور آئندہ سے کرایہ ان کو ادا کرنا ہو گا اور مالک بھی وہی شخص ہیں جو اس گندی کوٹھری میں آکر ٹھہرے ہیں۔ یہ سن کر مرزا محمود کی جو حالت ہوئی ہو گی اس کا اندازہ آپ کر لیجئے۔

ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صادق چوبک کے کردار کس قماش کے لوگ ہیں اور وہ کیسے زندگیاں گزار رہے ہیں۔ مصنف ان کی مفلوک الحال اور گناہ آلود زندگی کو خود بیان نہیں کرتا اور نہ ان کی اصلاح کے لئے مدد کرنے کو کہتا ہے۔ کہیں کہیں ان کی زبان سے ہی موقع بموقع ایسے کلمات نکلواتا ہے ہے جس سے ان کو دکھیا زندگی نمایاں ہوتی ہے اور ان کی دبی ہوئی تمنائیں باہر نکل آتی ہیں۔ مصنف اگرچہ ان بیچاروں کے راز افشا کرتا ہے مگر ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ "گلہای گوشتی" میں مراد کتنے درد بھرے انداز میں کہتا ہے۔ "مادر جندہ! اگہ مام تو ایں ملک شانس **داشیتم** کہ روزگار مومن ازیں بہتر بودش" پیراہن زرشکی میں دو مردہ نہلانے والیوں میں سے ایک دوسری سے کہتی ہے کہ "تو رو خدا معطل نشوزودی گربہ شورش **کنیم** بد ۔نعش بیرون ہمیں حالاس کہ مرتیکہ دس ازپا دراز تر میاوش خونہ' **بیچم** نداریم بخوریم' دنیا رور و سرم خراب میکنہ" یعنی دیر نہ لگاؤ جلدی جلدی اس موئے کو پار کریں میرا آدمی گھر میں آرہا ہو گا اور ہمارے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے اگر میں نہیں لے جاؤں گی تو میری مٹی پلید کرے گا۔ یہ سن کر تو پڑھنے والے کا دل ڈوب جاتا ہے جب ان دو میں سے ایک یہ کہتی ہے کہ مردہ عورت سے جو سرخ رنگ قمیص ملا ہے۔ اس کو میں اپنی شمسی کو پہناؤں گی۔ "حتماً" باید شمسی آنرا بپوشد و جلب مشتری کند' برای اینکہ مشتری باو بخوابد و در عوض بادپول بدہ تاخودش و چند طفل دیگر با آن پول گہ بسازندو زندگی خودرا اوامہ دھندہ" اسی طرح "بعد از ظہر آخر پائیز" میں ایک بیوہ اپنے بچے کو ماسٹر صاحب کے سپرد کرکے کہتی ہے۔ یہ میرا بچہ ہے اس کا بابا نہیں۔ بازار میں جھاڑو دے رہا تھا کہ موٹر کے نیچے آکر اس نے اپنی عمر تمہیں دے دی۔ یہ بچہ ہے اسے میں تمہارے سر صدقے کرتی ہوں اتنا کرو کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ جائے۔ ثواب کا کام ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں جو میں دے سکوں اگر کہو تو آپ کی ہر قسم کی خدمت کرنے کیلئے حاضر ہوں۔ میں تمہاری کنیز ہوں یہ جملے ایسے محاکاتی انداز میں اس عورت نے کہے ہیں کہ پڑھ کر دل ہل جاتا ہے۔ صادق کا دل انسان دوست ہے جو زمانے کے روندے ہوؤں پر آنسو بہاتا ہے۔

صادق جب اپنے کرداروں کو بولنے کا موقع دیتا ہے تو ان کی زبان کو نہیں روکتا وہ لوگ اپنی شخصیت کو چھپا کر نہیں رکھتے جس طرح اپنے دوستوں اور ہم نفسوں کے سامنے گفتگو کرتے ہیں اور لگی لپٹی نہیں رکھتے اور شرم و حیا بھی نہیں کرتے۔ صادق بھی حقیقت اور واقعیت کی خاطر ہو بہو ان کی باتیں لکھ جاتا ہے۔ فحش اور عریاں ہونے کی بھی پروا نہیں کرتا "زیر چراغ قرمز" میں آفاق دوسری رفیق سے کہہ رہی ہے میں ایک مالدار کے گھر میں خادمہ تھی۔ اس کی بیگم کسی نوجوان سے معاشقہ کرتی تھی۔ جب مالک گھر میں نہ ہوتے تو وہ اکیلے کمرے میں چلے جاتے۔ جب خانم باہر چلی جاتی تو مالک کسی دوسری خانم کو گھر لے آتا۔ یہ کام میں نے وہیں دیکھا۔ " گلھائی گوشی" میں مرد اپنی حالت زار پر غور کرتا ہوا جا رہا تھا کہ اس کا سر درخت سے ٹکرایا۔ اس نے کہا "خواہر تو گائیدم"۔ "پیراہن زرشکی" میں وہ لکھتا ہے شمسی سرخ قمیص پہنے درخت کے نیچے کھڑی دو سیاہ امریکن سپاہیوں سے سودا چکانے کیلئے بھاؤ پر تکرار کر رہی تھی۔ وہ یہاں تک بھی عریاں لکھ گیا۔ چشمانش دردناک ہم میز دو خمار جلوش نگاہ میکرد دستش را برد لای پایش و را چسبید (انتری) اور پھر اس حقیقت کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ "چرا دریا طوفانی شدہ بود" میں کہزاد اپنی محبوبہ کے پاس آیا کرتا تھا "مثل عروسک بلندش میکرد میگزاشتش روخودش و دراز میخوا بانیدش روی خودش"۔

اس کہانی میں عورت نے دوپہر کو بچہ جنا ہے لیکن کہزاد شام کے وقت پہنچ کر اس کے ساتھ لیٹ کر کہتا ہے۔ "میخوام" وہ کہتی ہے "مگر دیوونہ شدی مثہ دریا ازم خون میرہ"۔

صادق نے بعض موقعوں پر اپنے فن کردار شناسی میں مہارت کی وجہ سے ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ اس کے چند جملے پڑھ کر شخص مذکور کی زندگی پڑھی جاسکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کردار کے اندر جھانک کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کیلئے دو مثالیں دیکھئے۔ سید حسن اپنی رفیقہ زندگی کتیا "راسو" سے مخاطب ہوتا ہے جو باہر کتے کی آواز سن کر تڑپ رہی ہے۔ "راسو آہستہ و سرزنش آمیز صدا کرد راسوی من! دخترک خوشگل من! تو چقدر بی وفا ہستی۔ مگہ تو آدمی! تو کہ آدم نبودی واز کی تا حالا آدم شدی؟"

مصنف ایک 27 سالہ مردہ عورت کی کیفیات بیان کر رہا ہے۔ " شکمش باد کردہ بود طرف راست نافش شگاف کشیدۂ زخم کہنہ بخیہ شدہ ای دیدہ میشد۔ قیافہ اش آرام و حق بجانب بود تو چہرہ اش یک لجبازی پر کینہ ای یخ بستہ بود گوئی در برابر یک اصرار و امنہ دار۔ وحشیانہ ہنوز تسلیم شدہ بود۔ این حقیقی بود برہنہ کہ آخرین پردہ غمناک یک کمدی گول زندہ و پر شکنجہ رویش بجا ماندہ

بود" ان جملوں کو پڑھ کر آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ یہ عورت کس قسم کی زندگی بسر کر چکی ہوگی۔

صادق کو جس طرح انسانی کردار سمجھنے کا ملکہ حاصل ہے۔ اسی طرح وہ حیوانوں کی عادات و حرکات پر بھی نظر رکھتا ہے۔ "مروی ور قفس" میں کتوں کا مطالعہ "قفس" میں مرغی مرغوں اور "انتری کہ لوطیش مردہ بود" میں بندر کی پوری شخصیت کا مطالعہ اس کی حیوان شناسی پر دلالت کرتا ہے۔ "مروی در قفس" میں تو جزوی مطالعہ ہے اور انسانی کردار کے تقابل میں اس کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر موخرالذکر دو افسانوں میں صرف جانوروں کی شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قفس میں مرغوں کے ایک ڈربے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مختلف قسم کے مرغی مرغے تنگ و تاریک گندگی سے بھری جگہ میں رہتے ہیں۔ دبکے ہوئے سہمے ہوئے۔ قصاب کا ہاتھ داخل ہوتا ہے تو ایک نہ ایک کو نکال کر لے جاتا ہے اور اس کی گردن پر چھری چلاتا ہے۔ مصنف نے مرغی مارکیٹ کے اس پنجرے کو اس قدر جزوی تفاصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو اس کی باریک بینی اور غایر مشاہدات کا شاہد ہے لیکن مصنف کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ محض مرغی مرغوں کی اس مقید زندگی سے ہمیں آشنا کرے۔ اس نے حتمی طور پر اس قفس کو Symbol کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مرغی مرغوں سے مراد وہ بے بس مفلوک الحال غریب اور قانونی شکنجہ میں کسے ہوئے غریب لوگ ہیں جو تنگ و تاریک اور غلیظ گھروں میں رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں اور موت کا بے رحم ہاتھ آتا ہے اور ان کی زندگی ختم کئے جاتا ہے۔ اس علاماتی پس منظر کے سامنے مصنف کا کمال فن نمایاں ہوتا ہے۔ وہ جبر و استبداد کے زمانے میں کھلم کھلا انسانوں کی مفلوک الحالی بیان نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ علامات و تمثیل کی آڑ میں ان حقائق کو آشکار کرتا ہے۔ اسی قسم کے معانی " انتری کہ لوطیش مردہ بود" کے ہیرو بندر کے متعلق بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اس کا آقا دور دراز کے سفر کے بعد ایک جنگل میں آکر بیٹھتا ہے جہاں درخت کاٹ کر کوئلہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ تریاک پیتا ہے اور چرس کھاتا ہے اور درخت سے تکیہ لگا کر وہیں جان دے دیتا ہے۔ بندر اس کو مردہ پا کر زنجیر سمیت کھونٹے اکھاڑ کر آزاد چلتا پھرتا ہے۔ چرواہے کا لڑکا اس کے قریب جاتا ہے۔ اس کو روٹی دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے سر پر ڈنڈا جماتا ہے۔ بندر اچک کر اس کا چہرہ نوچ ڈالتا ہے اور لہولہان کر کے چھوڑ دیتا ہے اور پتھروں کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اوپر سے عقاب اس پر لپکتے ہیں۔ آخر وہ مردہ آقا کے پاس جانے ہی میں اپنی سلامتی پاتا ہے۔ اتنے میں جنگل کی طرف سے دو مرد کلہاڑے کندھے پر رکھے ہوئے اس کی طرف بڑھے آرہے ہیں۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہوتا ہے۔ جوں جوں تبردار نزدیک آتے جاتے ہیں۔ اسے اپنی موت کا یقین ہوتا جاتا ہے۔

اس افسانے میں بندر کی تربیت، اس کی زندگی اور اس کے کھیلوں کا تفصیلی بیان ہے اور ساتھ ہی اس کے مالک تماشا کرنے والے کی زندگی کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی بھی علاماتی پس منظر میں پڑھی جاسکتی ہے۔ ایک آزاد شخص جب محکوم بنالیا جاتا ہے تو وہ اپنے آقا کے اشاروں پر چلتا ہے لیکن آزادی کی آرزو رکھتا ہے۔ جب آزاد ہوتا ہے تو زبردست لوگ اس کی آزاد حرکات پر پابندیاں لگاتے ہیں اور اس کی جان لینے کے درپے ہوتے ہیں لیکن آخر طاقت کے سامنے وہ مجبور ہوجاتا ہے۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

صادق نے طنز نگاری میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ "سایہ ادب" بادشاہ وقت پر بڑی کاری ہجو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے محلوں اور باغوں سے دوربین کے ذریعے دیکھا کہ کوے اس کے مجسمہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ اس کے تاج پر ٹھونگیں مارتے ہیں اور ایک گستاخ کوے نے تو اپنا پاخانہ اوپر پھینک دیا جو بہتا ہوا جناب کے منہ تک پہنچا۔ شاہی حکم ہوا کہ سب کوؤں کو مار دیا جائے، گرفتار کرلیا جائے اور کوئی شخص ان کو پناہ نہ دے۔ جب کوؤں کو اس حکم کی خبر ہوئی تو وہ روئے پیٹے اور انہوں نے سیاہ لباس پہن لیا اور ملک چھوڑ گئے۔ کہتے ہیں کوؤں کا رنگ پہلے سبز تھا اور آواز بھی اچھی تھی۔ گویا فریاد کرنے سے ان کی آواز کریہہ ہوگئی۔ اگر آپ اس افسانے کو اس پس منظر کو سامنے رکھ کر پڑھیں کہ شاہ وقت رضا شاہ کبیر ہے اور اس کے جبر و تشدد کے سامنے کسی کو گفتگو کی مجال نہیں تھی۔ تقریر و تحریر میں نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کا یارا نہیں تھا جو بولتا جلا وطن کردیا جاتا یا جیل میں بند کروا دیا جاتا تھا تو پھر اس افسانے کا ہر جملہ ایک پر لطف طنز معلوم ہوتا ہے۔ ایک بیمار، جابر اور مغلوب الغضب بادشاہ کی شخصیت نمایاں کرنے کیلئے یہ ایک کامیاب طنز ہے۔

تنگ سیر

وحدت موضوع اور وحدت تاثر کے لحاظ سے تو یہ ایک طویل مختصر افسانہ ہے لیکن پھیلاؤ کے اعتبار سے اسے ناول کی حدود میں لایا جاسکتا ہے۔ ناشر نے اسے Persian Novel کہہ کر

شائع کیا ہے۔ تنگ سیر تنگستان کے رہنے والا ہے۔ محمد تنگ سیر ایران کے جنوب میں بندر بوشہر کے ایک گاؤں دواس کا رہنے والا ہے۔ سادہ صحرا نشین لمبا تڑنگا، زور آور، غیرت مند، بہادر اور ہمدرد۔ اس نے انگریزی جہاز میں سکان بند کی حیثیت سے ملازمت کی۔ پھر آہن گری کی اور دوسری خدمات سے دو ہزار تومان جمع کئے۔ بوشہر کے چار اشخاص نے جعل و دغا سے اس کی رقم غصب کرلی۔ ایک دلال بنا۔ دوسرے نے دستاویز لکھی۔ تیسرے نے ایسا سامان گرو رکھا جو پہلے سے کسی دوسرے کے پاس رہن تھا۔ چوتھا گواہ بنا۔ محمد تنگ سیر پر جب یہ راز کھلا تو اس ظلم کے خلاف اس کے دل میں جذبہ انتقام جنم پانے لگا۔ اس نے تقاضے کئے۔ منتیں کیں۔ واسطے دیئے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ قانون اس کی مدد کو نہیں آتا تھا۔ محمد علی شاہ قاچار کا عہد تھا۔ فوج و سپاہ کی حکومت تھی۔ بس ایک دن محمد نے عزم کرلیا کہ ان عیاروں اور غاصبوں کا کام تمام کردے تاکہ ظالموں کو عبرت ہو اور پھر کوئی شخص کسی غریب کو دھوکہ دینے اور مال لوٹنے کی جرات نہ کرے چنانچہ ایک دن اس نے ان چاروں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ پھر چھپ چھپا کر سمندر رستے تیر کر پہنچا اور حکومت کے بندو قچیوں کو زیر کرتا ہوا اپنے گاؤں پہنچا۔ قرارداد کے مطابق اپنی بیوی شہرو اور دو بچوں کو ساتھ لیا۔ نخلستان سے گزر کر موجود کشتی میں بیٹھا اور ایران کی سرحدوں سے پار چلا گیا۔

کہانی کو پڑھتے جائیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہالی وڈ کی Cow Boy قسم کی ویسٹرن دیکھ رہے ہیں۔ ہیرو دشمنوں کو قتل کرتا ہے۔ حکومت کے سپاہیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ سمندر میں تیرتا ہے۔ ٹارزن کی طرح منہ میں چھری لیکر ارا مچھلی کو پھاڑتا ہے جو اس پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ایک دفعہ باغی بیل کو پکڑ کر رام کرتا ہے۔ ایک مرتبہ چھ سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ایسے مناظر ہیں جو ہم اکثر اس قسم کی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ مصنف اس فلم کا ڈائریکٹر بھی ہے اور سینیریو نگار بھی۔ وہ بوشرم اور نواحی دیہات کے چپے چپے سے اور کوچے کوچے سے واقف ہے۔ دکان دکان کے مالکوں کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ گاؤں دراس کے باسیوں، اس کے سربر آوردہ اشخاص سے واقف ہے۔ وہ ان کے اخلاق و عادات، رسم و رواج، رہن سہن سے آشنا ہے۔ چھوٹے بڑے کی روح میں جھانک کر دیکھتا ہے۔ شکل و صورت، لباس وضع قطع ماہر مصور و نقاش کی طرح تیار کرتا ہے۔ اس کے کردار چلتے پھرتے بولتے ہیں۔ ان میں انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔ تمام کہانی کا محیط آنکھوں کے سامنے متمثل ہوکر نظر آتا ہے۔

کہانی کی کڑیاں ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور تسلسل میں جھول نہیں۔ زاید عناصر بہت کم ہیں۔ کہیں کہیں کہانی سے ہٹ کر جن حوادث کا اضافہ کیا ہے وہ اس کے حرکی عنصر کو قائم

رکھنے اور تعطل کو بڑھانے کیلئے کیا ہے۔ مثلاً محمد آسانور ارمنی کی دکان میں چھپا ہوتا ہے تو یکایک اس کا نوکر اسماعیل سیڑھیوں کے اوپر جاتا ہے۔ سمندر میں تیرتا ہے تو ارہ ماہی اس پر حملہ آور ہوتی ہے یا سپاہی محمد کے بچوں سے گفتگو کرتا ہے تو وہ دلیرانہ جواب دیتا ہے یا محمد قتل کرنے کے بعد شہر میں جاتا ہے۔ یہاں پہنچتا ہے۔ حجامت بنواتا ہے پھر قنادی کی دکان پر روٹی کھاتا ہے۔ ان سب اضافات میں کوئی چیز غیر طبعی نہیں بلکہ مجموعی تاثر پیدا کرنے میں اور دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون ہے۔

کہانی کی زبان سادہ موجز اور موثر ہے۔ گفتگو کردار کی مقامی بولی کے مطابق ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال بھی ان کے اپنے ہیں اور ان کی ذہنی کیفیات کے آئینہ دار اور مصنف کے کمال قدرت و مہارت فنی پر دال ہنری جیمز، **فالکنر**، اور ہیمنگوے صادق چوبک امریکن افسانہ نگار HEMINGWAY سے متاثر ہے۔ وہ صادق ہدایت کا مداح ہے۔ صادق چوبک کے بارے میں مختلف ادیبوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔

مثلاً: (i) صادق چوبک **نویسندہ** ای تحریر دہ است۔ (جلال آل احمد)

(ii) جہانی راکہ جوبک ترسیم می کندکہ جہانی وحشت ناک و ترس آوری باشد (عبدالعلی دست غیب)

(iii) چوبک در آغاز تحریر و تاثیر ہدایت و بدوں جوہر ذاتی ہدایت بہ مضامین پست اجتماعی می پرداز دا ماچوں فاقہ زبنوع ہدایت است داستانہائش رنگ کا نور **ایسم** بہ خود می گیرد۔ (محمود دولت آبادی)

تبصرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ صادق چوبک صادق ہدایت کا متعلقہ تھا۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ چوبک بھی ہدایت کی طرح معاشرے کی بتائے ہوئے دکھیاروں کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ لیکن صادق چوبک صادق کی ہدایت کے فکر و نظر سے مختلف تھا۔ صادق ہدایت نے اپنے اوپر یاسیت اور زندگی سے بیزاری طاری کر رکھی تھی چنانچہ اس نے خودکشی کرلی۔ اس کے برعکس صادق چوبک زندگی پسند تھے۔ وہ آزادی کے دلدادہ تھے۔ وہ اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ شستہ و شائستہ خوش سلیقہ و خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے کہ میں مر بھی جاؤں تو مجھے مردہ نہ کہو اور نہ آنسو بہاؤ اور نہ سوگواری کی رسم ادا کرو۔ عامیانہ زبان استعمال کرنے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ جمالزادہ اور صادق ہدایت سے متاثر ہوں۔

نوری

اصل نام نور اللہ خرازی ہے۔ 1300 ہجری شمسی کو کاشان میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام اسحاق خرازی ہے۔ خراز سوت دھاگہ اور منیاری قسم کا سامان بیچنے والے کو کہتے ہیں تہران میں جو ان کے بھائیوں کی دکان ہے وہ یہی کاروبار کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشہ کی نسبت سے انہوں نے اپنا خاندانی نام یہی رکھ لیا ہے۔ نوری نے اپنی ابتدائی تعلیم تو کاشان میں ہی تمام کی۔ متوسط کی تکمیل تہران میں کی۔ اس کے بعد دانش کدہ حقوق یعنی لاء کالج میں داخل ہوئے لیکن ایک سال کے بعد چھوڑ کر 1325 میں امریکہ چلے گئے 1332- 33 میں تہران واپس آئے تھے۔ 1335 میں وہ کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے گئے۔

1318ء سے 1335 تک وہ روزنامہ "توفیق" کے ادارہ میں بھی کام کرتے رہے ہیں اور اس میں مقالات اور کہانیاں لکھتے رہے۔ یہیں سے گویا ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوچکا تھا۔

چند سالوں سے ان کا نام ادبی حلقوں میں لیا جانے لگا ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کی نئی اپج اور نئے موضوع کی وجہ سے مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور شہرت بھی۔ (1329) 1950ء میں ان کی پہلی کہانی "پرسیلا" الگ کتابی صورت میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد 1313 میں "قوس قزح" کے نام سے کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں مندرجہ ذیل سات افسانے شامل ہیں۔ لورا، شارلوت، آیرین، آسیہ، وحشت تنہائی، میامی، ذر آشوب۔ 1333 میں "خون بہا" شائع ہوئی جس میں چار کہانیاں شامل ہیں۔ خون بہا، فرصت ہائی، ازدست رفتہ، فضل اللہ، ژاکلین اور آخری مجموعہ "خاطرات خدا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو مندرجہ ذیل دس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ جادوی لوور، چکش، مست، خاطرخواہان، دل گندہ، وردنیکا، آمیرزا مہدی خاں، بوسہ **نطلبیدہ**، جائزہ صد ہزار ریالی، خاطرات خدا۔

ان کی کہانیوں کی فضا امریکائی یا اروپائی ہے اور ان کے کردار بھی کم و بیش وہیں کے اشخاص ہیں لیکن قصہ گو اور آپ بیتی بیان کرنے والا ایرانی ہے۔ صرف آسیہ، آمیرزا مہدی علی خاں، ذر آشوب اور دل گندہ میں اشخاص قصہ ایرانی ہیں۔ اور زمین قصہ بھی ایرانی ہے چونکہ مصنف نے یورپ کی سیاحت بھی کی ہے ہوپ خاص طور پر روم، پیرس اور **سوئٹزر لینڈ** کو دیکھا ہے۔ اس لئے چار پانچ کہانیوں کی سرزمین بھی انہیں شہروں کی ہے جادوی لوور اور ژاکلین، پیرس، وردنیکا

اور مست روم اور بوسہ نطلبید سولیس کے واقعات سے متعلق ہیں۔

نوری جب امریکہ گئے تو اپنے اندر مشرقی روح رکھتے تھے۔ حافظ سے وہ کامل طور پر متاثر نظر آتے تھے۔ جابجا فلسفہ تصوف بیان کرتے وقت اس کے اشعار سے الہام لیتے ہیں۔ مغربی فلسفیوں کے نقطہ نظر کے مطالعہ کے بعد انہوں نے اسی مشرقی فلسفہ فکر کو بھی آشنا کرانا چاہا۔ "فضل اللہ" میں وہ طالب علم کی حیثیت سے فلسفیوں کے افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی اس غم انگیز اور سکون بخش روح، کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ڈیوڈ ہوم کی شکاکی بھی اسے مرغوب نہیں۔ و یٹھن اور ایمرسن کا جدلیاتی فلسفہ بھی اسے تسکین نہیں بخشتا اس لئے وہ تنہائی پسند ہے۔ اداس و غمگین رہتا ہے۔ اپنی پرانی چیزیں اس کو پسند ہیں جن سے وہ کسی کی یاد میں کھو جائے اور کچھ عرصہ کیلئے ہنگامہ زار دنیا سے اور خیالات کی اس کشمکش سے الگ رہ سکے۔ اس کو ایک ایسی ہمہ گیر قدرت کا احساس ہے جو ہر جگہ موجود ہے جو ہر چیز میں دخیل ہے اور وہ اس کو محسوس کرنے کیلئے بے قرار ہے۔ تنہائیوں میں ہلکی موسیقی اس کے اس احساس کو ابھارتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ موسیقی دل میں اثر کرتی ہے کیونکہ وہ "نالہ و شکوہ ایست از دوری ازا مبداء و دل رابیاد' خانہ زندگی' اصل میاندارد" اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس "غائب" لیکن سب جگہ "موجود" کے ساتھ عشق غم انگیز خیالی و آسمانی ہے۔ اس خاکی زندگی میں اگرچہ اس کے ساتھ وصال میسر نہیں ہوتا لیکن "رنج فراق" بھی لذت وصال سے کم نہیں۔

"پرسیلا" میں بھی وہ اس مشرقی روح کو آشنا کرنا چاہتا ہے۔ "پرسیلا" ایک امریکن لڑکی ہے جو مادی دنیا کی خوش حالیوں میں پلی ہے۔ اس کی روح رنج و الم سے بے نیاز ہے وہ جب اس سے پوچھتی ہے کہ تم مشرقی خواہ مخواہ اپنے آپ کو رنج و محرومیت کا شکار کرکے یوں اپنے آپ کو کرب و بلا میں گرفتار رکھتے ہو تو وہ اس کو بتاتا ہے کہ رنج و ناکامی اور محرومیت ہماری روح کے ساتھ پیوست ہے۔ ماں کے دودھ کے ساتھ ہی یہ روح ہمارے اندر سرائیت کرجاتی ہے۔ وہ "پرسیلا" کو بتاتا ہے کہ تخیل و اضطراب اور زندگی سے گریز اس کی روح ہے جس سے وہ زندہ ہے چونکہ ہم جسمانی اور دنیاوی لذائذ سے محروم ہیں۔ اس لئے وہ اپنے لئے ایک لذت بخش اور نشہ آور عالم روحانی بنالیتے ہیں وہ آہستہ آہستہ عالم مادی کی ناپائیداری اور بے وفائی کا تصور دلا کر اس کے دل کو اصلی حق، حسن اور حقیقت کی طرف مبذول کرتا ہے جس کو ہمارے بیرونی حواس نہیں پاسکتے جب روح ان حقائق سے آشنا ہوتی ہے تو وہ ایک سرمستی اور لذت محسوس کرتی ہے۔ تمام جسمانی لذتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ پرسیلا آہستہ آہستہ اس کے اس خیالی اور غیر

مرئی اور اس کے اپنے خیال میں ملکوتی تصورات میں کھونا شروع ہوجاتی ہے اور آخرکار وہ اس کو بھی اپنے جیسا روحانی کیف بخشتا ہے۔ گفتگو کرتے کرتے وہ حال اور وجد کی کیفیتوں میں کھو جاتی ہے۔ اس پر نیم بیہوشی کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ آخر ایک دن وہ اسی عالم حیرت و کشف الہام میں جان دے دیتی ہے۔ یہ گویا مشرقی روح کی مغربی مادہ پرستی پر جیت ہوتی ہے۔

نوری کی دوسری کہانیوں کا موضوع انسانی نفسیات ہے۔ نفسیات میں بھی خاص طور پر ترغیبات جنسی۔ یقینی طور پر وہ اپنے خیالات میں مغربی مفکرین سے متاثر ہیں خاص طور پر ولیم جیمز اور فرائیڈ کے افکار کو انہوں نے خوب اپنایا ہے اور عورتوں اور مردوں کی شخصیات میں عملی طور پر ان بنیادی جذبات و ہیجانات کا تجربہ کیا ہے۔ ان کی اکثر کہانیوں میں اشخاص قصہ کی زندگی میں جنسی بھوک کار فرما ہے۔ اگر ایک راہ سے اس کی تسکین نہیں ہوتی تو وہ مختلف راہوں سے انسانی اعمال میں نمایاں ہوتی ہے۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک یہ استقساء روح قائم رہتی ہے۔ جنس مخالف کے ساتھ جنسی لگاؤ ایک فطری امر ہے۔ مصنف نے اس نظریہ کو واضح کرنے کیلئے اپنی کہانی "خاطر خواہی" میں بیان کیا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر کا لڑکا ایک تیس چالیس سالہ عورت سے محبت کرتا ہے۔ چاہتا ہے کہ لحاف کے نیچے بیٹھ کر اپنی رانوں کو اس کے اعضاء کے ساتھ لگائے جس سے اس کو ایک طرح کی لذت محسوس ہو۔ اسی طرح اس عمر کی ایک لڑکی تیس چالیس سالہ ایک خوب شکل اور توانا شخص سے خاص محبت کا اظہار کرتی ہے کہ وہ اس سے شادی کرکے اس کیلئے ہر سال ایک بچہ پیدا کرنا چاہتی ہے یہی جنسی بھوک سترہ' اٹھارہ سالہ نوجوان میں تیز ہوجاتی ہے اور اپنی تسکین کیلئے راہیں نکالتی ہے۔ مصنف نے "آسیہ" میں اسی جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ ایک لڑکا رات کو بستر سے اٹھ کر ماں باپ کی نظروں سے بچ بچا کر خادمہ آسیہ کے کمرے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر جنسی تسکین کا سامان نہیں ہوتا یعنی اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی یا عورت میں خود اس قدر جاذبیت نہیں کہ دوسرے فریق کو اپنی طرف سے مائل کرسکے یا ایک فریق خود اس قدر پست حالت میں ہے کہ اپنے اعلیٰ محبوب تک اس کی رسائی نہیں ہوسکتی تو پھر یہ جذبہ کبھی خطرناک اور کبھی مضحکہ خیز صورتیں اختیار کرلیتا ہے۔ "آیرین" ایک نامقبول صورت کی عورت تھی۔ نیویارک میں سال نو کے روز ہر شخص عیش منانے کیلئے اپنے ساتھی کو ڈھونڈتا ہے۔ پرہجوم بازاروں میں مرد عورتوں سے مذاق کرتے ہیں۔ ان کے کانوں میں بگل بجاتے ہیں اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ آیرین کے پاس کوئی نہیں آتا۔ وہ چوک میں جاتی ہے اس کے کان میں کوئی بگل بھی نہیں بجاتا۔ وہ مایوس ہوکر ایک ریستوران میں شراب

پیتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ موٹروں کے ہارن بجتے ہیں جن کی آواز سن کر اس کو تسکین سی ہوتی ہے اور مستی میں اپنی راہ چلتی جاتی ہے۔ آخر موٹر سے ٹکرا کر نیچے آجاتی ہے اور جان دے دیتی ہے۔ دوسری صورت میں ایک تیس چالیس سال کا غریب سا آدمی ہے۔ وہ تہران میں سفارتخانہ امریکہ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر مست ہوجاتا ہے۔ اپنے ایک دوست کے وسیلہ سے عورت کا خادم بن جاتا ہے۔ اس کا اور کوئی بس نہیں چلتا۔ جب وہ رات کو اپنے کمرے میں سونے جاتی ہے تو یہ اپنے کمرے سے دروازوں کے شیشے پر اس کے ابھرے ہوئے سینوں کا عکس دیکھتا ہے اور حسرت سے سو جاتا ہے۔ جب وہ صبح کام پر چلی جاتی ہے تو اس کے سونے کے کمرے میں جاکر اس کی انگیا اور زیر جامہ اٹھا کر سینہ سے لگاتا ہے اور لذت محسوس کرتا ہے۔ مصنف نے "ذر آشوب" میں اس شخص کی محرومیت کو ابھارا ہے۔

بعض ایسے اشخاص ہیں جو اس قدرتی جنسی ہیجان کو دبائے رکھتے ہیں اور سوسائٹی میں اپنے آپ کو پاکباز ظاہر کرنے کیلئے ضبط اور دباؤ سے کام لیتے ہیں لیکن ایک نہ ایک وقت زندگی میں انہیں اس ناتسکین یافتہ جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنے پہلے جبری عمل پر افسوس کرنا پڑتا ہے۔ "چکش" میں اسی خیال کی تعبیر ہے۔ ایک شخص فلاڈلفیا کے ہوٹل میں مقیم ہے۔ رات کو ایک نیم عریاں عورت اس کے کمرے میں آتی ہے اور کہتی ہے کہ "مجھے سردی لگتی ہے" یہ صاحب اپنا کمبل اٹھا کر دے دیتے ہیں۔ وہ دوسری مرتبہ آتی ہے تو دوسرا کمبل دے دیتے ہیں۔ تیسری مرتبہ آتی ہے تو کہتے ہیں ہوٹل والوں کو کہو کہ تمہارے لئے گرم قہوہ تیار کریں لیکن بعد میں جب وہ شخص اپنے گھر واپس آگیا اور تنہائی میں ان دنوں کی یاد آئی اور خیال پیدا ہوا کہ وہ عورت سردی کا بہانہ کرکے اس سے کیا چاہتی تھی تو اس کو اپنے نفس پر اس ظلم و جبر کا بہت افسوس ہوا اور اس نے اپنی پیشانی پر ہتھوڑا مار کر اپنے آپ کو زخمی کرلیا تاکہ اپنے آپ سے انتقام لے سکے۔

بعض حالتوں میں یہ جنسی بھوک آخر عمر تک رہتی ہے اور عورت اس کی تسکین کیلئے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے پر تیار ہوتی ہے۔ "وردنیکا" اسی قسم کی ساٹھ سالہ عورت ہے جو ہوٹلوں میں نئے سے نئے جوان کی تلاش میں رہتی ہے اور ایک رات ہم بستر ہونے کیلئے ساٹھ ہزار لیرہ ادا کرتی ہے۔

بعض ایسے اشخاص ہیں جو اپنے جنسی تقاضوں کو ابھرنے نہیں دیتے اور سوسائٹی میں اعلیٰ مرتبہ رکھنے کی وجہ سے اپنے چہرے پر سنجیدگی کا غلاف چڑھائے رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کی تہوں

میں وہ ہیجان مخفی رہتا ہے اور لوگوں کی نظروں سے اس جذبہ کی تسکین کرلینے میں وہ ظاہری طور پر نفرت کے باوجود باطنی طور پر اس کام کیلئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ ایسے شخص کی بہترین مثال مصنف نے اپنی کہانی "شارلوت" میں پیش کی ہے۔ شارلوت ایک تیس سالہ خوبصورت لائق پروفیسر ہے۔ بیرونی طور پر اس کے چہرے سے تمایلات جنسی کے آثار نظر نہیں آتے۔ وہ سنجیدگی سے آکر لیکچر دیتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ ایک شاگرد اس پر فریفتہ ہیں۔ الفاظ پر توجہ دینے کی بجائے اس کے چہرے اور آنکھوں پر نظریں گاڑے رہتے ہیں۔ جب کبھی وہ اس سے سوال پوچھتی ہے تو وہ جواب نہیں دے سکتے اور کلاس سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا۔ ایک مرتبہ وہ خوب سبق یاد کرکے آئے اور پروفیسر کے پوچھنے پر خوب وضاحت سے جوابات دیئے لیکن پروفیسر کی روش درست نہ ہوئی۔ امتحان میں اس کو صبر نمبر دیا۔ حالانکہ اس نے پرچے اچھے کئے تھے۔ ایک دن وہ پروفیسر صاحبہ کے گھر چلے گئے اور دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ پروفیسر صاحبہ نے پوچھا کیا چاہتے ہو۔ اس نے جرات کرکے اس کو آغوش میں لے لیا۔ معمولی سی مزاحمت مفاہمت کے بعد وہ راضی ہوگئی اور خاموشی سے بستر پر جا پڑی۔ تین چار مرتبہ شاگرد اسی طرح گھر جاتے اور بغیر گفت و شنید کے کام برآری کے بعد آجاتے لیکن کلاس میں پروفیسر صاحبہ کی وہی بے رخی اور سنجیدگی قائم رہتی اور وہ اس کو کئی مرتبہ پہلے کی طرح کلاس سے باہر نکال دیتی۔

نفس انسانی جس قدر پیچیدہ ہے اگر جنسی بھوک کی تسکین فطری طریق سے نہ ہو تو اپنی فریب کار عقل سے کیا کیا تجویز سوچتا ہے اور لذت حاصل کرنے کیلئے کن کن ذرائع سے کام لیتا ہے اور غیر عادی کام کرتا ہے جس کو دیکھ کر آدمی نفسیاتی پیچیدگیوں میں کھو جاتا ہے۔ مصنف نے انحراف جنسی کو واضح کرنے کیلئے "لورا" اور "خو بنہا" جیسی مضبوط کہانیاں لکھی ہیں۔ "لورا" ایک حسین ساحرہ ہے وہ آرٹسٹ ہے وہ ہر روز رنگا رنگ آدمی کو ڈھونڈتی اور اپنے حسن و زیبائش سے مسحور کرکے اس کو گھر لاتی ہے اس کے کپڑے اتروا کر اس کو ننگا کرتی ہے اور پھر خود ننگی ہوکر برش اور رنگ لیکر مرد کے جنسی ہیجانات اور کیفیات کا مطالعہ کرکے تصویر کھینچتی ہے اور لطف اٹھاتی ہے۔ اس نے ایک زبردست کتا پال رکھا ہے جو آدمی کو اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتا۔ تاکہ مرد آپے سے باہر ہوکر لڑکی پر حملہ نہ کردے۔ "خو نبہا" میں ایک عورت اپنے اندر عجیب رجحان کو پالے ہوئے ہے۔ اسے سرخ رنگ سے خاص نسبت ہے اس کے کمرے کی ہر چیز سے سرخ رنگ نمایاں ہے۔ وہ خون کی دلدادہ ہے اگر جسم سے خون پھوٹتا دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ وہ بے ہوش ہوئی جاتی ہے

اور اپنے اندر عجیب لذت محسوس کرتی ہے۔ اس نے ایک نوجوان کو پالیا ہے جس کو ہر بار دو سو ڈالر دیتی ہے جس وقت وہ چاقو سے اس کے بدن کے اعضاء سے خون نکالتی ہے تو فوارہ کی طرح خون نکلتے ہوئے دیکھ کر مدہوشی کی حالت میں پڑ جاتی ہے۔ نفسیات کے ماہروں کے نزدیک تسکین نایافتہ جذبہ جنس کی یہ غیر عادی شکل ہے۔

نوری کی اکثر کہانیوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوان مردوں اور عورتوں میں شہوانی جذبات کھلے بندوں کارفرما ہیں۔ ہر فرد آزادانہ تسکین شہوت کیلئے بیباکی سے قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرے کو آغوش میں لینے کیلئے لپکتا ہے۔ فرائڈ کی طرح نوری کا عقیدہ ہے کہ "ارضاء تمایلات جنسی مثل شعر گفتن است" ایک دو جگہ اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مرد بالکل اندھا ہے اور بھونرے کی طرح ایک پھول سے رس چوستا ہے تو دوسرے پر جا بیٹھتا ہے۔ "مست" میں شراب پی کر ایک شخص اتنا اندھا ہوتا ہے کہ ایک گونگی عورت کو آدھی رات کے وقت اپنے ہوٹل میں لے جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے کپڑے اتارتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مرد اس کی بے زبانی سے متاثر ہوتا ہے اور وہ اس کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد واپس آتا ہے تو وہ انتظار کے بعد جاچکی ہوتی ہے۔ "میامی" میں ایک مالدار جوان حسین عورت ایک نوجوان سے وابستہ ہوتی ہے۔ اپنا سب کچھ اس پر صرف کرتی ہے۔ زندگی کے عیش میں اس کو غرق کرتی ہے لیکن جب وہ کچھ وقت کیلئے کسی کام سے شہر سے باہر جاتی ہے تو وہ شخص کسی اور عورت سے عشق جمانا شروع کردیتا ہے۔ واپسی پر وہ دونوں کو اکٹھا دیکھتی ہے تو دونوں کو گولی کا نشانہ بنا کر خود بھی خودکشی کرلیتی ہے۔

جنسی موضوع کے علاوہ نوری نے دوسرے موضوعات کے متعلق بھی کہانیاں لکھی ہیں لیکن اکثر میں کردار یا شخصیت کا مطالعہ ہے۔ "آمیرزا مہدی" میں ایک چالیس سالہ کلرک کی بنجر اور ویران زندگی کا خاکہ ہے۔ وہ بیس سال سے ایک قصبہ میں پیدائش و وفات کی تفاصیل پر لکھنے پر مقرر ہے اور عجیب پھیکی روکھی زندگی گزار رہا ہے۔ "جائزہ صد ہزار ریالی" میں ایک بوڑھے شخص کی لاٹری نکل آتی ہے۔ وہ ایک لاکھ ریال کا انعام پاکر سوچ نہیں سکتا کہ وہ اتنی رقم کو کس طرح استعمال کرے۔ سوچتے سوچتے اس پر افکار کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کرلیتا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں میں خیالات کا نفیس تجزیہ ہے۔ انسانی نفسیات پر مصنف کی گہری نظر ہے۔ اس لئے وہ دل و دماغ کی کیفیات بیان کرنے میں مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ "ژاکلین" میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی میں انسان کی تخیلی آرزو کی عملی طور پر تعبیر ہونے

میں کس قدر حسرت و ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص اپنی خیالی محبوبہ کا تصور باندھتا ہے کہ وہ ایک پرانے محل میں بیٹھی پیانو بجا رہی ہوگی اور اس کی منتظر ہوگی۔ جستجو کے بعد اسے ایک ایسا ہی منظر نظر آتا ہے۔ وہ اندر جاکر دیکھتا ہے کہ ایک پچاس سالہ عورت پیانو بجانے میں محو ہے۔ نوجوان کی آرزو سن کر بتاتی ہے کہ وہ پچھلے پچیس سال سے انتظار کررہی ہے کہ اس کا تخیلی محبوب گھوڑے پر سوار میرے محل کے نیچے آئے گا اور مجھے پالے گا۔ تم پچیس سال بعد پہنچے ہو۔ اب شاید تمہیں اپنا محبوب پانے کیلئے میری طرح پچیس سال اور انتظار کرنا پڑے۔

چند کہانیوں کو چھوڑ کر باقی سب افسانوں میں مصنف کی شخصیت نمایاں ہے وہ ہر افسانے میں خود ایک کردار ہے۔ اگرچہ اس نے دو تین جگہ اکبر اور احمد کی زبان سے قصہ بیان کیا ہے لیکن یہ اشخاص بھی ایرانی ہیں جو امریکہ گئے ہیں۔ اکثر کہانیوں میں مصنف گویا آپ بیتی بیان کررہا ہے یا کہانی بیان کرتے کرتے پڑھنے والوں کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ ذاتی عنصر افسانہ کو افسانہ ہونے کی حیثیت سے زک پہنچاتا ہے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خود اپنے افکار و عقاید بیان کررہا ہے۔ "خاطرات خدا' فضل اللہ اور پرسیلا" میں بعض طویل بیانات پر مضمون ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

نوری کی اکثر کہانیاں دلچسپ ہیں۔ پلاٹ سادہ ہیں۔ "خاطرات خدا" میں وہ O. Henry کے افسانوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایسی مختصر کہانیاں لکھنے کی کوشش کی ہے جن کا اختتام ناگہانی ہو۔ "جادوی نور' چکش' مست" اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔ ان کی تخیل بڑی منضبط ہے۔ وہ واقعات کو سلیقے سے جوڑ کر پیش کرتے ہیں کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اس میں تکلف و تصنع کی بو کم آتی ہے۔ "لورا' شارلوت' آسیہ' چکش' خونبہا" ان کی بہترین کہانیاں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ جب وہ اجتماعی زندگی کے دوسرے موضوعات کو اپنے افسانوں کا مرکز خیال بنائیں تو ثقہ لوگوں میں بھی ان کی مقبولیت ہوجائے۔ ادبی حلقوں میں ان پر اعتراض کیا جارہا ہے کہ وہ بھی آجکل کے آرٹ کی طرح عریاں نگار ہے اور لذتیت کا مبلغ ہے۔ واقعی ان کے بعض عشق و سرمستی کی کارگزاریوں کے بیانات بڑے دلکش اور لذت بخش ہیں اور ہیجان انگیز بھی ہیں۔

نوری کا دل و دماغ فنون لطیفہ سے ذوق سرشار رکھتا ہے۔ وہ قدرت کی رعنائیوں پر مست ہے۔ موسیقی کا والہ وشیدا ہے۔ شعر و عشق اس کی روح میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل بیانات پر غور کیجئے۔ اس کے گداز روح کا نشان بتاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

1- "من وقتی بسر چشمہ از زیبائی دجاندار وبی جان' میرسم باتمام روح خود عصارۂ آنرا میمکم و

مثل زنبوری کہ برای روز ہای زمستان کہ از گل خبری نیست تہیہ کند۔ برای دقایق تنہائی خود عسل میسازم"۔

2- "**استشمام** این عطر، فقط سرمایہ ای سرشار از نازک دلی میخواہد۔ وقتی آدمی نازکدل شد، میتوان سحرگاہ، پچمن رفت و صدای روئیدن شگوفہ رابروی درختان سیب شنید، بنوای بال پروانہ در آسمان گوش داد و باز شدن، غنچہ را درک کرد"۔

3- "غمی کہ موسیقی بارمغان می آورد، خیلی شیرین است، ہچون مخملی قلب را درمیان میگیرد و برای چند لحظہ اضطراب و وحشت از نامعلوم جای خود را با آرامش سکر آور میدہد"۔

اس کے بیان کی شعری لطافتوں اور احساس نازک کو بھی مندرجہ ذیل جملوں میں دیکھ لیجئے۔

"شمع را نیز کشتم کہ رگر یسن تنہا باشم۔ موسیقی طبیعت رابابید درسکوت محض باگوش جان شنید، لبانہا کہ ہچو برگ گل لطیف، ہچوں آتش سوزاں و ہچوں بال پروانہ پر از روح و ارتعاش بود"۔

جلال آل احمد

جلال آل احمد 46 برس کی عمر میں 1969ء میں پر اسرار حالات میں انتقال کرگئے اسی طرح وہ گویا 1923ء میں پیدا ہوئے۔ وہ محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ حزب تودہ سے بھی ان کا تعلق رہا۔ مختصر سی مدت تالیف میں تلاش و تحقیق، تنقید و ترجمہ اور افسانہ ناول پر بلند بارپایہ یادگار بھی چھوڑ گئے۔

جلال آل احمد اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں سوشلسٹ اور ریالسٹ ادب تخلیق کروں"۔ (ارزیابی شتابزدہ ص 98)

کبھی ٹیکنیک کی وجہ سے استعارہ اور تمثیل کی پناہ لینی پڑتی ہے۔ عام طور پر میں صریح گفتگو کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی مجبور ہوجاتا ہے۔ مثلاً "نون والقلم" میں۔ اس میں ایک نیا تجربہ کیا ہے اور کنائی زبان استعمال کی ہے۔ اس لئے فنی نقطہ نظر سے میرے لئے یہ زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

تالیفات قصہ و داستان

دید و باز دید	1324
از رنجی کہ می بریم	1326 /1947
سہ تار	1325 /1948
زن زیادی	1331 /1953
سرگذشت کندوھا	1332 /1954
مدیر مدرسہ	1332 /1958
نون و القلم	1340 /1961
نفرین زمین سنگی برگوری	1346
پنج داستان	1953 /1333
مشاہدات اورازان	1953 /1333
تات نشینان بلوک زہرا	1958 /1333

دہیم خلیج جزیرۂ خارک	1339 /1960
مقالات غرب زدگی	1341
ہفت مقالہ	1333
سہ مقالہ دیگر	1341
ارزیابی شتابزدہ	1342
کارنامہ سہ سالہ	1345
رسالہ یک چاہ ود چالہ	1357
سفرنامہ منی درمیقات	1360 '1345
ترجمہ "قمار باز" از داستایوسکی	1327
بیگانہ ازالبر کامو (بااصغر خیرزادہ)	1328
سوء تفاھم البر کامو	1329
دستدای آلودہ- ژان پل سارتر	1331
مائدہ ہای زمینی- آندرہ ژید (باپرویز اریوش)	1334
یادداشت از شوروی- آندرہ ژید	1333
کرگدن- اوژن یونسکو	1345
عبور از خط- ارنست یونگر باد کتر محمود ھومن	1346
چہل طوطی (باسیمین دانشور)	1351
تشنگی و گشنگی ازیونسکو (باہزار خانی)	1351

دیدو بازدید:

پہلی مرتبہ اسفند 1324 ش ر 1946ء میں شائع ہوئی- اس میں چھوٹی بڑی بارہ کہانیاں ہیں- اکثر کہانیوں میں معاشرتی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی ملتی ہے- رضا شاہ کبیر نے عوام کو عزاداری، روضہ خوانی اور فضول رسموں کی جکڑ بندیوں سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر انسان کو دل و دماغ کی آزادی حاصل کرنے کیلئے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہے- جلال نے عموماً نچلے اور متوسط طبقے سے اپنے کردار حاصل کئے ہیں- پستچی یعنی ڈاکیا عیدی لینے کا منتظر رہتا ہے- شمع

قدی میں منبر پر موم بتیاں اور چراغ جلائے رکھتا ہے تاکہ وہ لوگ جو منتیں مان کر بتیاں اور چراغ چڑھانے آتے ہیں- ان سے کچھ رقم حاصل کر سکے- سریع الاعتقاد لوگ ائمہ کے مزارات کی زیارت کیلئے جاتے ہیں- ضریح سے لپٹ کر روتے ہیں- نذریں چڑھاتے ہیں- قفل لگاتے ہیں- طواف کرتے ہیں- بازاروں میں دعائیں اور تعویذ بیچنے والے مجمع لگاتے ہیں- بعض کہانیوں میں غربت و افلاس کا عام نقشہ ملتا ہے- تابوت اور دومروہ سے بھی واضح ہے- ایک شخص ندی کنارے بھوکا پیاسا مرا ہوا پایا گیا- ایک لاوارث فقیر عورت مردہ پائی گئی- بعض کہانیوں سے ظاہر ہے کہ عوام میں نظم و ضبط نہیں- کچھ لوگ عزاداری میں مصروف ہیں- دو سپاہیوں کو آتے دیکھ کر بھاگتے ہیں اور مسجد میں پناہ لیتے ہیں- جہاز آسمان پر منڈلاتا ہے یا توپ کا گولہ چھوٹتا ہے تو بدحواس ہوکر دکانیں بند کرکے ادھر ادھر چھپتے پھرتے ہیں- تجہز ملت میں اس کی طرف طنز کیا گیا ہے- لوگوں میں اجتماعی شعور نہیں- ایک دوسرے کی مدد کیلئے آگے نہیں بڑھتے- جلال عوام کی زبان میں لکھتے ہیں اور انہی کی زبان میں ان کے عقائد کا اظہار کرتے ہیں- عورتیں یعنی بڑی بوڑھیوں کی زبان پر کامل دسترس سے لکھتے ہیں- وہ ایک طرف لوگوں کو ان کے اعمال میں مصروف دکھاتے ہیں دوسری طرف انہی میں سے کسی ایک کی زبانی ان کے اعمال پر تبصرہ کرا دیتے ہیں مثلاً منت پوری کرنے کیلئے جو لوگ موم بتیاں جلاتے ہیں ان کے متعلق ایک شخص کہتا ہے:

"اسیتمہ شمع اینجا گر کر بسوزہ چہ فایدہ! شمار ابجد' اسراف نیست!" (ص 82)

وہ لوگ جو سپاہیوں کو دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں ان کے متعلق سپاہی کہتے ہیں:

"بیچارہ ہا- راستی چقدر مردم ترسیدہ اند- تقصیر ما چیہ- خوشموں می خواہیم بریم مردم ازمون- رم می کنند" (ص 90)

رنجی کہ می بریم

سات کہانیوں کا مجموعہ ہے- عنوان سے ظاہر ہے جس درد و کرب سے عوام گزر رہے ہیں افسانہ نگار ان کی عکاسی کرنا چاہتا ہے- معلوم ہوتا ہے یہ کہانیاں ایک ایسے دور سے متعلق ہیں- جب مارشل لاء ملک پر مسلط ہے اور عوام شکنجہ و عذاب میں ہیں- حکومت کے خلاف ذرا سے

شک کی بنا پر فوجی دستے ٹوٹ پڑتے ہیں- گھربار' دکانیں' مال و اثاثہ تہہ و بالا کردیتے ہیں- لوگ سہمے سہمے پھرتے ہیں اور اپنا درد دل سنانے سے بھی ڈرتے ہیں- درۂ خزان زدہ اور زیر اسبیہا تو ایک ہی کہانی کے دو حصے ہیں- اسلحہ رکھنے کے شب میں کان دغال کے مکینوں کو پکڑ لیتے ہیں کچھ کو گولی کا نشانہ بناتے ہیں اور کچھ دور جنوب کے علاقوں میں جلا وطن کردیئے جاتے ہیں- محیط تنگ اور اعتراف میں جرم کا زبردستی اعتراف کرانے کیلئے شکنجہ و عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے- روز ھای چالوس اور روز ھای خوش اور روز ھای آبروی از دست رفتہ فوج کے ہاتھوں تباہ شدہ برباد شدہ اپنی داستانِ غم بیان کرتے ہیں-

مصنف کا مشاہدہ غائر ہے- وہ مقامات اور وقایع کا خوب نقشہ کھینچتا ہے چونکہ اس کے کردار نچلے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ ان کی زبان میں گفتگو لکھتا ہے مثلاً بنیا' مزدور' ڈرائیور' فوٹوگرافر وغیرہ-

سرگزشت کندوھا

یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے- اس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ چھ مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے- قصہ تو شہد کی مکھیوں کا ہے کہ وہ کس طرح کس محنت و جانفشانی سے ذرہ ذرہ شہد جمع کرتی ہیں- گھر بنا کر اس کو ذخیرہ کرتی ہیں تاکہ موسم سرما میں جب دھوپ کم نکلتی ہے- پھول بھی نہیں کھلتے اور سردی کے مارے باہر نہیں جاسکتیں- اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن ایک شخص آتا ہے- ان کا گھر تہہ و بالا کرتا ہے اور تمام ذخیرہ لے جاتا ہے- ایک مرتبہ چھوٹی بڑی مکھیاں مشورہ کرنے لگیں کہ اس بلا سے یہ کیسے نجات پاسکیں- سب نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مشورے دیئے- آخر یہ فیصلہ ہوا کہ سب اکٹھے مل کر یہاں سے دوسرے شہر آزاد فضا میں چلے جائیں اور اس شخص سے جو ان کو بارہ مختلف گھروں میں شیرے کا لالچ دیکر ہر بار جمع کرلیتا ہے اور بہار میں پھر ہماری محنت و جانفشانی سے فائدہ اٹھاتا ہے- نجات پائیں- چنانچہ وہ متحد ہوکر فرار ہوجاتی ہیں-

ظاہر ہے یہ ایک علامتی کہانی ہے- افسانہ نگار نے بڑی دقت نظر سے شہد کی مکھیوں کی زندگی رہن سہن اور عادات و خصایل کا مطالعہ کرکے کہانی لکھی ہے اور نہایت باریک نگی سے ان کے حال و احوال کو بیان کیا ہے- اشارے کنائے سے بھی ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ اس قصے کو

انسانی زندگی پر منطبق کرکے وعظ کرنا چاہتا ہے اور انسان کو اجتماعی حبس و قیود سے آزاد ہونے کیلئے ہجرت کا سبق دیتا ہے تاکہ جابروں خود غرضوں کے استحصال سے نجات پائے اور حوصلہ و جرات سے مستقبل میں شدائد کا مقابلہ کرنے کیلئے آمادہ ہو-

مصنف نے کہانی پر آخر تک گرفت رکھی ہے اور بیان میں جھول نہیں آنے دی-

سہ تار

تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے- ان کے کردار عموماً نچلے طبقے سے متعلق ہیں- اکثر مفلس ہیں اور تنگ دستی میں زندگی گزار رہے ہیں- بعض سماجی شہر کی وجہ سے مجبور ہیں- بچہ مردم میں ایک عورت اپنے پہلے شوہر کے بچے کو اپنی ممتا کا گلا گھونٹ کر سربازار اس کو آوارہ چھوڑنے پر مجبور ہوئی کیونکہ اس کا موجودہ شوہر بچے کو اپنانے کیلئے تیار نہیں اور وہ اپنی زندگی برقرار رکھنے کیلئے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے- وداع میں بچے بچیاں ٹرین کے مسافروں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں- ایک بچی اس کوشش میں پٹڑی پر گر جانے سے جان ہی سے ہاتھ دھونے کا خطرہ مول لیتی ہے- "زندگی کہ گریخت" میں مزدور زیادہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جان دے بیٹھتا ہے- اختلاف حساب میں بنک ملازمین کی پریشان دماغی کا ذکر ہے- کلرک اپنے بچے کی بیماری سے پریشان ہے- اس لئے حساب میں غلطی درست کرتے کرتے دیر تک بیٹھتا ہے- آخر دفتر میں اسے بچے کی موت کی خبر ملتی ہے- ان پڑھ اور کم سواد لوگوں میں جو مذہبی تنگ نظری پیدا ہوتی ہے وہ اس کو ظاہر کرنے اور اپنی دینداری کا بھرم رکھنے کیلئے ایسے کام کرتے ہیں جس سے دوسرے کو جسمانی' ذہنی اور مالی نقصان پہنچتا ہے- جلال آل احمد نے تین چار کہانیوں میں اس کی نشاندہی کی ہے- سہ تار میں ایک شخص سہ تار بجا کر اپنی روزی کماتا ہے- ایک دن وہ مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے- ایک نوجوان سے الجھتا ہے اور وہ اس خیال سے کہ آلہ موسیقی مسجد میں لے جانا منع ہے سہ تار کو چھین کر توڑ ڈالتا ہے اور ایک نادار شخص کو اس کی روزی سے محروم کردیتا ہے- آفتاب لب بام میں ایک شخص موسم گرما میں اپنی بارہ اور دس سالہ بچیوں کو روزہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے- غروب کے قریب مصلی بچھا کر نوافل پڑھتا ہے اور بات بات پر جھلا اٹھتا ہے- بڑی بچی کو برف لانے کیلئے کہتا ہے- وہ بھوک پیاس سے بے حال ہورہی ہے- ذرا سی تاخیر کی وجہ سے اٹھ کر اتنے زور سے مارتا ہے کہ وہ اوندھے منہ گرتی ہے اور زخمی ہوجاتی

ہے۔ ماں باپ کو زیر لب بے شرم و بے رحم کہتی ہے اور بیٹی کو خاموش کراتی ہے اور کہتی ہے کہ "میدونی بابا دم افطار سگ میشہ" لاکر کی صورت میں ایک غریب عورت کہیں ناخن پالش خرید لاتی ہے۔ اس کے میاں ناراض ہوئے اور پٹائی کردی اس لئے کہ "**مانبکور** خریدی جلو چشم نامحرم خریدی پول از کی آوردی از فاسقت"۔

اس مجموعے کے باقی دو تین افسانوں میں مصنف نے بعض اشخاص کے خاص ذہنی رجحانات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ "گناہ" میں ایک نوجوان لڑکی اپنے والد کے بستر پر سو جاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس نے گناہ کیا ہے۔ آرزوی قدرت میں ایک شخص کو سپاہی بننے اور سینے پر بندوق اٹھانے اور قوت حاصل کرنے کا خناس سمایا ہوا ہے۔

مدیر مدرسہ

یہ ایک چھوٹا سا ناول ہے جس میں جلال آل احمد نے خود کو مدیر مدرسہ یعنی ہمارے ہاں کے اصلاحی معنوں میں ہیڈ ماسٹر کے عنوان سے ایک پرائمری سکول کے احوال و کوائف بیان کرتے ہوئے اساتذہ، ناظم، چپراسی اور بچوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور ایک منتظم کی مشکلات اور ایک حساس انسان کی ذہنی کشمکش کو اجاگر کیا ہے۔ یہ ناول 1337 ش 1958ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تعلیمی حالت اچھی نہیں تھی۔ تنخواہیں کم تھیں۔ ایک دور افتادہ بستی میں اچھی سڑکیں نہیں تھیں۔ فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے سکول کی عمارت کی دیکھ بھال اچھی نہیں تھی لڑکے غریب امیر یکجا تھے۔ مدیر مدرسہ نے دلسوزی سے معیار تعلیم درست کرنے کی کوشش کی۔ انجمن تشکیل کرکے فنڈز اکٹھے کئے۔ دوسری انجمنوں اور ادارہ تعلیم سے مدد حاصل کرکے بچوں کی مدد کی۔ سردیوں میں **انگیٹھیوں** کو گرم رکھا لیکن مسائل اتنے تھے کہ وہ ایک سال کے بعد تنگ آکر مستعفٰی ہوگیا۔ اس کا ایک استاد روس سے ہمدردی کی وجہ سے جیل گیا۔ ایک استاد امریکن کی کار کے نیچے آکر ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ پولیس میں رپورٹ ہوئی لیکن امریکنوں نے وعدہ وعید کرکے نوکری دلانے کا قول دیکر اس کے لواحقین کو مقدمہ واپس لینے پر مجبور کیا۔ مدیر مدرسہ یہ حالت دیکھ کر کہتا ہے۔ "خاک بر سر مملکت" اور تبصرہ کرکے زخمی استاد سے کہتا ہے۔

"مگر **نمیدانستی** کہ خیابان و راہنما و تمدن و اسفالت ہمہ برای آنہامی ست کہ توی ماشین

ہای ساخت مملکتان دنیا را ریزپادارند، آخر چرا تصاوف کردی"

مصنف نے بڑی باریک نگہی سے تمام واقعات لکھتے ہیں۔ آس پاس کے مناظر و مظاہر کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ عوام کی نفسیات پر اس کی نظر ہے وہ انہی کی سطح پر گفتگو کرتا ہے وہ وعظ نہیں کہتا بلکہ ضمناً یا خود کہانی اور اس کے کرداروں سے نتائج پھوٹ کر نکلتے ہیں وہ حشو و زوائد لاکر کہانی کو خواہ مخواہ طویل نہیں کرتا۔

جلال آل احمد نے خود بتایا ہے کہ وہ مدیر مدرسہ' میں فرانسیسی مصنف FERDINANI ALINE LOUIS مؤلف "سفری بہ آخر شب" سے متاثر ہوا ہے۔ اس کی یہ کتاب ادبیات فرانس میں شاہکار شمار ہونے لگی ہے (ارزیابی شتابزدہ ص 97-96)

زن زیادی

اس مجموعے میں گیارہ کہانیاں ہیں۔ زن زیادی میں ایک عورت کی دکھ بھری داستان بیان کی گئی ہے جو چونتیس سال سے ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے اور چہرے پر بھی چیچک کے داغ تھے۔ وہ محنتی، محبوب اور باحیا تھی۔ آخر اسے ایک عیسائی بدہیئت نے قبول کرلیا لیکن اس کی ماں اور بہو نے اتنا تنگ کیا کہ وہ دو مہینے کے بعد اپنی بیوی کو ماں باپ کے گھر چھوڑ آیا۔ اس عورت پر جو آفت آئی اور اس کے دل و دماغ پر جو گزری، مصنف نے اسی عورت کی زبانی نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا ہے اور ضمناً قدرت اور سماج کی بے رحمی اور عورت کی بے بسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کہانی کے مقابل زینت الدولہ کی کہانی ہے جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ وزیر کی بیٹی ہے۔ امراء اور اشراف کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ تین شوہروں سے طلاق لے چکی ہے اور مال بٹور چکی ہے لیکن بیاہتا لڑکیوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی زیب و آرائش کے تمام وسائل کو کام میں لاکر جوان نظر آتی ہے اور آئیڈیل شوہر کی تلاش میں ہے۔ دفتر زچہ بچہ میں سکول کے اساتذہ کی بدحالی اور پریشان دماغی کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ بچوں کے ساتھ سر کھپا کھپا کر پاگل ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً حساب پڑھانے والے تو اکثر دیوانہ ہوجاتے ہیں۔ صحت کا لازمی بیمہ کرانے پر استاد دل سے تیار نہیں کیونکہ ان کی تنخواہ سے ہر ماہ کچھ رقم کٹ جائے گی۔ ایک استاد بیمار ہے۔ ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے۔ وقت کھوتا ہے اور اپنے خفا ہونے، بگڑنے اور غضبناک ہونے کا معالجہ نہیں کرپاتا۔ سکول میں ڈاکٹروں نے ایکس ریز میں

پھیپھڑے کے نیچے سیاہی کا نشان بنا کر ایک استاد کو فکر مند اور اس کی بیوی کو پریشان کردیا ہے۔ حالانکہ زیادہ سگریٹ پینے کی وجہ سے کھانسی کی شکایت ہوگئی تھی۔ "خداداد خاں" میں ایک مارکسی نظریات کے حامل، ایک ایرانی لیڈر کے احوال و کوائف بیان کئے ہیں اور شب و روز اس کی مصروفیات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اخبار و مجلات کا ایڈیٹر ہے۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں جاتا ہے۔ بیرونی مطبوعات سے بھی باخبر رہتا ہے اس کی بیوی بھی غیر ملکی سفارت خانے میں ٹائپ کا کام کرتی ہے اور ہزار تومان تنخواہ پاتی ہے۔ خداداد شاہ کبیر کے زمانے میں چھ سال جیل میں رہے ہیں۔ سمنو بیزان میں ایک گھر کی کیفیت بیان کی ہے جہاں ایک ماں اپنی بیٹی کی مقصد بر آری کیلئے حضرت فاطمہ کی نذر مان کر سمند پکا کر اور ملا نے ختم پڑھوا کر تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ عورتیں جمع ہیں اور کام میں مصروف ہیں۔ بڑی بوڑھیاں حقہ پیتی ہیں اور باتیں کرتی ہیں۔ سارا گھر متحرک ہے۔

یہ مجموعہ داستان پہلے 1331/ 1952ء میں چھپا تھا۔ اس کی کہانیاں خاصی مقبول ہوئی۔ چھٹا ایڈیشن 1357/ 1978ء میں شائع ہوا۔

جلال آل احمد ایران کی عائلی زندگی سے خوب آگاہ ہیں۔ رسم و رواج سے آگاہ ہیں عورتوں کی نفسیات پر ان کی نظر ہے۔ ان کی زبان پر تسلط ہے۔ ان کے اشخاص قصہ متحرک ہیں۔ مکالمے ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہیں۔ ان کہانیوں کے پس منظر میں ان کا درد دل بھی جھلکتا ہے۔ وہ معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی اپنے اشخاص قصہ کے احوال و کوائف سے کرتے ہیں۔ وعظ نہیں کرتے۔ کہانی کے کردار اپنی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرتے ہیں اور ان کی گفتگو میں تصنع نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے اشخاص قصہ کی شخصیت کو بڑی خوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔ مطالعہ کرنے والے کو ایرانی معاشرے میں زینت الدولہ، زن زیادی، سکول اور مدرسہ کے استاد چلتے پھرتے ملیں گے۔ بڑے شہروں میں تہذیب و تمدن کی بیرونی چمک دمک کے پس منظر میں گلی کوچوں میں متوسط اور نچلے طبقوں کے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور وہ جلال کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ان کو کھوج کھوج کے نکالتا ہے اور ان سے آشنا کراتا ہے۔

نون والقلم:

یہ ایک ناولٹ ہے۔ مصنف نے اسے قصہ کہا ہے۔ نون و القلم بظاہر قرآن کی ایک سورہ کا

نام ہے۔ لیکن یہ نام اس ناول کے ایک کردار مرزا اسد اللہ کے قول کی شناخت کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ نون نان کی عوامی صورت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ روٹی کی خاطر قلم کو نہیں بیچا جائے گا۔ مرزا اسد اللہ اسی ناول کا نمایاں کردار ہے اور وہ اصول و ایمان کی بات کرتا ہے۔ عرضی نویس ہے۔ دوسروں کیلئے درخواستیں اور شکائتیں لکھتا ہے۔ قلم سے واسطہ رکھنے والے لوگ پیسے کی خاطر یا سرکاری دباؤ کی وجہ سے ضمیر بیچ دیتے ہیں۔

کہانی میں ایک ایرانی عیاس بادشاہ کا ذکر ہے جو قلعے میں رہتا ہے۔ حرم سرا عورتوں سے بھرا پڑا ہے۔ امراء وزراء خوفزدہ بھی ہیں اور اس کے دل و دماغ پر مسلط بھی ہیں۔ میزان الشریعہ فتویٰ دینے کیلئے حاضر ہیں۔ مخالفوں کو پھانسی قتل، کھال میں بھس بھر دینا، جلا وطن کردینا، جسم میں سوراخ کر کے شمع سے جلا کر اذیت دینا، جیلوں کی تنگ کوٹھڑیوں میں قید رکھنا عام سزائیں ہیں۔ دارالسلطنت میں خفیہ طور پر شاہی ظلم و استبداد کے خلاف قلندروں کی ایک جماعت منظم ہوئی ہے۔ انہوں نے توپیں بھی ڈھالنا شروع کردی ہیں۔ وزیراعظم اس بغاوت سے خوفزدہ ہو کر بادشاہوں کو کچھ دنوں کیلئے سنی حکومت کی سرحد کے قریب لے جاتے ہیں۔ قلندر قوت پکڑ کر قلعے پر قابض ہوجاتے ہیں۔ چھ مہینوں تک سردی اور قحط سالی میں کسی نہ کسی طرح نظام چلاتے ہیں۔ عوام کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ روزی مہیا کرتے ہیں اور دفاع کا سامان بھی پختہ کرتے ہیں۔ بادشاہ کی خفیہ پولیس مخالف عناصر کو قلندروں کے خلاف اکساتی رہتی ہے۔ ادھر بادشاہ ہمسایہ سنی حکومت سے صلح کر کے اپنی سلطنت کا کافی حصہ اس کو دے دیتا ہے اور اس سے توپیں اور توپچی حاصل کرتا ہے اور واپس دارالسلطنت میں آتا ہے۔ قلندر مقابلہ کرتے ہیں لیکن اندرونی مخالفین نے نہر کا پانی قلعے کے اندر چھوڑ کر ان کے بارود خانے کو بے کار کردیا۔ آخر وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سازو سامان لیکر اور بادشاہ کی حرم سرا میں نوجوان عورتوں کے ساتھ رات رات ہندوستان کی سرحد کی طرف کوچ کرتے ہیں جہاں ان کے خیال میں عدم تشدد اور صلح کل کے چرچے ہیں۔ بادشاہ قلعے میں داخل ہو کر مخالفین کو سخت سزائیں دیتا ہے۔

مصنف نے ایک طرف مطلق العنان بادشاہ کے زیر حکومت عوام کی زندگی کے جستہ جستہ احوال و کوائف بیان کئے ہیں اور بادشاہ کے عمال و حکام کی سخت گیری اور لوگوں کے جان و مال کو زبردستی ضبط و سلب کرتے دکھایا ہے۔ دوسری طرف قصہ میں ایسے اشخاص کو متعارف کرایا ہے جو محنت و اخلاص سے روزی کماتے ہیں اور اپنے اصول و ایمان پر قائم رہتے ہیں اہل حق جمہوری حکومت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب ناکام ہوتے ہیں تو ملک چھوڑ دیتے ہیں۔

مصنف نے قصہ کے ہیرو کی زبانی اپنے ترقی پسندانہ افکار و عقائد کو بیان کیا ہے مثلاً مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ کیجئے۔

ہیچکدام توی خون و مال مردم نزدہ ایم

مال وقف مال مردم است الزرع للزارع

صمیم گرفت دیگر از راہ ایں قلم و کاغذ نان نخورد

شہادت دست ظلم راز جان و مال مردم کوتاہ نمی کندااما

سلطہ ظلم را از روح مردم می گیرد۔ مردم بہ سلطہ ظلم تن می دھند اما روح نمی دھند۔

بادشاہ کے قلم فروش شعراء کے بارے میں لکھا ہے۔

قصیدہ ای دربارۂ صدای آروق وزیر دواب بعد از خوردن شکرپلو

یہ مرثیہ ای دربارۂ کرہ خرسوگلی قبلہ عالم سقط شدہ بود' می **نویسند**۔

ناول نویسی

تنقیدی ناولوں کی ابتداء سفرناموں سے ہوئی ہے۔ ناصر الدین شاہ کے سفرنامے بھی اثر انداز ہوئے۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اور مسالک **المحسنین** دو ایسی کتابیں ہیں جنھوں نے ایرانی ذہن کی بیداری میں بڑا حصہ لیا۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ بڑا مقبول ہوا۔ اس کے مصنف حاجی زین العابدین مراغی تھے جو استامبول میں رہتے تھے اور روزنامہ "اختر" کے نامہ نگار بھی تھے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حیات ابراہیم کے واقعات کا ذکر ہے۔ دوسرے میں سفر کے حالات مندرج ہیں اور تیسرے میں ایک دانشمند ایران کے بیانات شامل ہیں یہ کتاب ایک دردمند وطن پرست کی پکار ہے۔ اس کا دل ایرانیوں کی پستی اور پسماندگی پر جلتا ہے۔ اس نے حکام کے استبداد' علماء کی بے راہ روی اور عوام کی بے علمی اور توہم پرستی پر سخت تنقید کرکے ان میں جذبہ بیداری اور اصلاح پیدا کرنے کی مخلص کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ پرانے مروجہ تصنع و تکلف سے خالی ہیں۔ جابجا تقریریں بھی شامل ہیں اور کہیں کہیں نامانوس الفاظ و مرکبات بھی ملتے ہیں۔

دوسری کتاب مسالک **المحسنین** کے مصنف عبدالرحیم طالب اف ہیں۔ یہ کتاب 1323ھ قاہرہ میں چھپی تھی۔ یہ سیاحت نامہ خیالی اور علمی ہے۔ محسن بن عبداللہ ایک شخص اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جن میں انجنیئر اور ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔ کوہ دماوند پر جاتے ہیں اور وہاں سے نئی معلومات اور انکشافات حاصل کرکے تین مہینوں میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں علمی باتوں کے علاوہ ضمناً مختلف گروہوں کے آداب و رسوم کا تذکرہ ہے لیکن قصہ کہانی کا انداز بھی قائم رکھا ہے۔ اس لئے اس کتاب کا ادبی مقام بھی بلند ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ کہیں کہیں صرفی و نحوی غلطیاں ہیں اور ترکی اصطلاحات کا استعمال بھی عام ہے۔

حاجی بابا اصفہانی اگرچہ موریر کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ناول ایران کے نظم و نسق اور ایرانیوں کی اخلاقی زندگی پر بہت بڑی طنز و تنقید ہے۔ ایرانیوں کی ذہنی بیداری میں حاجی بابا اور سیاحت نامہ ابراہیم بیگ دونوں کتابوں کا اہم حصہ ہے۔ متاخرین افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے دونوں کتابوں کی تقلید میں سماج پر تنقید کی ہے۔

سب سے اچھا سماجی ناول جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ مشفق کاظمی کا "تہران مخوف

" ہے جو پانچ جلدوں میں شائع ہوا اور بڑا مقبول ہوا۔ اس ناول میں نچلے طبقوں پر حکام کے ظلم و ستم اور ماحول کی خرابی اور فساد کا بیان ہے۔ زبان سادہ ہے اور کہانی بڑی دلچسپ ہے اس مصنف کے اور ناولٹ یا طویل مختصر افسانے "گل پژمردہ" اور "رشک پر بہا" بھی شائع ہوئے مگر ان کو تہران مخوف جیسی شہرت حاصل نہ ہوئی۔

عباس خلیلی کے تین چار ناول بنام 1- "روزگار سیاہ' 2- انتقام 3- انسان اور 4- اسرار شب" بھی اچھے خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ ان میں عورتوں کی زبوں حالی کے متعلق واقعات اور حوادث بیان کئے گئے ہیں۔ ربیع انصاری کے ناول خیانت بستر اور سیزہ وعید ہیں۔ جہانگیر جلیلی کے تین ناول "من ہم گریہ کردہ ام' از دفتر خاطرات اور کاروان عشق" بھی اجتماعی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں سماجی ناول لکھنے والوں میں سے دو مصنفوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ایک میر محمد حجازی اور دوسرے محمد مسعود دھانی۔

محمد حجازی نے 1347ھ میں "ہما اور ایک سال بعد پریچہر " کے نام سے ناول لکھے ان دونوں ناولوں کے اشخاص قصہ شہری متوسط طبقہ کے افراد ہیں۔ دونوں میں مصنف کا مقصد حقوق نسواں کی حمایت اور تجدید کی تبلیغ ہے۔ اس نے ہما کو ایک خوش اخلاق اور متوسط درجہ کے خاندان کے لئے مفید اور سلیقہ مند تبلیغ کی پیش کیا ہے۔ لیکن "پریچہر" بالکل اس کے متضاد ایک ہوسباز شہوت پرست عورت ہے۔ اگرچہ یہ ناول جدید فن نگارش کے اصولوں کے مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن بعض کردار حقیقی اور واقعی معلوم نہیں ہوتے۔ کہانی ایک قصہ معلوم ہوتی ہے۔ حجازی نے تیسرا ناول "زیبا" نام سے لکھا ہے جو دو جلدوں میں چھپ چکا ہے اس ناول میں ان شہرنشین اشخاص کا ذکر ہے جو برے نظام اور مفسد سماج میں بری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اس ناول میں زیادہ حقیقت اور واقعیت ہے۔ اس کے پہلے دو ناولوں سے یہ ناول زیادہ مقبول ہوا۔ اس میں بھی عورت کے مکرو خباثت کو بدنما رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور اجتماعی ماحول، حکومت اور اس کے اداروں میں نظم و نسق کی خرابیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

دوسرے ناول نویس جنہوں نے سماج پر تنقید کی ہے۔ محمد مسعود دھاتی ہیں۔ ان کے ناول تفریحات شب۔ درتلاش معاش' اور اشرف المخلوقات' اچھے خاصے مقبول ہوئے۔ ان ناولوں کے اشخاص شہری طبقہ کے لوگ ہیں۔ خاص طور پر ان اشخاص کا ذکر ہے جو دن کو دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور رات کو عیاشی اور آوارہ گردی میں گزارتے ہیں۔ مصنف کا

خیال ہے کہ یہ لوگ خود قصوروار اور تباہ کار نہیں بلکہ غلط عادتوں اور جاہلانہ تعلیم کی وجہ سے یا اقتصادی بدحالی اور مفسد ماحول کی وجہ سے وہ ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان ناولوں میں تجدد و تعلیم پر زور دیا ہے اور مروجہ روایتی تعلیم و تدریس پر اعتراضات کئے ہیں کیونکہ رائج تعلیم مسائل زندگی کو حل نہیں کرتی۔ مصنف کے اسلوب بیان میں عامیانہ محاورہ اور اخباری زبان کا استعمال عام ہے۔ اس مصنف کے آخری دو ناول "گلہای کہ در جہنم می روید' اور بہشت آرزو" شائع ہوئے ہیں۔

سماجی ناول نگاروں میں جواد فاضل کا نام سرزبان ہے۔ انہوں نے دو دو ڈھائی ڈھائی سو صفحوں کے کم وبیش پچاس ناول لکھے ہوں گے۔ ان کا عام موضوع جوان مرد اور عورتوں کی بے راہ روی' ازدواجی خرابیاں اور اجتماعی مفسدات ہیں یہ ناول اچھے خاصے مقبول اور دلچسپ ہیں۔

1961ء میں محمد علی افغانی کے ناول "شوہر آہجی خانم" کو بہت شہرت حاصل ہوئی اس میں حرفہ و صنعت سے وابستہ خاندان کی زندگی اور احوال و کوائف کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کا تفصیلی تعارف آئندہ صفحات میں ہوگا۔

تاریخی ناول

ایران میں نقالوں کی زبانی قصے بیان کرنے کا رواج تھا۔ اس میں بہادری کی داستانیں بیان ہوتی تھیں۔ زبان بھی دلکش ہوتی تھی۔ لوگ دلچسپی سے سنتے تھے لیکن ادبیات میں ان قصوں کا شمار نہیں ہوتا تھا یہ بھی ایک طرح کے ناول ہیں۔ ان میں رستم نامہ' اسکندر نامہ' داراب نامہ' سمک عیار اور حسین کرد وغیرہ معروف ہیں۔

ایران میں تاریخی ناولوں کا رواج ترجموں سے شروع ہوا۔ الیگزنڈر ڈوما اور جرجی زیدان کے ناول ایران میں بہت مقبول ہوئے۔ انہیں ناولوں سے متاثر ہو کر ایرانیوں نے خود اپنے ملک کی تاریخ سے واقعات کو منتخب کرکے ان کے قصے کی صورت میں لکھنا شروع کیا۔

تاریخی ناول نگاروں میں محمد فافر خسروی' شیخ موسیٰ نثری' حسن خان' بدیعی صنعتی زادہ' کرمانی کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے ناول 1909ء اور 1921ء کے درمیان شائع ہوئے۔

محمد باقر خسروی

پہلا تاریخی ناول شمس و طغرا کرمان شاہ میں 1909ء میں شائع ہوا۔ ماری و ینسی، طغرل و ہمای 1910ء میں شائع ہوئے۔ یہ تینوں الگ الگ کہانیاں ہیں لیکن ان کے اشخاص قصہ مشترک ہیں۔

شمس آل بویہ کا شہزادہ ہے جو منگول حکمران کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہو گیا اس کی شادی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے شمسی نے جرات سے مقابلہ کیا۔ بڑے بڑے حوادث سے دو چار ہوا۔ تاریخی لحاظ سے اس ناول کی بڑی اہمیت ہے مصنف نے مستند کتابوں سے معاصر کوائف جمع کئے ہیں اور کتابوں کی فہرست بھی درج کی ہے۔ اس ناول میں زمانے کے شادی بیاہ اور ماتم کے رسوم' سفر'شکار' تاریخی مقامات' قبائل کے سرداروں' پہلوانوں اور نقالوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس نے تعداد ازواج اور عورت کی غلامی کے خلاف ہجو و طعن سے کام لیا ہے۔ اسی نے حکومت کے مستبدانہ نظام اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کی زبردست مذمت کی ہے۔ خسروی نے عوام کی زندگی کی عکاسی کرنے میں اچھی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ محمد علی جمالزادہ نے اس ناول کی بہت تعریف کی ہے اور اسے ادبیات جدید میں مغربی زبانوں میں ترجمہ کے لئے ایک مثالی نمونہ قرار ہے۔

شیخ موسیٰ نثری

موسیٰ نثری نے قدیم تاریخ سے متعلق تین ناول لکھے۔

1- عشق و سلطنت یا فتوحات کورش کبیر۔

2- ستارہ لیدی

3- سرگذشت شاہزادہ قاسم بابلی۔

1919ء میں ہمدان میں شائع ہوا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں کورش کبیر کی ابتدائی زندگی سے لیکر فتح ہمدان تک کے واقعات کا ذکر ہے۔ قدیم ایرانی ناموں کو اصلی تلفظ میں نہیں لکھا بلکہ فرانسیسی تلفظ کی مدد سے فارسی میں منتقل کیا ہے۔ ناول میں واقعات کی تاریخی آثار قدیمہ اور اساطیر کہن کے متعلق حواشی بھی دیئے گئے ہیں۔

ستارہ لیدی 25- 1924ء میں شائع ہوا۔ اس میں کر و ئسوس کے خلاف کورش کبیر کی

مہمات' ساردیس کی فتح اور لیدیا کی ایرانی سلطنت میں شمولیت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

سرگذشت شاہزادہ بابلی 32- 1931ء میں کرمانشاہ میں شائع ہوا۔ اس ناول میں میدیا کے شاہزادہ ہرمزان اور بیبی لون کی شہزادی ایری دیس کے معاشقہ کی داستان بیان کی گئی ہے۔ آخری دو ناولوں کی کہانی محکم اور دلچسپ ہے۔ اسلوب بیان بھی مستقیم اور دلکش ہے۔ مکالمات بہت کم ہیں۔ سب کردار ایک طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

حسن بدیع نصرۃ الوازراء

داستان باستان کے نام سے اس کا تاریخی ناول تہران میں 1931ء کو شائع ہوا۔ اس نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ پہلا تاریخی ناول ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس ناول میں بیژن و منیژہ کی عشقیہ داستان کے پس منظر میں ایران کی قدیم تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ہخامنشیوں کے حکومت کے آغاز سے کورش کبیر کے ہاتھوں لیدیا اور سیحارون پر تصرف تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تفصیلات ماہنامہ فردوسی میں مندرج تاریخ اور سنگ تراشی نقاشی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں واقعات کی غلطیاں ہیں لیکن واقعات کا تسلسل اور پلاٹ کا خاکہ کہانی کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے جس نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ناول کے کردار اپنی شخصیت اور عملی سطح کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ عام آدمی اپنی زبان میں بات کرتا ہے اور شہزادہ اپنے درباری لہجے میں۔

صنعتی زادہ کرمانی

صنعتی زادہ کے والد حاجی علی الہ شاہی استبداد سے تنگ آکر 1901ء میں کرمان سے قسطنطنیہ چلے گئے وہاں سید جمال الدین اسد آبادی سے دوستی ہو گئی۔ انہوں نے علی اکبر کو انقلابی نشریات کی تقسیم کے لئے دوبارہ ایران بھیجا۔ مشروطہ خواہوں سے وابستگی رکھنے والوں کا برا حال تھا۔ علی اکبر کے کاروبار کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا لیکن آخر اس نے اپنی استقامت سے حالات بہتر کر لئے۔ اس نے ہنر سکھانے کے لئے یتیم خانہ کھولا اور صنعتی زادہ نے کتاب فروشی کی دکان کھولی۔ دس سال تک اس کی دکان چلتی رہی اور اس کی دکان شہر کے روشن فکروں کا مرکز بنی رہی۔ بعد میں

صنعتی زادہ تہران چلے گئے اور وہاں کپڑے کا کارخانہ لگایا اور شہر کے مشہور تاجر بن گئے۔

عبدالحسین صنعتی زادہ نے کافی تعداد میں تاریخی اور دوسرے موضوعات پر ناول لکھے ہیں۔ تاریخی ناولوں میں اس کا پہلا ناول 1921ء میں دام گستران یا انتقام خواصان مزدک کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں اس نے سلطنت ساسانی کے زوال اور عرب فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یزدگرد سوم کے ظالمانہ رویئے اور اقلیتوں کے خلاف اس کے مذہبی تعصب پر تبصرہ کیا ہے اس کے درباری مزدک کے حامی تھے اور خسرو کے ہاتھوں مزدک کے قتل کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ مصنف نے زردشتی موبدوں کے **متعصبانہ** اخلاق کی خوب مذمت کی ہے۔

دام گستران کی دوسری جلد تہران میں 1922ء میں شائع ہوئی۔ براؤن نے پہلی جلد میں بعض غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر دوسرا حصہ لکھا۔

صنعتی زادہ کا دوسرا تاریخی ناول داستان مانی نقاش ہے۔ اس میں تاریخی اور غیر تاریخی مواد مخلوط ہے۔ مانی چین جاتا ہے اور نقاشی سیکھتا ہے۔ وہ ایک لڑکی زاہدہ کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ شیر ببر کی گردن سے چابی حاصل کر کے ایک مندر سے خزانہ حاصل کرتا ہے اور شاہور کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اسفندیار کو شہنشاہ روم ویلرین کو قفس میں بند کرتا ہے۔ آخر مانی اور زاہدہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ ناول واقعات کے لحاظ سے دام گستران سے زیادہ متحرک ہے۔ پلاٹ بھی اچھا ہے اور غیر متوقع حوادث سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔

صنعتی زادہ کا تیسرا ناول **سلحشور** 1934ء میں شائع ہوا۔ اس میں حکومت ساسانیاں کے آغاز اور اس کے بانی اردشیرا اول کے احوال زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ پس منظر کے طور پر اردوان (209- 226 ع) آخری پارتھین بادشاہ کے عہد حکومت کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔

صنعتی زادہ کا ایک اور تاریخی ناول 1945ء میں شائع ہوا۔اس کا موضوع ظالم حکمرانوں کے خلاف ایرانی ہیرو کی بغاوت ہے۔ یہ ابو مسلم خراسانی کی داستان ہے جس نے بنو امیہ کے خلاف بنو عباس کی حمایت کی۔ بعد میں ہردلعزیزی و شہرت کی بناء پر وہ منصور عباسی کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ناول میں ابو مسلم کو ایران اور اسلام کا ممتاز سربرآوردہ شخص پیش کیا گیا ہے۔ وہ اکثر اپنی کہانی کے پیش نظر حقیقی واقعات کو نظرانداز کر جاتا ہے۔

صنعتی زادہ نے ایک اور ناول نادر فاتح دہلی کے عنوان سے 1957ء میں شائع کیا۔ اس کے دو اور تاریخی ناول جو شائع نہیں ہوئے ایک یزدگرد سوم کے جانشینوں کے متعلق مادر غمزدہ کے

عنوان سے موجود ہے۔ دوسرا ناول مرزا محمد علی باب اور عبدا بہا سے متعلق ہے۔

صنعتی کے غیر تاریخی ناول مندرجہ ذیل ہیں۔

-1	چگونہ ممکن است متمول شد	1938
-2	رستم در قرن بیست دوم	1935
-3	عالم ابدی	1938
-4	مجمع دیوانگان	(دو جلد)
-5	فرشتہ صلح یا فتانہ اصفہان	1903

دیگر تاریخی ناول نگار

کمالی، حیدر علی

مظالم ترکان خاتون

افسانہ تاریخی لازیکا

حنیلی، محمد علی

دختر کورش

نگارستان خون

بہرام گور

مسرور، حسین سخن یار

داستان تاریخی محمود افغان

دہ نفر قزلباش

قوران یا سرگذشت لطف علی خان زند

مدرسی، ابراہیم

پنجہ خونین
عروس صائن

سعید نفیسی

آخرین یادگار نادر
یزد گرد سوم
بابک خرم دین، دلاور آذر بائیجان
سرگذشت طاہر بن حسین

صغریٰ، رحیم زادہ

داستان شہربانو
یادداشتہای خسرو اول
بیژن و منثیرہ

سماجی ناول نگار (iii)

نئے ناول نگاروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں جن کے ناولوں میں اجتماعی مباحث شامل ہیں۔

بہمن شعلہ ور	سفر شب	1345 فش

زکریا ہاشمی	طوطی	1348 فش
سیمین دانشور	سووشون	1348 فش
جمال میر صادقی	درازنای شب	1349 فش
اسماعیل فصیح	دل کور	1353 فش
محمود گلابدرہ ای	پرکاہ	1353 فش
احمد محمود	ہمسایہ ہا	1353 فش
ہوشنگ گلشیری	برۂ گمشدہ راعی	1356
احمد سکائی	باید زندگی کنیم	1356
شرنوش پارسی پور	سگ و زمستان بلند	1357 فش
محمود دولت آبادی	کلیدر	1357 فش
اصغر الہی	مادام بی بی جان	1357 فش
ناصر شاہین پر	سالہای اصغر	1357 فش
ہرمز شہدادی	شب ہول	1357 فش

محمد حجازی

مطیع الدولہ محمد حجازی سال 1900 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید نصراللہ ایک فاضل و دانا شخص تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اپنے زمانے میں حکومت کے مقتدر اشخاص میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ محمد حجازی کی والدہ ہما خانم بھی ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ سید نصراللہ کے چھ بچے تھے۔ چار بیٹے محمد حجازی حسن، احمد، محمد علی اور دو بیٹیاں خدیجہ اور عذرا محمد حجازی ان میں سب سے بڑے تھے۔

محمد حجازی نے ابتدائی تعلیم تو اپنے والد سے حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر تک مدرسہ ہدایت میں پڑھے۔ اس کے بعد تہران میں میں کیتھولک سکول میں تعلیم جاری رکھی۔ فراغت کے بعد 1920 میں ڈاک اور تار کے محکمہ میں ملازم ہوگئے۔ 1925ء میں انہیں وظیفہ ملا تو وہ ریڈیو انجنیئرنگ کی تعلیم کیلئے فرانس گئے لیکن ان کی طبیعت آرٹ اور ادب کی طرف زیادہ مائل تھی۔

وہ یورپ میں تقریباً 9 سال تک مختلف مضامین پڑھتے رہے۔ تہران میں واپسی پر وہ محکمہ مالیات میں تبدیل کردیئے گئے اور بعد میں محکمہ تعلقات عامہ اور پریس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 43-1941ء میں "ایران امروز" ایک ماہوار مجلّہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور دوسرے ادبی مضامین بھی لکھتے رہے۔ انہی خدمات کی بنا پر وہ نائب وزیراعظم کے عہدے پر بھی فائز ہوئے مجلس سنا کے رکن بھی رہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران میں حجازی دہلی میں مقیم تھے اور فارسی زبان میں سیاسی پروپیگنڈا کے مہتمم تھے۔

حجازی انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان اور رستاخیز زنان کے صدر رہے اور خاموشی سے سیاسی اور ملی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1974ء میں فوت ہوئے۔

تصانیف

افسانہ و ناول

1- آئینہ 2- ہما 3- **پریچہر** 4- ساغر 5- زیبا (2 جلد) 6- پروانہ 7- آہنگ 8- سرشک 9- راز نہاں 10- اندیشہ 11- نسیم

مجموعہ داستان و مقالات 1339

تمثیلات

1- مادر شوہر مہربان 2- محمود آقا را وکیل کیند 3- مسافرت قم 4- حافظ و صاحب عیار 5- عروسی فرنگی۔

ترجمے

عیش پیری و راز دوستی از سیسرون، رشد شخصیت ازہ۔ شاختر۔ سلامت روح، ہاری ویونارو

راستریت۔ شاو کامی از جان بی گائل۔ حکمت ادیان، جوزف کنیز، رویا از فروید۔

متفرقات

میہن ما 776 صفحہ، موضوع اطلاعات تاریخی، ادارہ انتشارات وزارت فرہنگ 1339

ہزار سخن۔ تلگراف بی سیم

خلاصہ تاریخ ایران تا انقراض قاجاریہ 1335 ش

حجازی بڑی سرشار روح کے مالک ہیں۔ وہ سوز اور عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں اور تخیلی نقوش کو اپنے سوز دروں سے آراستہ کرکے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے والے کے دل میں ایک حسین خیال ایک فکر اور ایک چبھتی ہوئی آرزو چھوڑ جاتے ہیں۔ حسن و محبت کی تخیلی داستانیں ان کی نثر کے وہ حسین پارے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں۔

حجازی عشق و محبت کے رموز کو سمجھتے ہیں۔ عاشقوں اور معشوقوں پر عشق کی راہ میں جو کیفیات گزرتی ہیں وہ ان کو خوب جانتے ہیں۔ ان کے رومانوی افسانوں میں یہ عنصر غالب ہے۔ وہ قصہ کو اس دلچسپی اور سوز سے بیان کرتے ہیں کہ دل پر واردات کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔" بابا کوہی، گیتی، مناجات" اس حیثیت سے ان کی بلند پایہ کہانیاں شمار ہوتی ہیں۔

عشق کے متعلق ان کا نظریہ بڑا خوش آئند اور دلکش ہے وہ لکھتے ہیں "وہ دل جس میں عشق ہے سدا بہار ہے۔ عشق سے بھرا ہوا دل رکھنے والا انسان جہاں کہیں بھی ہے۔ گویا وہ باغ و چمن میں ہے وہ سر جو عشق و شوریدگی سے خالی ہے۔ اگر بہشت میں بھی ہو تب بھی وہ بزنجیر ہے" (آئینہ ص 48) "عشق درد سر کا نام نہیں۔ عشق تو بہشت عطا کرتا ہے یعنی اگر دو شخصوں نے ایک دوسرے سے عشق کیا تو گویا ان کی زندگی بہشت میں تبدیل ہوگئی۔ وہ لوگ جو محبت میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ وہ دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں" (ص 321)

حجازی صاحب اگرچہ شاعر نہیں لیکن ان کی نثر شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے وہ جہاں کہیں قدرت کا دلفریب منظر دیکھتا ہے ان کے جذبات لطیف کی تاروں میں ایک جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے اور ان کے قلم سے شاعرانہ تخیل کے نقوش بکھرنے لگتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے "شعر نہ کہنا شاعر ہونے کی دلیل نہیں۔ ہمیں اکثر روحیں ایسی ملیں گی جنہوں نے عقل و نیکی کے سرچشموں

سے پانی پیا ہے وہ حسن و زیبائش سے سرشار ہوکر معنوی لذائذ سے بھی مست ہوئی ہیں لیکن انہوں نے ایک شعر بھی نہیں کہا" (ص 333)_ ان کے خیال میں شاعری ہنر نہیں بلکہ اصل شاعری تو یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی روح موجود ہو جس میں شوریدگی' وارفتگی' نزاکت اور نرمی ہو (ص 346) ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدائے متعال نے حجازی کو بھی ایسی ہی روح عطا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں جس کا دل سوز عشق سے خود نہیں جلا وہ دوسروں کا جلنا کیسے دیکھ سکتا ہے (ص 439) لکھنے والا یعنی مصنف ایک شوریدہ عاشق ہے جو سوز دل سے راگ الاپتا ہے۔ فریاد کرتا ہے اور پھر لکھتا ہے۔

حجازی کی طبیعت میں ایک حسین توازن ہے۔ وہ افراط و تفریط سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر اجتماعی فساد و خرابی کو واضح کرکے وہ ایک مدبر راہنما کی طرح راہ مستقیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انسانی قلب و دماغ کے گوشوں پر ان کی نظر ہے۔ وہ بلند اخلاق کی تلقین کرتے ہیں۔ جہاں کہیں انہیں برائی اور پلیدی نظر آتی ہے وہ دوسروں کو اس کے متعلق نکتہ چینی سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر تم اپنے وجود میں دیکھو تو تمہیں اس سے بھی زیادہ برائی اور پلیدی نظر آئے گی۔ اس لئے دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کا جذبہ سب سے زیادہ کارفرما ہونا چاہئے۔

ان کے دل میں نوع انسانی کا درد ہے وہ زمانے کے ستائے ہوئے اور اقتصادی ناہمواریوں کے روندے ہوئے پست حالوں پر اپنی دردمندی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی اصلاح اور خوشحالی کیلئے جدوجہد کرنے کیلئے بھی تبلیغ کرتے ہیں مثلاً "مناجات" میں جب مہ لقا اور سید احمد کے عشق کا حال انہیں معلوم ہوتا ہے تو ان کی شادی میں رکاوٹیں دور کرنے کیلئے عملی اقدام بھی کرتے ہیں تاکہ دو تڑپتے ہوئے دل شاد ہو سکیں۔

ان کے فلسفہ اخلاق میں رجائیت ہے وہ زندگی کی مشکلات پر قابو پانا دشواریوں سے مقابلہ کرنا سکھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے مزاحمات سے گھبرا کر خودکشی کرنا بزدلی ہے (افسانہ خودکشی) دل کو ہمیشہ آرزو سے آباد رکھو۔ آرزوؤں کے تعاقب میں ہی مسرت ہے۔ آرزو کی تحصیل میں نہیں (ص 412) روح یعنی خواہش زیست کو موت نہیں آتی۔ موت طبعی اور حقیقی نہیں ہے۔ یہ ہمارے حواس کا دھوکہ ہے۔ (ص 368) قدرت میں قانون نہیں ہے۔ قدرت کا قانون ہماری خواہش اور ہمارا ارادہ ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ مادی یا معنوی جس قسم کی خواہش بھی ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ وجود میں آنے کے قابل ہے۔

حجازی فنون لطیفہ کے شیدائی ہیں۔ ان کی نگاہ میں "نیکی و جمال بہرصورت کہ درآمد خوب و

پرستیدنی است" (ص 148) اور ہنرہای زیبا کی پرورش انسان کا سب سے بڑا ہنر ہے۔ روح کی تربیت صرف فنون لطیفہ کی برکت سے ہے۔ وہ عورت جس کی روح ان نازک اور لطیف فنون کے احساس سے آراستہ ہے وہ باغ بہشت ہے رنج و بیزاری اس باغ میں راہ نہیں پاتے (آئینہ ص 319)_

آئینہ

ان کے مختصر مضامین اور کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ اپنے تنوع موضوع کے اعتبار سے واقعی وہ ایک حسین مرقع ہے۔ اپنے نام کے اعتبار سے بھی وہ اجتماعی اور معاشرتی حالات و کیفیات کا آئینہ ہے۔ شعر و شاعری، حافظ و سعدی، فردوسی اور نقادی سے لیکر قسمت، رنگا رنگئی تقدیر، شیطانی مکرو فریب، انسانی ملکوتی نیکی و شرافت، اخلاقی پستی، عورتوں کی جہالت و زبوں حالی، قومی رہنماؤں اور سیاست بازوں کی عیاری، غرض انسان کردار کے اکثر شعبوں پر خیالات کا اظہار کیا ہے چند ایک خاص علمی و ادبی مضامین ہیں۔ مثلاً معالجہ امراض روحی، مورچہ شناسی، کشف ادبی، زن، ہنرھای زیبا اور شعر وغیرہ۔

عموماً کہانی لکھنے میں ان کا یہ انداز ہے کہ پہلے وہ عنوان قصہ کے متعلق اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر ان کی وضاحت میں ایک واقعہ یا ایک قصہ بیان کرتے ہیں مثلاً خودکشی، آسائش زندگی، تنبلی " نیکی، درس عبرت وغیرہ کی کہانیاں دیکھئے۔ ان کی لمبی کہانیوں میں البتہ یہ روش موجود نہیں۔ شروع سے ہی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں پلاٹ کی پیچیدگیاں نہیں۔ سیدھے سادے روزمرہ کی زندگی کے واقعات ہیں۔ عشق کی داستانیں ہیں اور ان کے عبرت ناک نتائج ہیں۔ طویل کہانیوں میں سے "مناجات، بابا کوہی، قسمت اور گیتی" ٹیکنیک کے اعتبار سے اچھی کہانیاں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں سے "دو گدا، پزشک چشم، کتاب فروش وغیرہ اپنے اختصار کے باوجود اپنے اندر ایک عبرت کا سامان رکھتی ہیں۔

ان کہانیوں میں کردار کی گہرائی نہیں اور نہ ہی کسی شخصیت کا گہرا تجزیہ ملتا ہے۔ البتہ انسانی طبیعت کا ایک نہ ایک پہلو تو اکثر کہانیوں سے نمایاں ہے۔ "دو رفیق" میں ایک ہوس ران عورت کی ہرجائیت اور بے وفائی کو واضح کیا ہے اور "قسمت" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عورت کے جذبہ رشک و رقابت کی وجہ سے زندگی کی خوشگواریاں تلخیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ان کی

اکثر کہانیاں المیہ ہیں۔ سب جگہ ایک ناگوار انجام یا موت کا ذکر ہے۔ ان کو پڑھ کر ہمارا دل انسانی دکھ درد سے آشنا ہوتا ہے۔ سماج کی جن خرابیوں کی وجہ سے زندگی میں ناخوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات تو پیدا ہوتے ہیں لیکن احساسات میں تندی و تیزی نہیں آتی۔ جذبہ حقارت پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ کاش ان خرابیوں کی اصلاح ہو جائے اور پھر یا یہ خیال آتا ہے کہ انسانی فطرت ہی ایسی ہے جب تک یہ دنیا ہے زندگی میں تلخیاں پیدا کرنے والے حوادث واقع ہوتے رہیں گے۔ ان کہانیوں میں ان کی شخصیت نمایاں ہیں وہ اکثر اشخاص قصہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور اکثر صیغہ واحد متکلم میں لکھتے ہیں۔

حجازی صاحب کی نثر بہت خوب ہے۔ چھوٹے چھوٹے سیدھے سیدھے جملے لکھتے ہیں۔ ترکیب میں کہیں پیچیدگی اور ابہام نہیں ہوتا۔ بلا کی سادگی اور بلا کی معنی خیزی ہے جملوں کے دروبست میں توازن ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ مترادفات کے معانی تشخیص کرکے موزوں سے موزوں الفاظ استعمال کرتے ہیں "کتاب نعت" میں ان کی اس محنت کی طرف اشارہ ملتا ہے ملک الشعراء محمد تقی بہار نے ان کی نثر پڑھ کر لکھا تھا کہ "بسادگی طفولیت و برونت شیخوخت" ہے۔ ان کی نثر میں وہ چیز موجود ہے جسے لوچ، گھلاوٹ اور شیرینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی نثر شعر سے زیادہ رقیق ہے۔ بعض بعض جملے تو وزن میں ڈھلے ہوئے مصرعے ہیں۔ ان کا اسلوب بڑا واضح ہے اس میں سوز و اخلاص ہے اور مجموعی طور پر اس میں لطیف آہنگ محسوس ہوتا ہے۔

ہما

حجازی کا ایک نفیس اور کامیاب اجتماعی اور اصلاحی ناول ہے۔ کہنے کو تو وہ حسن علی خان اور ہما کی بے لوث محبت کی داستان ہے جس کی بنیاد ہم خیالی اور ہم فکری پر قائم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اندھے عشق کی بے راہ روی اور ہوس و شہوت سے آلودہ محبت کی اندھیر گردی بھی نمایاں ہے۔ اجتماعی خرابیوں کا بھی مناسب ذکر ہے اور ان کی درستی اور اصلاح کے متعلق بھی مذاکرات درج ہیں۔ بے ایمان وطن فروشوں کی غداری، ہتاکی اور بہتان طرازی، اخباروں کی غیر جانبدارانہ روش ملاؤں کی ہوس، ماں باپ کی جہالت اور دختر فروشی، ان دیکھی شادیاں، شادیوں میں جہیز کی فضول رسم پر بھی بحث ہے۔ آخری حصے میں روسی اور ایرانی تعلقات کا ذکر ہے

روسیوں کے تحکم و تسلط اور ایرانیوں کی بے چارگی اور کمزوری کو نمایاں کیا گیا ہے اور ضمناً بین الاقوامی تعلقات، باہمی تفاہم، آزادی اور انسانیت کی بقا اور پرورش پر ایک معقول اور استوار سیاسی مسلک کو پیش کیا گیا ہے۔ اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی مسائل پر مصنف کے معقول خیاالات اور نظرات قابل صد ستائش ہیں۔

ہما کی کہانی نہایت دلکش ہے۔ کتاب کے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ پڑھنے والا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ کہانی میں جتنے بھی موڑ آتے ہیں۔ گمان ہوتا ہے اب کہانی ختم ہوئی کہ ہوئی۔ اضطراب و تعطل اس کہانی کی جان ہے۔ پلاٹ اس قدر کامل ہے کہ کہیں الجھاؤ یا خامی نظر نہیں آتی۔ ہر منظر کی معقول توجیح موجود ہے۔ جس واقعہ یا جس بات کا بھی ذکر کیا ہے اس کو ناتمام نہیں چھوڑا بلکہ بعد میں کردار قصہ پر اس کا اثر واضح کیا ہے۔ اگر دو شخصوں میں تیسرے شخص کے متعلق بات چیت ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت متکلمین کی نگاہوں میں پست اور حقیر ہوگئی ہے تو بعد میں کسی نہ کسی وساطت سے اس تیسرے شخص کو اس گفتگو کا ضرور علم ہوا ہے اور کہنے والے کے متعلق اس کے تاثرات نے نئی راہ اختیار کرلی ہے۔ کہانی کے پلاٹ کو اس طرح جزئیات کے ساتھ پیوست کیا ہے کہ اشخاص قصہ کے کردار ابھرتے آتے ہیں۔

مصنف نے ہما اور حسن علی خاں کا آئیڈیل کردار پیش کیا ہے۔ ہما ننھی بچی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس نے اپنے باپ کے دوست حسن کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے مزین ہوئی۔ ذہنی اور قلبی تہذیب سے آراستہ ہوئی۔ اس کو ایک آراستہ پیراستہ خوبصورت نوجوان سے عشق ہوا اور شادی کی تیاریاں ہوئیں تو اسے اپنے محسن کی محبت اور اس کی دکھیا زندگی کا بھی علم ہوا۔ اس نے فرض دوستی اور عشق کی کشمکش میں اپنے متلاطم جذبات پر قابو پایا۔ عشق کے تھپیڑوں نے، اس کو بار بار متزلزل کیا مگر آخر دم تک اس کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ حسن علی خان نے شادی کی اجازت بھی دے دی لیکن جب اس کو منوچہر کی دروغ گوئی بے شرافتی اور فریب کا پتہ چلا تو اس نے جرات مندی سے عشق کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا اور بڑی حوصلہ مندی سے مصائب کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا۔ حسن علی خاں 38 برس کو پہنچا تھا۔ وہ ہما کے باپ کے بجائے تھا۔ اس کی اپنی زندگی دکھیا تھی۔ گھر میں جاہل ناکارہ بیمار بیوی تھی۔ وہ ہما کے باپ کے بجائے تھا۔ وہ ہما کی شخصیت میں اپنی زندگی کی خوشحالی دیکھتا تھا۔ اس کو ہما سے عشق تھا لیکن وہ اپنی خودغرضی کیلئے دو نوجوانوں کی

زندگیوں کو بدحال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر ان کی شادی کیلئے رضامندی کا اظہار کیا۔ اپنی بیوی مرگئی اور اپنی شادی کی رکاوٹ بھی دور ہوگئی لیکن اس نے پھر بھی نوجوانوں کے بھرپور عشق کے سامنے اپنے کو ناقابل سمجھا۔ اس نے اپنی عزت و شرافت کو برقرار رکھا۔ وہ سراپا ایثار تھا۔ اس نے سخت سردی میں اپنا کوٹ بیچ کر ہما اور اس کی ماں کا ماہانہ ادا کیا۔ وہ بڑے بلند کردار کا مالک تھا۔ منوچہر کا کردار بھی واضح ہے وہ اپنے عشق سے مجبور ہوکر اپنے رقیب کو راستے سے ہٹانے کیلیے ہر غیر انسانی حربے کا استعمال کرتا ہے لیکن چونکہ حساس ہے اس لئے بعد میں اپنے اعمال پر شرمندہ ہوکر پشیمان ہوتا ہے اور نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ شیخ حسین اس ناول کا بدکردار ہے جو دولت کی خاطر وطن فروش ہے اور جنسی تسکین کی خاطر بے گناہ اور شریف انسانوں کی بربادی سے بھی اس کا دل نہیں پسیجتا۔ باقی کردار ضمنی ہیں۔

حجازی نے یہ ناول لکھ کر ایران اور ایرانیوں کی بہت بڑی خدمت کی۔ کاش ہر جوان حسن علی خان اور ہر نوجوان عورت ہما بنے۔ دونوں کے کردار معاشرے کیلئے تمثیلی کردار کا حکم رکھتے ہیں۔

پریچہر

ایک نامراد عاشق شوہر کی داستان ہے جس نے ایک عورت کے حسن و انداز پر فریفتہ ہوکر اس کو رفیق زندگی بنالیا اور اپنی روح کو عیش و کامرانی میں غرق کردیا لیکن وہ اس عورت کے دل کی کیفیات سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کے جذبات بے لگام تھے وہ صرف مادی اسباب کی خواہش مند تھی اور ہوس و شہوت کی تسکین کا سامان چاہتی تھی وہ ملکہ بن کر حکم لگانا چاہتی تھی۔ وہ ایک جابر آزاد مرد کی تلاش میں تھی۔ علی جیسا کمزور رقیق دل آدمی اس کیلئے مناسب نہیں تھا۔ اس لئے وہ چھپے چوری دوسروں سے راہ و رسم رکھتی تھی۔ وہ اپنے پرانے آشنا سے جا ملنے کیلئے علی کو مشہد لے جارہی تھی کہ وہ راستے میں ترکمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ علی نے صحرا میں ان بے رحم وحشیوں کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھائی۔ اس نے ڈھونڈ تو لیا لیکن وہ ایک اور ترکمن سردار کے نوجوان تنومند بیٹے کے پاس مقید تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے دغا کی۔ آخر علی کے ہاتھوں دونوں مارے گئے۔ ضمناً ترکوں کے اعمال و کردار کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی ایک انگریز کا ذکر ہے جو سرفراز خاں کے بھیس میں روسیوں کے خلاف

ساز باز کرتا پھرتا ہے۔ یہ کہانی بھی اچھی خاصی دلچسپ ہے۔ ہم کہانی کے آخر تک علی اور پریچہر کا انجام جاننے کے منتظر رہتے ہیں۔ بیان کرنے والا خود وہ شخص ہے جس پر تمام حوادث گزرے ہیں اس لئے پلاٹ میں و! قعیت آگئی ہے۔ وگرنہ شبہ ہوتا کہ آج سے پچیس سال پہلے کیا خراسان کو جانے والے راستے اس قدر غیر محفوظ اور غارت و تاراج کی آماجگاہ تھے۔ یہ ناول پہلے پہل 1308 ہجری شمسی میں چھپا تھا۔

اس ناول کے کردار اہم نہیں۔ علی کے سوا کسی اور کے کردا!ر میں ارتقاء نہیں۔ پریچہر جس طرح کہانی کے آغاز میں عیاشی کی دلدادہ تھی آخر تک ویسی ہی رہی۔ وہ ہرجائی رہنا چاہتی تھی۔ آخر تک ہرجائی رہی۔ علی خاں کا دوست فریدوں حسن سیرت اور حسن کردار کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جن خصوصیات کے ساتھ اس کا تعارف کرایا گیا تھا وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ انہیں خصوصیات کا اظہار کرتا رہا۔ صرف علی کا کردار ہی حوادث کے صدموں کے ساتھ تغیرپذیر ہوتا رہا۔ وہ عشق کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس نے آخر تک اپنے عشق کے خلوص پر اعتماد کیا۔ وہ عشق و وفا کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر جب حسن بے وفا نکلا تو اس نے مایوس ہوکر اس کی جان لے لی۔ اپنے عشق کی خاطر اپنی جان پر کھیلنے والے فدائی کہیں نہ کہیں اس دنیا میں مل سکتے ہیں۔

مصنف نے اس افسانہ سے اپنے نظریہ کی تشریح کی ہے کہ عشق دوستی کے بغیر کامل نہیں ہوسکتا (ص 17) اگر عشق نہ ہو تو دل کی آبادی ویران ہوجاتی ہے لیکن اگر عشق غلط جگہ پڑ جائے تو وہ گھر برباد ہوکر رہتا ہے۔

حجازی کی قوت بیان زبردست ہے وہ اپنے حسن بیان کے بل پر پڑھنے والے کو کردار قصہ کے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے اور اس کو حوادث میں شریک بنا کر غم والم کی کیفیت طاری کرتا ہے اور یہ قوت بہت کم مصنفوں کو نصیب ہوئی۔

زیبا

حجازی کا ایک طویل ناول ہے جو 1327 ہجری شمسی میں شائع ہوا۔ یہ ایک ایسے شخص کی سرگذشت ہے جو غریب ماں کا بیٹا تھا۔ ذہین تھا۔ علم دین حاصل کرنے تہران پہنچا۔ وہاں ایک فاحشہ کے دام فریب میں گرفتار ہوکر زہد و اتقا ضائع کر بیٹھا۔ اس کی وساطت سے وزارت خانہ

میں ملازم ہوا۔ پھر برطرف ہوا۔ سیاست دان بنا۔ اخبار نکالا اور بعد میں صاحب ثروت و اثرورسوخ بنا۔ مصنف نے بتایا ہے کہ وہ جیل میں بند تھا تو اس نے اپنی یہ آپ بیتی اپنے وکیل مدافعت کو پڑھنے کیلئے دی۔ کہانی کو یہ صورت دینے سے اس پر غیر حقیقی ہونے کا اعتراض وارد کرلیا ہے کیونکہ بعض روز بروز کے واقعات اس قدر جزئیات سے بیان کئے گئے ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات کو اس تجزیہ سے بیان نہیں کرسکتا۔ یہ تمہید نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔

مصنف نے قرن بیستم کے اوائل یعنی مشروطہ سے قبل کا ایران اس ناول میں مجسم کر دیا ہے۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اور حاجی بابا اصفہانی کی طرح اس میں بھی ایران کی اجتماعی سیاسی اور اخلاقی حالت کو پوست کندہ بیان کیا ہے۔ دفتروں اور وزارت خانوں میں کلرکوں اور افسروں کی نالائقی' بے پروائی' رشوت ستانی' اقربا نوازی اور سیاسی عیاریوں کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی' اخبار نویسوں کی غیرذمہ داری' ہنگامہ پرور افراد کے ہاتھوں وزراء کی بے بسی کو واقعات میں سمو کر اجاگر کیا ہے۔

ناول کے دو بڑے کردار حسین خاں اور زیبا ہیں۔ حسین خاں کا کردار بڑا وسیع ہوگیا ہے کیونکہ اس کو زندگی کے گوناگوں حوادث سے پالا پڑا اور وہ عقل و دل کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ جوانی میں اس نے زہد و تقویٰ کی جو پونجی جمع کی تھی۔ وہ عشق و ہوس کی نظر ہوگئی۔ پہلے پہلے ہر برائی کے آغاز میں اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا تھا لیکن بعد میں یہ آواز مدھم ہوکر دبنا شروع ہوگئی۔ دل اپنی ہوس و شہوت کی تکمیل کیلئے جو خاکے بتاتا ہے عقل اس کیلئے اخلاقی جواز ڈھونڈتی ہے۔ حسین خاں بھی جب گناہ کے دلدل میں پھنس گیا تو اس کے دل و دماغ کی بھی یہی کیفیت ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں بڑے دردناک مظالم ہوئے۔ باپ بدحال مرا' ماں دیوانی ہوگئی' منگیتر آوارہ ہوئی' حاجی محمد حسین کی موت اور اس کے بچوں کی یتیمی' لیلیٰ اور دختر متانت السلطنتہ کی خودکشی اس کی بد عملیوں کا نتیجہ تھی۔ اس کے کردار سے ہمیں نفرت ہے لیکن ہمدردی بھی ہے کیونکہ کبھی کبھی اس سے اچھے کاموں کی توقع بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں ذاتی خوبیاں تھی۔ اگر اسے اچھا ماحول ملتا تو وہ بلند کردار شخص بن جاتا۔ زیبا ایک حسین ساحرہ اور ہوا و ہوس کی متوالا ہے۔ مصنف نے اس کو نسوانی عیاری اور شہوت رانی کا ایک کامل نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ بہترین ایکٹریس ہے۔ ماں' بہن' بیوی' محبوبہ اور بازاری عورت کا پارٹ ادا کرنے میں اس نے کمال کیا ہے۔ وہ آفت کی پرکالہ ہے اور فتنہ کی پڑیا ہے۔ اس کا حسن اس کے تمام عیوب پر پردہ

ڈالتا ہے۔ وہ ہرجائی ہے اور اپنی تسکین شہوت کیلئے نت نئے جوان ڈھونڈتی ہے۔ حسین خاں نے اپنا مقام بھی بنالیا لیکن جب اس سے جی بھر گیا تو غریب پرویز کے عشق میں دیوانہ ہوگئی۔ اس کا انجام اس کے کردار سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس ناول کے باقی سب کردار جزئی ہیں۔ اکثر چور، قاتل، عیاش، تریاکی، پرفریب سیاستدان اور سریع الاعتقاد نوجوان عورتیں، سادہ لوح، توہم پرست، دکھیا اور ظالم مردوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

کہانی دلچسپ تو ہے مگر یکساں واقعات کی تکرار سے ناول طویل ہوگیا۔ اس لئے پڑھتے وقت اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ پلاٹ میں بھی یکساں کشش نہیں۔ پہلے اور دوسرے حصوں کے اختتام پر قصہ لپیٹنے کی خاطر عجلت سے تمام متعلقہ کرداروں کے انجام سے باخبر کیا ہے۔

سرشک

حجازی کا ایک مقصدی ناول ہے جو انہوں نے جامعہ کی اصلاح کیلئے درد میں ڈوب کر لکھا ہے۔ ان کو شدت سے احساس ہے کہ نوجوان اپنی رفیقہ حیات کی تلاش میں کیا کیا معیار سامنے رکھتے ہیں اور جذبات سے مغلوب ہوکر کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور ان کی زندگی کس طرح تلخ، المناک اور جانسوز ہوتی ہیں۔ مصنف نے قصہ و کردار کی سرزمین امریکہ انتخاب کی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہاں نوجوان عورتوں اور مردوں کو اختلاط کے زیادہ مواقع ملتے ہیں اور ان کو زندگی کا ساتھی ڈھونڈنے میں زیادہ آزادی ہے اور وہ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جانچ اور پرکھ سکتے ہیں۔ ولیم ایک لائق خود دار، باوقار اور ہنر دوست انجنیئر کا بیٹا تھا اس کی ماں بھی حسین و جمیل مہربان و وفا شعار ہے۔ بیٹا جلال و جمال سے آراستہ، بلند قامت، شعر و موسیقی و مصوری کا شیدائی ہے۔ جوان ہوا تو حسینائیں پروانوں کی طرح اس کے شمع حسن پر قربان ہونے لگیں۔ سکول میں ہیلن اس پر فریفتہ تھی لیکن وہ اپنے ایک طاقتور حریف کے سامنے اس کو چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ کالج میں گیا تو الیس اس پر مرتی تھی لیکن وہ زروجواہر کی دلدادہ اور ذوق شعر و حس لطیف سے عاری تھی۔ ولیم بھی مائل تھا لیکن وہ غریب تھا اس لئے وہ اس سے کنارہ کش ہوگئی۔ ایک اور لڑکی ماؤلن سامنے آئی جو سنجیدہ، فہمیدہ، فنون لطیفہ کی فدائی اور نقاد تھی لیکن ظاہری حسن سے کم مایہ دار، ولیم کی ماں اس طرف راغب تھی لیکن ولیم کا دل حسن و زیبائی کیلئے تڑپتا تھا۔ آخر ولیم کو لیدا مل گئی جو چندے آفتاب اور چندے مہتاب تھی اور ساتھ ہی ہنر

دوست اور زیبا پرست۔ دونوں ایک دوسرے پر جان و دل سے فدا ہوگئے۔ شادی ہوگئی۔ بعد میں کھلا کہ لیدا بے حد حاسد و بدگمان ہے۔ وہ گوارا ہی نہیں کرسکتی کہ اس کا شوہر آنکھ بھر کر کسی اور عورت کی طرف دیکھے۔ اس نے ولیم کو مجبور کیا کہ وہ اس کے سوا کسی کے ساتھ رقص نہیں کرے گا۔ وہ کالج نہیں جائے گا تاکہ دوسری نوجوان عورتوں سے اس کا میل ملاپ نہ ہو۔ وہ بوڑھی عورتوں کے پاس بھی ٹھہرتا تو اس کی رگ حسادت پھڑک اٹھتی۔ اس نے مخفی پولیس کے سپاہی مقرر کر رکھے تھے جو ولیم کے متعلق روزانہ رپورٹ بھیجتے کہ وہ دن میں کہاں کہاں گیا اور کس کس سے ملا۔ شک و شبہ کی آگ نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا ولیم اپنی سچی محبت اور وفاداری کا یقین دلاتا لیکن اسے یقین نہ آتا۔ وہ ہر روز الجھتے لڑتے، چخ چخ ہوتی روتے کڑھتے جلتے۔ ولیم کی زندگی دو بھر ہورہی تھی۔ مارلن اس کا داغ محبت لئے ہوئے اپنے نامزد کے ساتھ سفر عالم کو جاچکی تھی لیکن داغدیدہ اب بھی اس کو آغوش محبت میں لینے کیلئے آمادہ تھی لیکن وہ لیدا کے سحر آفرین حسن میں اس قدر جذب تھا کہ چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ ماں کی قبر پر جاکر روتا۔ پھوپھی کے پاس فریاد کرتا وہ اپنے حریف عموزاد کے سپرد کرنے کو تیار ہوگیا لیکن اس کا رواں رواں لیدا کی محبت میں پیوست تھا۔ آخر لیدا کا بے پناہ جذبہ رقابت و حسادت رنگ لایا۔ اس نے ولیم کو سوتے میں بجلی کے ایک جھٹکے سے نور بینائی سے محروم کردیا۔ وہ قید ہوئی لیکن ولیم نے اسے معاف کردیا۔ وہ رہا ہوئی اور ساری عمر کیلئے اپنے معشوق کو اپنی عشق کی زنجیروں میں جکڑ لیا جن آنکھوں پر اسے شبہ تھا کہ وہ جدھر دیکھتی ہیں۔ اس کے رقیب عاشق پیدا کرتی ہیں۔ اس کے جہاں سوز عشق نے گوارا نہ کیا کہ اور بھی کوئی ان آنکھوں کو اس کے سوا کوئی چاہنے والا ہو۔ ساری کہانی درد و کرب و جذب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ محبتیں جڑتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں۔ دل تڑپتے ہیں اور مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ نوجوان عورتوں کے دل حسرتوں کے مزار ہیں۔ انہیں اپنے دل کا مطلوب و محبوب نہیں ملتا۔ ہر جگہ سوز و گداز ہے۔ روحیں عشق کی بھٹی میں جل رہی ہیں اور بھسم ہو رہی ہیں۔

اس ناول میں مصنف کے پیش نظر دو موضوع رہے ہیں۔ ایک تو صحیح رفیقہ حیات کا انتخاب، مصنف کا خیال ہے بیوی ہو تو مہربان، وفادار، خوش دل و نیک خو، اگرچہ وہ زیور حسن سے آراستہ نہ ہو۔ دوسرا بے جا و بے حساب حسد و رقابت کا عبرتناک انجام۔ مصنف کی آواز ولیم کی ماں کی آواز ہے جو فرشتہ محبت، ہمدرد اور مہربان ہے اپنے بیٹے کی خیر خواہ۔ آخری لمحوں تک اس کی خوشی کیلئے کام کرتی ہے اور جان دے دیتی ہے۔

مصنف کا مشورہ کھوکھلا وعظ نہیں بلکہ حقائق آشنا اور متوازن رائے ہے۔ اکثر کردار پیارے ہیں۔ ولیم کے بارے میں تو آپ سن چکے ہیں۔ وہ عشق و حسن، جذبہ و احساس کا پتلا ہے۔ ماں فرشتہ محبت، ماؤلن کوہ وقار، ہمدرد، سوز نہاں سے مالا مال، ہیلن سوز فراق شب کی جلی ہوئی، میچل، زن دوست، بے وفا، مال دار ہے۔ وقت پر رشتہ داروں کے کام آنے والا لیدا ہے۔ ایسی چنچل زیبا لیکن عقل کی پختہ، دھن کی پکی، وفا بھی چاہتی ہے اور دولت بھی۔ لیدا اور ولیم طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ باقی کردار ناسازگاری بخت و زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ صرف لیدا کی فطرت غیر معمولی ہے اور ناول کا یہی بنیادی کردار ہے۔ اس کا جنون حسادت زندگی کو المیہ بناتا ہے۔ کہانی کا شدت تاثر جامعہ اور اس کے افراد کیلئے عبرت کا سرمایہ بنتا ہے۔

شروع میں مصنف نے بتایا تھا کہ ولیم اور لیدا نے خود اپنی کہانی لکھی ہے۔ مضمون کے علاوہ ساری کہانی ولیم کی زبانی بیان ہوئی ہے اور اس میں تمام وہ واقعات آچکے ہیں جن کا لیدا کی زندگی سے بھی تعلق تھا۔ لیدا کا بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن زائد معلوم ہوتا ہے آخر میں مصنف نے ناصر حسین کی دوستی اور نامزدی کا حال بیان کرکے بتایا ہے کہ یہ کہانی میں نے ان کیلئے لکھی ہے۔ یہ بھی زائد ہے۔ کہانی تو تمام جامعہ کی اصلاح کیلئے ہے۔

ساغر

ساغر بھی آئینہ کی طرح حجازی صاحب کے نثری کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ علمی مضامین ہیں مثلاً دربزم حافظ وگوتھ، خط فارسی اور فرہنگستان اور کچھ ادب لطیف کے نمونے ہیں۔ مصنف کسی واقعہ سے متاثر ہوکر شاعرانہ تخیل سے کام لیتا ہے اور پھر اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کرتا جاتا ہے۔ مثلاً مشبی، باگل، چگونہ، شاعر شدم، سایہ گل، عیش پیری، وغیرہ چند ایک کہانیاں ہیں جو اپنے اندر ایک خاص نقطہ ماسکہ رکھتی ہیں اور پر سوز بیان کی وجہ سے اثری کیفیت کی حامل ہیں۔ آئینہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ہم نے حجازی صاحب کے اس خاص اسلوب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ساغر میں رشتی، آشیانہ محبت اور فرشتہ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کے مضامین مختصر ہیں۔ کتاب عام تقطیع کے 142 صفحوں پر مشتمل ہے۔ آئینہ میں حجازی صاحب شعری تخیل اور تفکر کی حیثیت سے بہت بلند ہیں۔ ساغر میں یہ سطح کچھ نیچے آگئی ہے اور نثر کی شگفتگی اور بیان کا خلوص بھی اس میں کمتر محسوس ہوتا ہے۔

مشفق کاظمی

مشفق کاظمی برلن میں قانون کے طالب علم تھے اور مجلّہ ایران شہر مجلّہ فرنگستان کے ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ ایران لوٹے تو کچھ مدت کیلئے "ایران جوان" کے مدیر رہے۔

تہران مخوف

تاریخ کے اعتبار سے یہ شاید پہلا ناول ہے جس میں ایران کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً محمد علی شاہ قاچار کے زمانہ سلطنت کے ان حالات پر روشنی پڑتی ہے جب دوبارہ اس کا استبداد بڑھ گیا تھا۔ انگریزوں کا اثر و رسوخ کم ہو رہا تھا اور روسی تسلط بڑھ رہا تھا۔ آزادی خواہوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ امراء کی حکومت تھی۔ عوام کا برا حال تھا پولیس، فوج اور حکومت کے اداروں میں رشوت اور سفارش کار فرما تھی۔ اخوند ملا، تاجر سادہ انسانوں کو فریب دیتے تھے۔ زنا، فحاشی اور زبردستی کا دور دورہ تھا۔ درد دل رکھنے والوں کیلئے راحت نہیں تھی۔ گویا تہران سہما ہوا تھا۔ یہ ناول انہی حالات و کوائف کا آئینہ دار ہے۔

یہ ناول چھ حصوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلے چار حصے تو ایران میں شائع ہوئے تھے۔ باقی دو 1942ء میں برلن میں چھپے۔ ناول کی مختصر کہانی یہ ہے کہ فرخ صورت و سیرت سے آراستہ ایک نوجوان ہے۔ اسے اپنی **پھپھیری** بہن مہین کے ساتھ بچپن سے محبت تھی جوان ہوئے تو مہین کے باپ نے اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر یعنی اسمبلی کا نمائندہ اور بعد میں وزیر بننے کی ہوس میں حکومت کے بااثر شخص کے بیٹے سیاؤش مرزا کے ساتھ بیٹی کا بیاہ کرنے کا عزم کرلیا اور دو نوجوانوں کے محبت بھرے دلوں کی پروا نہ کی۔ مہین کا ارادہ بدلنے اور شادی کیلئے بڑی تدبیریں کی گئیں مگر کوئی کارگر نہ ہوئی۔ آخر باپ نے لڑکی کو ماں کے ساتھ قم بھیج دیا تاکہ نئی فضا میں ماں کے سمجھانے بجھانے سے لڑکی اپنی ہٹ سے باز آجائے۔ فرخ کو پتہ چلا تو وہ اپنے نوکر اور عورت

کی مدد سے راستے ہی سے مہین کو اپنے ساتھ بھگا کر لے آیا۔ ماں نے تار دے کر باپ کو خبردار کردیا۔ باپ نے سپاہ کی مدد سے **شمیران** میں ان کو ڈھونڈ نکالا۔ نوکر گرفتار ہوا۔ اس کو چھ مہینے کی قید اور ایک سو کوڑے کی سزا ملی۔ فرخ نے دو سو تومان میں اپنا مکان گروی رکھ کر آقای حضرات کی سفارش سے تین ماہ کے بعد اس کو نجات دلائی۔ مہین کا بیاہ ہونے لگا تو اس پر بیماری کا حملہ ہوا اور ڈاکٹر نے یہ بھی بتلایا کہ وہ حاملہ ہے۔ شادی درہم برہم ہوگئی۔ مہین کو **شمیران** لے گئے جہاں اسے لڑکا پیدا ہوا اور وہ خود جاں بحق ہوئی باغی قیدیوں کا ایک قافلہ شمال میں کلات میں قید کرنے کیلئے جارہے تھے۔ مہین کے باپ نے نگران سپاہیوں اور افسر کو ملکر فرخ کو بھی قید کرادیا۔ اور اس کو بھی برف باری کے زمانے میں بے بس قیدیوں کے ہمراہ لے گئے۔ راستے میں ایک قہوہ خانے میں ٹھہرے تو گاؤں کے ایک شخص نے نوجوان کی حالت پر رحم کھا کر اس کو بھگا لے جانے میں مدد دی اپنے گاؤں لے جاکر کھیتی باڑی کرنے میں شریک کیا۔ شناسائی کے بعد جب باد کوبہ میں منشی کی حیثیت سے گاؤں کے مالک کا تقرر ہوا تو اس نے فرخ کو اپنی امداد کیلئے نوکر رکھ لیا۔ اسی شہر میں وہ انقلاب پسندوں کی جماعت سے آشنا ہوا۔ اور اس نے ان کا ساتھ دینے کا حلف اٹھایا لیکن جب معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض جذبہ وطن پرستی اور آزادی خواہی کے علاوہ مال و دولت اور تاخت و تاراج کو اپنا منتہائے نظر بنائے ہوئے ہیں تو وہ ان سے الگ ہوگیا اور پھر روسی قزاقوں کی فوج میں شامل ہوکر ایک افسر بن گیا۔ مازندران میں فتوحات کے بعد وہ قزوین میں آیا۔ وہاں سے تہران میں داخل ہوکر پولیس اور دوسرے فوجی مرکزوں پر اس نے قبضہ کرلیا۔ اب اس کو انتقام کے مواقع میسر آئے۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ وفات پا چکی ہے لیکن اس کا لڑکا زندہ ہے۔ جب وطن کے دشمنوں اور ستمگروں کی گرفتاریاں ہوئیں تو فرخ کو بھی اپنے اور اپنے دوستوں کو گرفتار کرنے کی اجازت ملی۔ اس نے مہین کے باپ کو گرفتار کیا اور دوسرے ان اشخاص کو جو اس کی تباہی کے ذمہ دار تھے، جیل میں ڈال دیا۔ ان میں سے ایک شخص علی اشرف خاں تھا جو اصفہان میں دفتر محاسبات میں افسر تھا۔ وہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں کی وجہ سے برطرف ہوکر تہران میں آگیا تھا اور مرکز سے توسل ڈھونڈ کر نیا عہدہ پانے کی فکر میں تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیکر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ بیچاری کسی دلالہ کے ہتھے چڑھ کر قحبہ خانے میں پھنس گئی تھی۔ ایک رات فرخ ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک مکان سے چیخ و پکار سن کر اس میں داخل ہوا۔ پولیس کا ایک بدمست سپاہی فواحش اور ان کے یاروں کے ساتھ گتھم گتھا ہوگیا تھا۔ اس نے چھرے سے دو ایک کو زخمی بھی کردیا تھا۔ فرخ نے سپاہی کے ہاتھوں

سیاؤش مرزا کی جان بچائی جو مہین کا شوہر بننے والا تھا۔ فرخ ایک معصوم لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ یہ عفت تھی علی اشرف خاں کی بیوی۔ لڑکی نے ہوش سنبھالا تو اپنے ماں باپ کا اتا پتا بتایا۔ وہ فرخ کے باپ کے دوستوں میں تھے اور اپنی لڑکی کے حالات سے بے خبر تھے۔ وہ فرخ کے ممنون ہوئے۔ اس عفت کو بھی کی فرخ مغموم زندگی کا حال معلوم ہوا۔ فرخ کے غائب ہوجانے کے بعد وہ مہین کی والدہ سے آشنا ہوچکی تھی۔ مہین کی وفات کے بعد بچے کو پیار کرتی رہی اور فرخ کے متعلق اپنے دل میں جذبہ محبت کی پرورش کرتی رہی آخر جب فرخ چار سال کے بعد تہران لوٹا تو عفت کے دکھ بھرے اور محبت بھرے دل میں ہی اس کے اپنے دکھیا دل کو سکون ملا۔ عفت سے ہی فرخ کو اس کے شوہر اور خاندان کے دوسرے افراد کا پتہ چلا تھا۔ علی اشرف خاں کا ایک بھائی علی رضا خاں عدالت میں جرائم کی تفتیش کرنے پر مامور تھا۔ فرخ کے نوکر جواد کا مقدمہ اس کے سپرد تھا۔ فرخ نے "شیرہ خانہ" سے علی اشرف کو تلاش کرکے اس کی بد عملیوں پر تنبیہہ کرکے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے بھائی سے سفارش کرے تاکہ جواد پر جھوٹا مقدمہ نہ کھڑا کیا جائے اور اس کو قید خانے سے رہا کیا جائے۔ اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی خطاؤں سے درگزر کرکے عفت تمہیں دوبارہ واپس ملا دی جائے گی لیکن اس نے فرخ کو دھتکار دیا۔ آخر جب فرخ فوجی افسر بن کر تہران واپس آیا تو علی اشرف کو بھی جیل میں بند کیا اور اس کے بھائی علی رضا خاں کو بھی۔ فرخ نے سیاؤش مرزا کے باپ کو بھی قید کیا۔ سیاؤش مرزا اپنی بدمعاشیوں کی وجہ سے فاحشہ خانوں میں کئی مرتبہ زخمی ہوا اور بیمار ہوا۔ آخر ڈاکٹر کے مشورہ سے اس کو یورپ بھیج دیا گیا۔ اگرچہ فرخ نے قحبہ خانے میں اس کی جان بچائی تھی اور اس نے احسان کا بدلہ اتارنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن جب فرخ نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ مہین کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کردے تو اس نے دیوانہ کہہ کر اس کی درخواست کو مسترد کردیا تھا اور اس نے اپنے دوست کی وساطت سے فرخ کو باغی قیدیوں کے ہمراہ گرفتار کروا دیا تھا۔ فرخ نے اس کو قید نہ کیا۔ ایک اور شخص حاجی مہدی تاجر کو بھی اپنے کرتوتوں کی سزا ملی۔ یہ صاحب وہ تھے جنھوں نے فرخ کو قرض دیکر مکان کا ایک حصہ گروی رکھ لیا تھا۔ جب فرخ غائب ہوگیا تو میعاد گزر جانے کے بعد حاجی صاحب مکان کے ایک حصہ پر آکر قابض ہوگئے۔ فرخ کا باپ بیٹے کے غم میں مرگیا۔ ایک نوکر اور دایہ اماں رہ گئے۔ حاجی آقا نے ان سے سارا مکان کرایہ پر لے لیا اور وہ کسی اور چھوٹے مکان میں اٹھ گئے تاکہ کرایہ کی رقم سے اپنا پیٹ پال سکیں۔ حاجی صاحب مع اپنی بیویوں کے سارے مکان پر قابض ہوگئے اور جعلی دستاویز بنا کر مالک

بن بیٹھے۔ فرخ نے آکر بری طرح ان کو بھی نکال باہر کیا۔ تین مہینے بعد ہی کابینہ کے وزراء میں نفاق پیدا ہوگیا اور حکومت ٹوٹ گئی۔ اس لئے تمام قیدی رہا کردیئے گئے۔ فرخ کو افسوس ہوا۔ اس امید پر کہ خدا ایسا وقت لائے کہ اس کے وطن سے فسادی عنصر ختم ہوں' وہ عفت اور اپنے بیٹے کے ساتھ زندگی گزارنے لگا۔

اس ناول میں اس زمانے کی مذہبی اور معاشرتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عورتیں ابھی پردے میں تھیں۔ کہیں کہیں تجدد کی کوشش ہورہی تھی۔ عوام جاہل تھے اور اوہام کا شکار' غریبوں کی اقصادی حالت بہت خراب تھی۔ مذہبی لحاظ سے وہ ملا واعظ اور روضہ خوان کے مرید تھے۔ بگھی اور واگون کا رواج تھا۔ متبدین مشروطہ طلبوں سے بدظن تھے۔ پولیس کا تشدد بہت زیادہ تھا۔ ظلم کی انتہا تھی۔ قانون مقتدر لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت کے کارکنوں میں فساد اخلاق کار فرما تھا۔

ناول کی کہانی دلچسپ ہے۔ کہانی بیان کرتے کرتے مصنف واقعات کے تسلسل میں ایک وقفہ چھوڑ دیتے ہیں۔ بعد میں کسی اور کی زبان سے ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑتے ہیں۔ اسی طرح جن اشخاص کا ذکر کتاب میں آیا ہے۔ کتاب کے آخر تک ان کے متعلق تمام تفاصیل آگئی ہیں۔ پلاٹ کے بعض حصوں میں ساختگی معلوم ہوتی ہے مثلاً قحبہ خانے کا ہنگامہ جس کا شورو غوغا سن کر فرخ وہاں پہنچا اور سیاوٗش مرزا اور عفت کو نجات دی۔ دوسرا وہ منظر جب سیاوٗش مرزا جواد کی منگیتر "جلالت" سے دست درازی کرتا ہے تو اس کی چیخ ہمسایہ کے مکان میں پہنچتی ہے جہاں اتفاق سے فرخ اپنے دوست کو ملنے گیا ہوا تھا۔ جتنے خاندانوں کا ذکر ہے ان میں سے اکثر کی اولاد میں صرف ایک بیٹا یا بیٹی ہے۔ فرخ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسی طرح مہین' سیاوٗش مرزا' عفت' جلالت' سب اپنے ماں باپ کے اکلوتے بچے ہیں۔ قحبہ خانے میں چار عورتیں اپنی اپنی زندگی کی طویل داستانیں بیان کرتی ہیں۔ یہ بیانات ناول کے اصل قصہ سے تعلق نہیں رکھتے اور زائد اور اضافی معلوم ہوتے ہیں۔ حذف یا مختصر کردینے سے پلاٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ قصہ بیان کرتے وقت مصنف نے ایک اور خامی کا اظہار کیا ہے۔ فرخ اپنے دوستوں کے جمع کرکے اپنے گزشتہ چار سالوں کے واقعات بیان کرنا چاہتا ہے۔ موقع کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صیغہ واحد متکلم میں اپنے حالات بیان کرے لیکن یہاں بھی مصنف ہی اس کیلئے بول رہا ہے۔ ایسا کرنے سے کہانی کی **واقعیت** اور اصلیت کو نقصان پہنچا ہے۔

کردار ہر طبقہ سے متعلق ہیں۔ نوجوان بھی بوڑھے بھی' ادنیٰ بھی اور اعلیٰ بھی' غریب اور امیر

بھی۔ وہ تہران زندگی کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی بات میں تصنع نہیں۔ وہ اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں دعا' درود' فاتحہ پڑھتی ہیں۔ جادو' ٹونے تعویذ پر عامل ہیں۔ جوان عورتیں مردوں کی ہوس کا شکار ہیں۔ بعض فاحشہ خانوں میں بعض تجار اور امراء کے گھروں میں قید ہیں۔ ناول کے نمایاں کرداروں کی شخصیتیں نمایاں ہیں۔ کسی کردار کا نفسیاتی تجزیہ نہیں ہے بلکہ سماج کے عام کردار ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ محبت کے قابل بھی اور نفرت کے لائق بھی۔ اپنی اپنی محدود زندگی میں اپنے اپنے ماحول کے مطابق بسر اوقات کر رہے ہیں۔

ناول کا طرز بیان سادہ ہے۔ چٹپٹی **لطافتیں** شاید کہیں ہوں۔ اسلوب میں ولولہ نہیں۔ ایسا جوش نہیں جس کو پڑھ کر حقارت و تنفر کے جذبات ابھریں۔ مظلوموں کے ساتھ ہمدردی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ واقعات کا سیدھا سادہ بیان ہے۔ مصنف نے گفتگو لکھتے وقت مراتب کا خیال نہیں رکھا۔ سب ادنیٰ و اعلیٰ ایک جیسی زبان بولتے ہیں عوامانہ محاورہ کا کہیں خیال نہیں رکھا۔ ان پڑھ عورت' نعمت غیر مترقبہ اور کثرت جمعیت جیسے الفاظ استعمال کرتی ہے۔

رشک پر بہا

رشک پر بہا کو ایک طویل مختصر افسانہ کہنا چاہئے۔ شک و رقابت کی وجہ سے جو غلط فہمیاں اور ناچاقیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ان کو ایک پلاٹ کی مدد سے اس کہانی میں واضح کیا گیا۔ فتان وہی لڑکی ہے جسے ایک بوڑھے **السلطنتہ** کے حرم میں بطور صیغہ ڈال دیا گیا تھا اور مصنف نے "گل پژمردہ" میں اس کی دردناک داستان بیان کی ہے۔ "رشک پر بہا" میں فتان اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے۔ گھر پر اس کا معاشی بوجھ بھاوج کے دل پر کھٹکتا ہے اور وہ مغموم رہتی ہے۔ اس کی جوانی داغدار ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اسے سوسائٹی میں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ہمایوں ایک رئیس زادہ ہے۔ لکھا پڑھا لائق صرف وقت گزارنے کیلئے خدمت خلق کے جذبہ سے وکالت کرتا ہے۔ فتان اسے مرغوب ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس کے لائق نہیں سمجھتی اور اس سے الگ رہتی ہے۔ زینت فتان کی ایک سہیلی اور ہر لحاظ سے گھر کی زینت ہے۔ نوجوان ڈاکٹر مسعود یورپ سے کیمسٹری کی ڈگری لیکر آئے ہیں۔ وہ زینت کی طرف مائل ہیں۔ ایک رات شہر میں تجدد پسندوں کی ایک محفل برپا ہوئی اروپائی فیشن پسند کرنے والے مرد عورتیں اس شراب و

رقص کی بزم میں شریک ہوئے۔ زینت اور فتان بھی آئیں۔ مسعود اور ہمایوں بھی آئے۔ اتفاق سے مسعود نے اس خیال سے کہ فتان کے دل میں بے رخی کا خیال نہ ہو۔ پہلے اس کے ساتھ رقص کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور زینت ہمایوں کے ساتھ بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئی۔ ہمایوں کو یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ فتان نے اسے تو پسند نہیں کیا اور اب کسی اور پر ڈورے ڈالنے شروع کردیئے ہیں اور مسعود کو شبہ ہوا کہ زینت ہمایوں کی طرف مائل ہو گئی ہے اس لئے اندر ہی اندر شک و رقابت کی وجہ سے پہلی سی دل بستگی نہ رہی اور چاروں کے دل غم کی لپیٹ میں آگئے۔ فتان اداس کہ اس کی وجہ سے زینت کا رشتہ ٹوٹا۔ آخر فتان نے مسعود کو سمجھایا اور مسعود نے ہمایوں کو اصلی حقیقت سے آگاہ کیا اور پھر دونوں جوڑے آپس میں مل گئے۔ ضمنی طور پر ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عوت نے سوکن کے جلاپا اور شوہر کے بے رحمانہ سلوک سے تنگ آکر شوہر کو قتل کردیا۔ ہمایوں عدالت میں اس کا وکیل دفاع بن کر اس کو کم سے کم سزا دلاتا ہے۔ قصہ یوں تھا کہ ایک ملاح نے اپنی نہایت ناکافی آمدن کے باوجود ایک دوسری عورت سے شادی کرلی اور ایک ہی کوٹھڑی میں دونوں کو رکھا۔ پہلی کا بستر بھی آدھا چھین لیا۔ خوراک بھی کم کردی۔ بے رخی اور بیزاری کا اظہار کیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ دوسری عورت کے ساتھ لیٹتا اور داد عیش دیتا۔ ایک رات جوش رقابت میں آکر اس نے چاقو سے حملہ کیا۔ جس کے صدمہ سے بعد میں اس نے جان دیدی۔ کہانی کے دوران میں تہران میں زیر زمین شراب خانوں کی بھی ایک جھلک دکھائی ہے جہاں شراب کے ساتھ ساتھ ارمنی یا دوسری اروپائی عورتیں بھی ملتی ہیں۔ ہمایوں محبت و رقابت کی کشمکش میں کافے میں گیا۔ وہیں سے روسی عورت کی نظروں کا شکار ہو کر آتش شہوت میں جھلس گیا۔

مجموعی تاثر کے لحاظ سے کہانی اچھی ہے۔ مصنف کا سوز و اخلاص عیاں ہے۔ انہوں نے کتاب کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اروپائی مصنفین کے حادثاتی ناولوں کے ترجمے شائع کرنے کے بجائے خود ایسے ناول لکھیں جن میں اپنے ملک کے اجتماعی مسائل کا ذکر ہو۔ چنانچہ "گل پژمردہ" اور "رشک پر بہا" میں اسی قسم کی اصلاحی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ شروع شروع میں ان کو خاص مقبولیت نہیں ہوئی لیکن انہوں نے نئے آنے والوں کیلئے راہیں ہموار کیں اور بعد میں یہ روش بڑی مقبول ہوئی۔

کہانی کا پلاٹ بھی اچھا اور دلچسپ ہے دو تین جگہ تعطل پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پلاٹ کی رفتار میں قوت پیدا ہو جائے۔ مثلاً ہمایوں مسعود سے ملنے جاتا ہے تو وہ اپنے آگے آگے

فتان کو بھی اس گھر میں جاتے دیکھتا ہے۔ اس سے اس کے شبہات میں خواہ مخواہ اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ مسعود زینت کو اپنے گھر لے جا کر اس کے ساتھ گستاخی اور بے رخی سے پیش آتا ہے جس سے پڑھنے والوں کے خیال میں چاہنے والوں کے درمیان اور دوری پیدا ہو جاتی ہے اور اس فراق کو وصال میں بدلتے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں جو جذبات و ہیجانات سے مجبور ہو کر غلطیاں کرتے ہیں۔ ہمایوں انسانی ہمدردی رکھتے ہوئے بھی لغزش کھا جاتا ہے۔

مشفق کاظمی نے اور بھی ناول لکھے لیکن وہ زیادہ معروف نہیں ہوئے۔

گل پژمردہ	1929
رش پر بہا	1930
یادگار یک شب	1961

م۔ مسعود دھاتی

مسعود دھاتی نے اپنا بچپن ایک چھوٹے قصبے میں گزارا۔ جوانی میں تہران آیا اور ایک دبستان (پرائمری) میں معلم بن گیا۔ اسی زمان میں وہ اخبارات میں ادبی مضامین لکھتا رہا۔ اس کا پہلا ناول روزنامہ "شفق سرخ" میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کے دوسرے ناول بھی شائع ہوئے۔ ایک وزیر نے اس کی ذہانت اور تیزی و تندہی طبع سے متاثر ہو کر اسے صحافت کے مطالعہ کیلئے یورپ بھیجا۔ واپسی پر سیاسی بحران کی وجہ سے وہ اپنی بے باک صحافت جاری نہ رکھ سکا۔ 1941ء میں رضا خاں کی دست برداری کے بعد پریس کو آزادی ہوئی تو مسعود نے "مرد امروز" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس میں حکام و عمال پر سخت تنقید کی۔ اس کے دشمنوں نے 1947ء میں اسے قتل کروا دیا اور قاتل کا بھی پتہ نہ چل سکا۔

تالیفات

تفریحات شب	1934
در تلاش معاش	1932
اشرف المخلوقات	1934
گلہای کہ در جہنم می روید	1942
بہار عمر	

تفریحات شب

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ تہران کی شبانہ زندگی میں جس قسم کے عیش و عشرت کے مشاغل ہوتے ہیں ان کا ایک رخ ہمارے سامنے پیش کردے۔ کہانی بیان کرنے والا مدرسے کا استاد ہے جسے تین گھنٹہ غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ اس ماسٹر کی آواز میں گویا مصنف کی آواز ہے۔ اس کا ایک مخصوص ساتھی اور تین چار اور دوست ہیں۔ جن کی زندگیوں کے اخلاق و کردار کو واضح کیا گیا

ہے۔ ان میں ایک چھاپہ خانے کا کمپوزیٹر' ایک منیاری بیچنے والا' ایک تھیٹر کا ملازم اور ایک برطرف شدہ کلرک ہے۔ تقریباً سبھی مخصوص شخصیتوں کے حامل ہیں۔ مفلس ہیں' بے کار ہیں' بے گھر ہیں۔ اپنے رنج و غم کو بھلانے کیلئے شراب پیتے ہیں اور تسکین شہوت کیلئے فاحشہ خانوں میں جاتے ہیں۔ چھاپے خانے کا ملازم اپنے خاندان ہی میں ایک اچھی لڑکی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا لیکن اسے غریب سمجھ کر دھتکار دیا گیا۔ ایک دن وہ فاحشہ خانے میں گیا تو وہی لڑکی اسے وہاں مل گئی اس کو دیکھ کر وہ اس قدر منفعل ہوا کہ اس نے خود کشی کرلی۔ "تفریحات شب" میں قہوہ خانے' ریستوران' کافہ اور فاحشہ خانے کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ محفل شراب خوری' موسیقی' رقص و سرود' عیاشی' ہوس اور بے عفتی کا ذکر ہے۔ گناہ کی دکانداری اور عصمت فروشی کا چشم دید حال ہے۔ انسانوں کی حیوانیت اور رذالت کا بیان ہے۔ آخر میں مدرسہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے نقائص بیان کئے ہیں اور مروجہ نصاب تعلیم پر تنقید و تبصرہ ہے۔ آخری حصہ تو گویا ایک مضمون کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ مصنف نے تاریخ' جغرافیا' شاعری اور نثر کی کتابوں سے اقتباسات سے نکال کر بتایا ہے کہ ہم بچوں کو دون ہمتی' پست فطرتی اور قناعت کی تعلیم دیتے ہیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جو انہیں عالی ہمتی' ہوش و بیداری' ایثار' خود اعتمادی سکھائے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ تمام حساب جیومیٹری کے مسائل' گرامر' حیض و نفاس کی جزئیات' تاریخ و جغرافیا کی لاطائل باتیں جنہیں بچے جبر سے یاد کرتے ہیں ان کو اس قابل نہیں بناتے کہ وہ پیٹ کی بھوک سے نجات پانے کیلئے کوئی اور کام کرسکیں۔ یہی غلط اور احمقانہ تعلیم و تربیت ہے جس نے ہم میں زندگی کے سوتوں کو ہی خشک کردیا ہے۔

مصنف نے تین چار شخصوں کا انتخاب کرکے گویا نچلے طبقہ کی نمائندگی کی ہے اور ان کی زبوں حالی اور پست کرداری کو واضح کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اخلاقی و اجتماعی خرابیاں ماحول کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس نظام زندگی میں وہ پرورش پا رہے ہیں وہ سراسر فساد و گندگی سے بھرا ہے۔ راستی و اخلاص کا نام نہیں۔ ریا' مکر اور فریب ہر جگہ رائج ہے۔ جب محنت و دیانت سے روٹی نہیں چلتی تو چالاکی اور بددیانتی سے کام لیا جاتا ہے۔

مصنف کا دل حساس ہے وہ اہل وطن کی اجتماعی زندگی سے سخت متاثر ہیں اور بڑے جوش سے تنقید کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ مرد جو عورتوں کی عصمت و شرافت کے نگہبان تھے وہی ان کی زندگیوں کو پامال کرنے اور حس شرافت کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اقتصادی بدحالی کو دیکھ کر انہوں نے جرات کے ساتھ مردوں سے کہا کہ وہ لوگ جو تعلیم و تربیت اور مستقبل کی

آسائش کا انتظام نہیں کرسکتے وہ اولاد پیدا کر کے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ جمال زادہ نے لکھا ہے کہ اوضاع ایران بیان کرنے کے لحاظ سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کے سات ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

در تلاش معاش:

مسعود کی دوسری کتاب ہے۔ یہ "تفریحات شب" کا ضمیمہ ہے۔ اس میں بھی انہی چار شخصوں کا بیان ہے جن کا تعارف مصنف نے "تفریحات" میں کرایا ہے۔ اس نے ان کا نام پکر' گوجہ فرنگی' فیلسوف رکھا ہے۔ چوتھا بیان کرنے والا خود برخاست شدہ سکول ماسٹر ہے یہ چاروں شخص معاش کی تلاش میں نکلتے ہیں پہلے ایک کارخانے میں ملازم ہوتے ہیں۔ جھاڑو دینے' مشین صاف کرنے اور مستریوں کی امداد کرنے پر ان کا تقرر ہوتا ہے۔ وہ محنت اور دیانتداری سے کام کرتے ہیں۔ نالائق سے نالائق لوگ زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں۔ روسی اور جرمن افسر خواہ مخواہ کا رعب جماتے ہیں۔ ایک دن پکر اپنے مطالبات اور افسروں کی نااہلی' فرض شناسی اور کوتاہی کا کچا چٹھا لکھ کر وزارت مالیہ کے افسر کے پاس پہنچتا ہے وہ اس کاغذ کو واپس تحقیق کیلئے اسی افسر کے پاس بھیج دیتا ہے جس کی شکایت کی گئی تھی اس افسر نے لکھا کہ یہ شخص پاگل ہے چنانچہ اس کو علاج کیلئے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے۔ باقی تینوں بھی کام سے برطرف ہوجاتے ہیں۔ اپنے ساتھی کی رہائی کے بعد چاروں ایک گاؤں میں جاتے ہیں۔ نمبردار کے سامنے تجویز پیش کرتے ہیں کہ یہاں ایک مدرسہ کھولیں' پڑھنا لکھنا بھی سکھائیں تاکہ لوگ علم و ہنر سے آراستہ ہوکر اپنی اقتصادی بدحالی کو درست کرسکیں لیکن وہ یہ کہہ کر انکار کردیتا ہے کہ گاؤں میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ دکانیں کھولتے ہیں جہاں بچوں کو پڑھانے' خط لکھنے' فال دیکھنے اور تعویذ لکھنے کا کام شروع کرتے ہیں اور کھلونے اور مٹھائیاں وغیرہ بھی بیچتے ہیں۔ کچھ عرصہ کیلئے ان کا کام خوب چلتا ہے۔ خاص طور پر رمل فال کا کام لوگوں کو مرغوب ہے۔ آخر ایک دن بوڑھی عورت کی ساز باز سے دو اوباش عورتوں کو پھانستے ہیں۔ وہی عورت بعد میں گاؤں کے ملا اور دوسرے اشخاص کو ان کی بدکاری سے خبردار کرتی ہے۔ لوگ بدگمان ہوجاتے ہیں۔ ان کی ساکھ جاتی رہتی ہے۔ ملا ان کو سرمنبر بے دین کہتا ہے۔ آخر ایک صبح ملا کو مار پیٹ کر وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ مازندران کے ایک شہر میں پہنچ کر ایک سگرٹوں کی دکان کھولتا ہے۔ دو شراب

بیچتے ہیں۔ تیرا ریستوران میں فن رقص سکھانے کا استاد بن جاتا ہے۔ فریب اور دغا سے خوب روپیہ کماتے ہیں۔ سگریٹ کے تمباکو میں گھاس پھوس ملاتے ہیں۔ شراب کے بجائے رنگین شربت بیچتے ہیں۔ آخر وہاں سے بھی نکل آتے ہیں اور تہران کی زندگی میں مدغم ہوجاتے ہیں۔ پکر اپنا کافہ کھولتا ہے اور رقاصی کی محفلیں جماتا ہے۔ ایک بڑے تاجر کی بدشکل لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہوجاتا ہے کیونکہ بیاہ سے بہت سی دولت ملے گی۔ ایک مرتبہ یہ لوگ گاؤں سے آکر امیرانہ عیش و عشرت کا مزہ بھی چکھ گئے۔ بڑے پائے کی طوائفوں کے ساتھ پیتے پلاتے کھاتے پیتے سیر کرتے اور داد عیش دیتے رہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ایران کی اقتصادی اور اجتماعی زندگی کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ لوگ کس طرح فریب اور دغا دیتے ہیں۔ چالاکیوں اور عیاریوں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مکان اور جاگیریں بناتے ہیں۔ اپنی ریاکاری سے اور عوام کی جہالت کی وجہ سے اپنے کرتوتوں پر پردہ پوشی کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی آبرو کو قائم رکھتے ہیں۔ اسی مسموم فضا میں جب کوئی دوسرا شخص نیک ارادے سے کام کرتا ہے تو وہ بھی اس ڈھرے پر جا پڑتا ہے۔ مصنف تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کیا ساٹھ سال تک اس قسم کی زندگی بسر کرنا' فضائل انسانی سے محروم رہنا اور اپنا جمع کیا ہوا مال دوسروں کیلئے چھوڑ کر مرجانا ایسی زندگی ہے جس کی اتباع کی جائے۔

اس کتاب میں بھی افسانے کے ساتھ ساتھ مصنف نے حالات و کوائف پر تبصرہ کیا ہے اور اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا ہے۔ بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تقریر کررہا ہے یا ایک مضمون لکھ رہا ہے۔

مصنف کے مشاہدات غائر ہیں اس کا احساس تیز ہے۔ جملے جملے سے اس کی روح کا گداز اور اخلاص واضح ہے۔ ظلم و جہالت سے اسے نفرت ہے۔ اس نے تہران کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے کردار زندگی کی سچی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے بیان میں کامل صراحت ہے۔ پڑھنے والا گویا خود ان کے تمام اعمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اشرف مخلوقات

اس کتاب کا نام "اشرف المخلوقات" طنزیہ نام ہے یعنی انسان ہے تو اشرف المخلوقات' لیکن

اس کے کرتوت دیکھو تو حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ اس کتاب میں بھی پہلی دونوں کتابوں کی طرح ایران کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے تہہ دار گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں دو موضوع زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک عورت کی بے راہ روی، شہوت پرستی اور بے وفائی اور دوسرے تاجروں کی غاصبانہ لوٹ کھسوٹ، چور بازاری اور دغا فریب۔ پہلے افسانے میں گاؤں کا ایک شخص شہر میں حلال مزدوری کرنے جاتا ہے۔ اپنی نئی بیوی سے ان کو محبت ہے لیکن اس کی غیر حاضری میں وہ زمیندار کے نوجوان لڑکے سے سازباز کر کے شہر میں چلی جاتی ہے۔ شوہر ان کے پیچھے ان کو تلاش کرلیتا ہے اور موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ جب وہ دونوں نہر کے کنارے مکان میں گئے ہوئے ہیں تو یہ گھات میں بیٹھ کر دونوں کو گولی کا نشانہ بناتا ہے اور خود گرفتار ہو کر دس سال کی سزا پاتا ہے۔ ایک اور عورت ہے جو ایک شخص کو اپنے اوپر فریفتہ کر کے خوب اس سے مال نچوڑتی ہے۔ وہ اپنے ورثہ کی جائیداد بیچنے کیلئے اپنے بھائی کے پاس جاتا ہے۔ بعد میں وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتی ہے وہ شخص واپس ہو کر اس کے فراق میں اپنے ہوش کھوتا ہے اور پاگل خانے میں علاج کیلئے جاتا ہے۔ دوسرا شخص دفتر میں ملازم ہے وہ بھی اس عورت کی ہوس زر کی تسکین کیلئے رشوت لینا شروع کردیتا ہے۔ آخر جب وہ اس کو بھی دغا دیتی ہے تو خود اپنے ضمیر کی آواز سن کر اپنے آپ کو قانون کے سپرد کر دیتا ہے۔ تیسرا ایک اور شخص ہے جو اس کی بے وفائی سے تنگ آکر خودکشی کرلیتا ہے۔

دوسرے موضوع یعنی تاجرانہ خرابیوں کو بے نقاب کرنے کیلئے افسانے کو یوں صورت دی ہے کہ تین کلرک اپنے دفتر کے افسر کی نالائقی اور بدخلقی سے تنگ آکر استعفیٰ دیکر تجارت شروع کرتے ہیں اور پھر بازار میں داخل ہو کر صحیح حالات سے آگاہ کرتے ہیں کہ سٹہ کیسے چلتا ہے۔ باہر سے مال منگوانے کیلئے پرمٹ کس کس طرح سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ چنگی سے مال گزارنے کیلئے وہاں کے کارکنوں کو کیسے رشوت دی جاتی ہے۔ دفتروں کے کلرکوں سے مل کر ٹنڈر کی کم سے کم رقم پہلے سے معلوم کر کے کسی طرح اپنا ٹنڈر منظور کروالیا جاتا ہے۔ تجارت پیشہ کی عیاریوں کو واضح کرنے کیلئے مصنف نے خاص طور پر یہودی کو اپنی ملامت کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے بخل ان کی خست اور ان کی چالاکی کو نمایاں کیا ہے۔ یہودی عورت دلالہ ہے۔ کہنہ فروش کھوسٹ یہودی بے کار چیزوں کو امریکنوں کے پاس آثار قدیمہ کہہ کر بیچتا ہے۔ ایک یہودی تاجر زرمبادلہ کا چکر چلا کر دلالوں کی معرفت ایسا رسوخ بنائے ہوئے ہے کہ بنکوں تک اس کی ساکھ ہے لیکن اس کا اپنا روپیہ نہیں۔ وہ خود چیکوں کے ذریعہ ہیر پھیر کر کے زبانی زبانی مال

خریدتا اور بیچتا ہے اور تھوڑے عرصے کیلئے لوگوں کا روپیہ ہی بنک میں اس کے نام سے آتا جاتا ہے۔ ایک دفعہ اس کی عیاری پکڑی گئی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تاجروں کا روپیہ برباد ہوگیا۔ ان نوجوان کلرکوں کا ایک نوجوان یہودی دوست بھی ہے اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور وہ کاروبار میں ان کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

مصنف کے بیان کا انداز یہ ہے کہ وہ چند چیدہ شخصوں کے ہمراہ شہر کے گوشے گوشے میں جاتا ہے اور لوگوں کی زندگیوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔ جیل میں، ہسپتال میں، شبینہ ہوٹلوں میں، بازاروں میں داخل ہو کر ایک ایک کلرک کے دل کو ٹٹول کر اس کی داستان سنتا ہے وہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے جسے دور کے رشتہ دار مرجانے سے دس ہزار پونڈ کی رقم ورثہ میں ملی ہے اور وہ عیاشیوں میں غرق ہورہی ہے۔ جیب سے پیسے دیکر نوجوانوں کو تلاش کرتی ہے۔ مصنف تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتنا غلط اجتماعی قانون ہے۔ یہی روپیہ عام **المنفعت** کاموں میں صرف ہوتا۔ وہ شاندار عمارتوں کو دیکھتا ہے تو اسے ان غریبوں کی یاد آتی جن کے خون پسینہ سے یہ محل تعمیر ہوئے ہیں۔

مصنف کا دل بڑا حساس اور دردمند ہے وہ غریبوں کا ہمدرد ہے۔ اس نے لکھا کہ میں ایک شہر میں قتل عام کی خبر سن کر اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس شخص کی خودکشی سے جس نے فقر و پریشانی سے تنگ آکر اپنی جان ہلاک کرلی ہو۔ وہ اپنے آس پاس دیکھتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان امن و راحت کیلئے تنگ و دو میں ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اپنی ہوس اور شہوت کی تسکین کیلئے ہر بڑے سے بڑا جرم کرنے کو تیار ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے انتقام لے رہا ہے۔

اشرف المخلوقات کوئی مسلسل کہانی نہیں ہے اس لئے باہم پیوستہ پلاٹ بھی نہیں۔ مختلف کردار ہیں جو بھرے شہر میں چلتے پھرتے ہیں۔ زندگی گزار رہے ہیں، مر رہے ہیں، جی رہے ہیں، ایک دوسرے کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ حکومت کے کل پرزے ڈھیلے ہیں۔ ہر محکمہ کا کارکن رشوت خوار اور نااہل ہے اور سارا نظام چوپٹ ہے۔

گلهای که در جهنم میروید:

دو جلدوں میں چھپا تھا۔ دوسری جلد کا نام "بہار عمر" رکھ دیا تھا۔ شروع شروع میں تو ایک

افسانہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص یا افسانہ نگار بلجیم میں تعلیم کیلئے گیا وہیں ایک عورت سے عشق کیا۔ پھر اس سے شادی بھی کرلی۔ کچھ وقفہ کے بعد وہ اپنے وطن واپس آگیا۔ یہاں اس کے علم و فن کی قدر نہ ہوئی اور حکومت کے کسی ادارے نے اسے قبول نہ کیا۔ تین سال تک وہ افلاس و بدبختی کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کی بیوی انتظار کرتے کرتے اکتا گئی۔ آخر جب اس شخص نے ایک طویل خط لکھا اور اپنے ملک کی دوزخی زندگی اور اپنی بے بسی کا حال لکھا تو بیوی نے خودکشی کرلی۔ یہاں تک تو پہلا افسانہ درست ہے لیکن مصنف اس سے آگے اپنے بچپن سے لیکر جوانی تک کا حال لکھتا ہے تو شروع شروع میں اپنی بیوی کو مخاطب کرتا ہے۔ گویا سارا ناول اس کیلئے لکھا ہے لیکن یہ اشارہً ناموزوں ہے کیونکہ سارا ناول پڑھ کر ایسا تاثر پیدا نہیں ہوتا نہ ایسی ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے اثر سے اس کی اروپائی بیوی نے خودکشی کرلی ہو۔

دوسرے حصے میں مسلسل کہانی ہے یعنی ایک ایرانی کے خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ جنگ عظیم دوم سے پہلے اور اس کے بعد ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے اس کا گھناؤنا نقشہ پیش کیا ہے۔ گلھای کہ در جہنم میروید کا یہی مفہوم ہے کہ وہ بچے جو دوزخی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت کی خرابیوں میں مصنف نے کئی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ ایرانی مرد اور عورتیں عزاداری کی شوقین ہیں اور ائمہ و شہداء کے غم میں روتے ہیں۔ تعزیئے نکالتے ہیں۔ روضہ خوانی کرتے ہیں۔ تقریباً سب تیوہار ماتمی ہیں۔ ملا' اخوند' واعظ انہیں سوزناک قصوں کو بیان کرکے رلاتے ہیں۔ بچے کی روح میں سوگ اور غم پرورش پاتے ہیں۔ عورتیں بات بات پر اہل بیت اور ائمہ اطہار کی قسمیں یاد کرکے روتی ہیں۔ اس قسم کا ملتا جلتا اثر مسجد کے ملا اخوند اور روضہ خوان کا ہے۔ جو قصے کہانیاں سناتا ہے۔ اوراد و وظائف بتاتا ہے۔ دم کرتا ہے۔ تعویذ و طلسمات لکھ کر دیتا ہے۔ ایک اور صاحب بھی ہیں جو جادوگری' احضار ارواح' تسخیر اجنہ اور کیمیاگری سکھاتے ہیں اور عوام کو فریب دیتے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ گریہ و زاری زندگی کیلئے زہر ہے جس قوم کو گریہ کی عادت ہے وہ تو ذلیل ترین اقوام عالم میں سے ہے اور یہ مذہبی خرافات اور اوہام پرستی اپنے تمام مصائب و مفاسد کے ساتھ سوسائٹی کی بدبختی اور رنج و الم میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک اور بڑی خرابی جو بچوں کی صحیح نشوونما میں حارج ہے اور تمام افراد میں اخلاقی مفاسد پیدا کررہی ہے وہ جنسی قیود ہیں۔ عورت پردے میں ہے۔ مردوں کو عورتوں کے ساتھ جنسی اختلاط کے کم مواقع ملتے ہیں۔ اس لئے رد

عمل میں مرد غیر فطری عمل پر آمادہ ہوجاتے ہیں چنانچہ استاد' بڑی عمر کے طالب علم' حجروں میں رہنے والے اخوند' اس قسم کے شہوانی جذبات سے مجبور ہوکر بدعملی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے چونکہ شادی میں مرد و عورت کو انتخاب کی اجازت نہیں اس لئے تمائل طبعی کے بغیر جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ سب حرامزادے ہیں۔ مصنف نے چھوٹے شہروں کی غیر منظم اقتصادی حالت بھی بیان کی ہے۔ سردی' وبا اور قحط کا دور دورہ ہوجاتا ہے۔ افلاس کی وجہ سے شہر گورستان بن جاتا ہے۔ عوام کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ خدا پر اعتقاد رکھنے والے بھی اس سے بدظن ہوجاتے ہیں اور اس کو "خدای سرما و قحط گرسنگی و دوبا" کہہ کر پکارتے ہیں ایک سریع الاعتقاد حامی عورت اپنے اعزا کی مرگ پر بے خود ہوکر "ای خدا بر پدرت لعنت" چلا اٹھتی ہے۔ لڑکا کہتا ہے "جو خدا جرم و گناہ کے بغیر مجھے اس رنج و الم میں مبتلا کئے ہوئے ہیں میں اس کی عبادت کیلئے تیار نہیں ہوں"۔ داستان بیان کرنے والا بتاتا ہے کہ "من مولود صدہا امور جبری بودم کہ قسمتی ازا نہا مربوط بہ محیط و والدین و قسمتی ہم مربوط بخدا و طبیعت بود"۔ اجتماعی خرابیوں کے بیان کے ساتھ مصنف نے حکومت اور اس کے کارکنان پر سخت تنقید کی ہے۔ سب ڈاکو ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ عدل و انصاف کا کہیں وجود نہیں۔ قدر روحانی چور ہے۔ پاسبان چور ہے۔ جج قاتل ہیں۔ ہماری تعلیم فساد و جہالت کا منبع ہے۔ بادشاہ جابر ایسا بیمار ہے جس کی خوراک سونا ہے اور مشروب خون ہے۔ مصنف نے رضا شاہ کبیر کے عہد سلطنت کے جبرو تشدد پر بے باکی سے جرح کی ہے اور 1939 کی جنگ عظیم سے جو تغیرات رونما ہوئے ان کا بھی تجزیہ کیا ہے۔

یہ ناول بھی حاجی بابا اصفہانی اور سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کی روایت لئے ہوئے ہے اور انہیں کی تقلید میں لکھا گیا ہے لیکن مصنف موجودہ علم سیاست' نئے فلسفہ فکر اور اصول نفسیات سے واقف ہے اس لئے جابجا نئے رجحانات کا پتہ چلتا ہے وہ بڑی بے باکی سے تنقید کرتا ہے۔ بے رحمی سے سوسائٹی کے ناسور کو چیرتا پھاڑتا ہے بڑی تیزی و تندہی سے اس کا قلم چلتا ہے۔ وہ بے خطر ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے .... شہنشاہیت کے دور میں ایسے تنقید نگار کا زندہ رہنا محال تھا۔ اسی لئے تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس کو قتل کروا دیا گیا۔ کسی اور خیال کو واضح کرنے کیلئے یا پڑھنے والے کے دلوں میں کوئی خاص تاثر پیدا کرنے کیلئے وہ کہانی کو انتہائی عریانی' صراحت اور تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ انسان کے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ علی اور ابوطالب کا قتل' وبا اور قحط سے جانوں کی تلفی' جلیل اور سکینہ کا قتل سب اسی قبیل کے

واقعات ہیں۔ احمد یعنی قصہ گو اور اس کی ماں کا کردار واضح اور تمثیلی ہے مصنف کی شخصیت وقفوں کے بعد دخیل ہے وہ خود گویا احمد کے روپ میں اپنے بچپن کے حالات بیان کررہا ہے اور جلیل کے کردار میں اس کی زبانی اپنی ملت کی پستی کے اسباب گنوا رہا ہے۔

جواد فاضل

تصانیف

ناول: عشق در مدرسہ یا دختر مدرسہ، مہین، عشق ثریا یا افسونکار، شہید عشق یا خیانت، فروغ آشنائی، ستارہ، یگانہ، لعنت بر توای عشق، خاطرہ، **فشنگ**، تبسم زندگی انتقام، سرگزشت بدری، فرزند عشق، قربانی، گیلان، ماجری، بانوی بے گناہ، مہتاب یکدختر، جہانبانو، **نویسندہ**، شعلہ، دارین و دنیا، حلقہ طلا، شیرازہ، تقدیم بتو، لاریجان ژیلای ژالہ، پست شمارہ نمبر1 گمشدہ، وفا، دختر یتیم، عشق در شک، دختر ہمسایہ نازنین، فاحشہ، ہفت دریا، ای آرزوی من، خطرناک، گل قرنفل، گردن بند ملکہ، گناہ فرشتے، ملکہ بدبخت، وظیفہ بالاتر از عشق۔

متفرق

پیامبران 1339	دختران پیغمبر سخن میگویند
خطبہ ہای محمد	سخنان علی (نہج البلاغتہ کلمات قصاء)
محاکمات تاریخی	

علی قلعی مستعان کی طرح جواد فاضل بھی پرنویس ہیں۔ پچاس کے قریب تو ان کے ناول ہیں۔ دوسری تحریریں ان کے سوا ہیں .... ان کے ناولوں کے ناموں سے ہی ظاہر ہے کہ ان کے مضامین کس نوعیت کے ہوں گے۔ چھ سات ناول جو میں پڑھ سکا ہوں، ان سے ظاہر ہے کہ ان کا موضوع ایران کا پرفساد معاشرہ ہے۔ ان کی کہانیوں کا محور جوان مرد اور عورتیں ہیں۔ ان کی جنسی زندگی کا مدوجزر ہے۔ عشق کی بے راہ روی ہے کہیں مرد کی ستمگری اور بے وفائی ہے کہیں عورت کی مکاری اور شہوت رانی۔ ان کی آپس میں چپقلش میں زندگیوں کی تباہی و بربادی ہے اور ان کا انجام رنج و اندوہ ہے۔ ضمناً کارکنان حکومت کی رشوت خواری، نالائقی اور بے نظمی پر تنقید بھی ہے۔

ان کی کہانیاں عموماً دلچسپ ہوتی ہیں۔ وہ جنسی معاملات و جذبات کو بھی صراحت سے بیان کرتے ہیں لیکن موضوع کی تکرار و یکسانیت سے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے بعض کہانیوں سے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزمرہ زندگی کے واقعات و حوادث کو صحافتی انداز میں بیان کررہے ہیں یا زخم خوردہ مرد اور عورتیں اپنی آپ بیتی سنا رہے ہیں۔ ان کے کردار رواں دواں زندگی سے مستعار لئے گئے ہیں۔ فنی طور پر ان کی شخصیت میں گہرائی و گیرائی نہیں کسی بلند پایہ کردار کی تخلیق نہیں کی۔

مندرجہ ذیل جن تین ناولوں کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے اس سے مصنف کی ناول نگاری کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

نویسندہ بہت اچھی اور دل پسند کہانی ہے۔ وعظ و خطابت کا کوئی شائبہ داخل کئے بغیر پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے کہ زبردستی کی شادیاں کس قدر تباہ کن اور جان لیوا ہوتی ہیں اور اگر حسب و نسب اور جاہ و اقتدار کو حائل کرکے دو محبت بھرے دلوں کو نہ ملنے دیا جائے تو روحوں کو کس قدر عذاب پہنچتا ہے۔ **نویسندہ** کو پڑھ کر آپ خود افادی پہلو بیان کرنا چاہیں تو یہ مطالب بیان کرسکتے ہیں وگرنہ آپ محسوس کریں گے کہ ایران کی سوسائٹی میں اکثر ایسا ہوتا ہوگا اور مصنف نے اپنے درد و اخلاص کے ساتھ ہمارے دلوں کو متاثر کرنے کیلئے یہ قصہ بیان کیا ہے۔

نویسندہ یعنی رشید بوشہر کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ پیش نماز تھا۔ وہ عراق عرب گیا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔ رشید نے تہران آکر متوسط تک تعلیم پائی۔ رات دانش کدہ حقوق کی کلاس میں شرکت کرتا اور صبح وزارت دارائی میں ملازمت کرتا۔ بعد میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر مجلّہ آفرین میں ہفتہ وار افسانہ لکھتا رہا اور یہ ناول اس افسانہ نگار کی داستان محبت و عشق ہے۔ پہلے اس کی توجہ ایک ماری خانم کی طرف مبذول ہوئی۔ لڑکی اس کے مکان کے سامنے والے مکان میں رہتی تھی اور صبح صبح دروازہ کھولتے ہی اس کا سامنا ہوتا تھا۔ دونوں کا جی مچلا۔ اصل میں وہ ایک بیاہتا عورت تھی اس کا شوہر پچاس سالہ ارباب قاسم تھا لیکن رشید نے اس کو لڑکی کا باپ جانا۔ اپنے دفتر میں حسابات کے بارے میں اس کا ایک اہم کام بھی انجام دیا جس کی وجہ سے ممنون ہوکر اس نے اپنے گھر میں دعوت دی۔ جب ماری خانم سامنے آئی تو قاسم نے اسے اپنی بیگم کہہ کر تعارف کرایا۔ رشید پر سکتہ طاری ہوا۔ اس کے دل کو صدمہ ہوا اور اس نے فوراً وہ مکان چھوڑ دیا۔ چند مہینوں کے بعد ایک ہوٹل میں اسی ماری خانم کو بدلی ہوئی صورت میں دیکھا۔ وہ رو پڑی اور رشید کے پاس آکر اس نے اپنی داستان سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ مریم ہے۔ حاجی دلال کی بیٹی۔ حسن کی غیرت، علم کی چاشنی پاکر اور امراء کی لڑکیوں کو دیکھ کر اس نے پر پرزے نکالے ماں باپ نے ارباب قاسم کے پاس گویا بیچ دیا۔ وہ تو شرافت مند تھا اور میرا فدائی تھا۔ لیکن اپنی جوانی بھری

شہوت کی تسکین کہاں۔ رشید کے چلے جانے کے بعد اسی مکان میں ایک فوجی نوجوان آکر رہنے لگا۔ اب اس سے آنکھیں چار ہوئیں اور محبت کی راہیں نکلنے لگیں۔ ایک مرتبہ وہ اس کے مکان پر گیا۔ اتنے میں اوپر سے اس کا شوہر آپہنچا۔ اس نے مہر ادا کرکے طلاق دیدی۔ وہ نوجوان افسر کے ساتھ آباوان فرار ہوگئی۔ وہاں اس افسر کی گرفتاری کے سامان ہوئے تو وہ بھاگ گیا۔ وہ حاملہ تھی۔ حمل ضائع کروانے گئی۔ ہسپتال کے باہر آئی تو اکیلی رہ گئی تھی۔ بس عیاشوں کے ہتھے چڑھ گئی خود بھی جی بھر کے ذلیل و خوار ہوئی۔ روپیہ ختم ہوا تو آخری زیور بیچ کر تہران آگئی اور اب ہوشنگ یعنی اپنے دوست افسر کی تلاش میں ہے۔ رشید کی محبت جاگ اٹھی تھی۔ اس نے مریم کو بیوی بنانے کا تہیہ کرلیا اور اس کی داستان کو مجلّہ میں شائع کیا۔ چھ سو خط لکھنے والوں نے اس سے شادی کی مخالفت کی اور کہا کہ عورت پھر دغا دے جائے گی۔ صرف ژالہ نے اس سے شادی کرلینے کا مشورہ دیا۔ رشید مریم کو باپ کے پاس لے گیا اور اس کو اپنا ارادہ بتایا اور سب خطوط بھی اس کو بتائے لیکن مریم کے خوددار دل نے گوارا نہ کیا کہ رشید کا دل اس کی ذلیل زندگی سے داغدار ہو۔ اس نے رشید کو بتائے بغیر ایک ہسپتال میں نرس کی خدمت قبول کرلی۔ ایک دن رشید کے ساتھ وقت ملاقات تھا تو وہ بازار میں ایک اور ڈاکٹر کے ساتھ ہنستی کھیلتی ہوئی دکھائی دی۔ رشید کو اس کی بے وفائی پر یقین ہوا اور اس نے روکشی کرلی۔ کچھ دن بعد اسی ڈاکٹر نے بتایا کہ مریم نے ایسا کیوں کیا۔ جب رشید مریم کو ملنے گیا تو وہ ہسپتال سے واپس آرہی تھی۔ جب رشید کو دیکھا تو اس سے بچ کر بازار میں گزرنے لگی۔ موٹر سے ٹکرائی اور بے ہوش ہوگئی۔ آخر ہسپتال میں جاں بحق ہوئی۔ رشید اس کی قبر پر جاکر شمع جلاکر روتا رہا۔ اس نے دکھ بھرا واقعہ بھی مجلّہ میں لکھا۔ ژالہ نے پھر تسکین کا خط لکھا۔ رشید کے افسانے چھپتے رہے اور ژالہ' متاثر ہوتی رہی۔ ایک رقعہ اس نے لکھا کہ وہ اس کے قریب ہوئی جا رہی ہے۔ رشید نے بھی ایک قنادی کی معرفت خط کا جواب دیا اور اپنے دل کی کیفیت اور محبت کی کشش کو بیان کیا۔ معلوم ہوا کہ ژالہ ایک تیمسار کی اکلوتی بیٹی ہے اور بڑے محل میں رہتی ہے۔ اس نے سمجھا یہ ایک اور محبت میں ناکامی کی صورت ہورہی ہے۔ اس نے ایک اور افسانہ شائع کیا اور بتایا کہ کس طرح ایک امیر باپ کی بیٹی وایلن نواز کے ہنر پر مست و مدہوش ہوئی لیکن اس کے جری باپ نے اپنی بیٹی ایک مطرب کو دینے سے انکار کردیا۔ وایلن نواز اپنی ناکام محبت کے صدمہ سے جانبر نہ ہوسکا۔" ژالہ" نے یہ افسانہ پڑھ کر رشید کو لکھا "میں زہرہ یعنی وہ لڑکی نہیں ہوں جو اپنے محبوب کی ہلاکت کا سبب بنے" رشید اپنے اس نادیدہ محبوب کیلئے بے تاب رہنے لگا۔ خط پہ خط لکھتا رہا۔

ادھر "ژالہ" کے باپ کو اس معاشقہ کی خبر ہوئی وہ اپنی بیٹی کو لے جاکر بابلسر چلا گیا۔ ژالہ نے رشید کو لکھا کہ وہ اسے ہمیشہ کیلئے بھلا دے۔ رشید کی جان پھر آفت میں تھی۔ اس کا دل و دماغ برہم تھا وہ بھٹکتا پھرتا تھا۔ ایک رات کھمبے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اس کے دل و دماغ کی کیفیت اور روحانی کرب معلوم کرکے اس کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ دفتر اور مجلّہ کا کام چھوڑ کر گیلان کی طرف چلا گیا۔ اسے راحت ملی لیکن سیاہ چشموں کو دیکھ کر پھر ناکام عشق کی لو چمک اٹھتی تھی۔ بندر پہلوی رشت کی سیر کرتا کرتا بابلسر پہنچا۔ ایک دفعہ نہا رہا تھا کہ سمندر میں لڑکی ڈوب جانے کا غل ہوا۔ اس نے لڑکی کو بچا لیا۔ یہ ژالہ تھی۔ اس کے باپ نے ہوٹل میں بلا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ باتوں باتوں میں یہ راز کھلا کہ یہ صاحب رشید ہیں اور ژالہ کے محبوب اور ژالہ کے عاشق۔ تیمسار یعنی ژالہ کے باپ نے پولیس کی معرفت اس کو بابلسر سے نکلوا دیا۔ ژالہ نے اس کو خط لکھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو پا لیا ہے یا تم میرے ہوکر رہو گے یا پھر میں خودکشی کرلوں گی۔ رشید عجیب کشمکش میں تھا راستہ میں ایک قہوہ خانے میں بیٹھے ژالہ کو مخاطب کرکے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور آخر میں لکھا "ای ایران، ای وطن من، ترا ہمیں ترا! ای محبوب عزیزم دوست میدارم" اور تہران آکر دو تین مہینے بعد مجلّہ میں شائع کرایا۔ ژالہ کا باپ آخری سطروں کو پڑھ کر جس میں وطن پرستی کا ولولہ پایا جاتا تھا بہت متاثر ہوا اور رشید سے دوستی کا اظہار کیا اور اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔

مصنف نے اس کہانی کو جس جاذبیت اور لطافت سے بیان کیا ہے وہ نہایت خوب ہے۔ جذبات کے خلوص کے ساتھ ساتھ تخیل کی صداقت پڑھنے والے کو مجذوب رکھتی ہے۔ مریم اور ژالہ دونوں کی کہانیوں میں پلاٹ کو بڑی مہارت سے موڑ دیا ہے۔ پڑھنے والا مریم کے بارے میں بھی خیال کرتا ہے۔ اب شادی ہوئی اور ژالہ کے ساتھ بابلسر میں حادثاتی وصال ہونے کی وجہ سے یہی خیال ہوتا ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو دینے پر رضامند ہوجائے گا لیکن زندگی میں تلخ حوادث کا تصور دلانے کیلئے دونوں جگہ مصنف نے پڑھنے والے کو خوبصورتی سے معطل رکھا ہے۔

مصنف کا اسلوب بیان سادہ اور صریح ہے۔ بیان میں کہیں الجھاؤ نہیں دو تین جگہ ادب لطیف کے نمونے بھی ملتے ہیں یعنی مصنف اپنے احساسات اور جذبات کو شعری نثر میں لکھتا ہے مریم کی قبر پر شمع کو مخاطب کرکے "ان دوست میدارم" کے عنوان سے جو دو ٹکڑے لکھے ہیں اس سے مصنف کی ادبی مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ مناظر فطرت کے تاثرات بھی دلکش ہیں۔ سفر

گیلان کی کیفیت بھی خوب دلچسپ ہے خاص طور پر انسانی قلب و دماغ کی کیفیات بڑی سچی اور جاذب ہیں۔ تخیل بھی واضح ہے۔ کہانی کا تاروپود تو صراحت تخیل پر منحصر ہے۔ کہانی کا پلاٹ مشکل تھا۔ **نویسندہ**، تین شخصوں کو نباہ رہا تھا۔ ایک طرف وہ وزارت دارائی میں 'مالیات معوقہ' کے متعلق جمع و تفریق کرنے میں مصروف تھا۔ دوسری طرف مجلّہ کیلئے کہانیاں لکھتا تھا تیسرے اپنے عشق کی داستان بھی ساتھ ساتھ لپیٹ رہا تھا۔ جزی حوادث کو شامل کرکے کہانی کو مضبوط کیا ہے۔

مصنف ہر کردار کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ سب کردار واضح ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔ خود رشید، مریم، اور ارباب قاسم کے کردار ابھرے ابھرے ہیں۔ ژالہ کی شخصیت صرف اس کے خطوط سے واضح ہے۔ اس کا کوئی عمل ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اس نے مریم سے شادی کرلینے کے بارے میں جو خط رشید کو لکھا ہے وہ اس کی بلندی فکر اور سوز زندگی کا نشان بتاتا ہے۔

ماجری: ایک لڑکی کا قصہ ہے۔ ساتھ ساتھ ایران کی سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی زندگی پر بھی تبصرہ ہے۔ پروین امیر طغرل سالار لرستان کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں بچپن میں ہی مرگئی۔ طغرل کے والد کو باغی سمجھ کر تہران میں لے گئے اور قید خانہ میں اس کی جان لے لی۔ اس کی جائیداد بھی ضبط کرلی۔ طغرل بے سہارا رہ گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب سروان کریم خاں بروجرد میں رئیس **نظمیہ** متعین ہوکر آیا تو اس نے طغرل کو جبری فوجی تربیت کیلئے بلایا لیکن کسی وسیلہ سے ایک ہزار تومان لیکر معافی کی اجازت دلا دی۔ لیکن طغرل کے قد و قامت اور جوانی کو دیکھ کر وہ اس سے اور کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے رشوت کا روپیہ واپس کردیا اور معافی نامہ واپس لے لیا۔ بعد میں دلالہ کی وساطت سے اپنی لڑکی شریف الملوک کو اس سے بیاہ دیا۔ یہ لڑکی اخلاقی طور پر داغدار ہوکر وضع حمل بھی کرا چکی تھی۔ طغرل گھر داماد بن کر ان کے ہاں چلا گیا۔ جب سروان کریم خاں بروجرد سے تبدیل ہوگیا تو مجبوراً طغرل و شریف کو واپس اپنے مکان میں آنا پڑا۔ بعد میں بیوی کے اصرار پر تہران چلا گیا۔ وہ ای فوجی ادارہ میں اردلی کی حیثیت سے ملازم ہوگیا۔ اتفاق سے اس کی ماں مرگئی اور وہ بروجرد چلا گیا۔ ایک مہینہ کے قیام میں اس کے نصیب جاگے۔ باپ کی ضبط شدہ میراث واپس مل گئی۔ شریف بھی اس کے پیچھے ہی بروجرد پہنچی۔ وہ اپنے لئے ایک شاندار مکان بنوا رہا تھا کہ ایک دن فوجیوں نے اس کے مکان کو گھیر لیا اور گرفتار کرکے تہران لے آئے۔ اس شبہ میں کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح مرکزی حکومت سے بغاوت کا خیال رکھتا ہے لیکن تفتیش کے بعد اس کو صرف تہران میں نظربند کردیا۔

جب طغرل تہران آیا تو اپنی بچی اور اس کی دایہ کو بھی ساتھ لے آیا۔ شریف کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ ذرا بڑا ہوا تو شریف نے سوتیلی ماں کے پنجے نکالے اور لڑکی کو عذاب دینا شروع کیا۔ آخر زور دیا کہ اس کو مدرسے سے اٹھوا لیا جائے اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ طغرل کو پروین اور اس کی دایہ کو واپس بردجرد بھیجنا پڑا۔ دایہ اور پروین اکیلے موٹروں کے اڈے پر گئے۔ منصور اور سہراب نے انہیں تنہا پاکر ایک عورت کو شریک کیا اور اپنی موٹر میں سواری بٹھا کر لے جانے کیلئے رضامند کیا۔ بردجرد کے بجائے وہ ایک بیابان کی طرف چل دیئے۔ راستے میں بڑھیا کو اتار پھینکا۔ دو ہزار تومان اور سامان لوٹ لیا۔ منصور اور سہراب پروین پر جھگڑا کر رہے تھے کہ پروین موٹر سے نکل کر ذرا دور ہوگئی۔ اتنے میں ایک اور موٹر کی روشنی پہنچی تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ اس موٹر میں اجلال اور اس کی بیگم آرہے تھے۔ انہوں نے پروین کو اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ اجلال صاحب کرمان کے گورنر تھے بعد میں اسمبلی کے نمائندہ بھی رہے اور تہران میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہوگئے۔ پروین کو انہوں نے اپنی بیٹی کی طرح تربیت کیا اور تعلیم دلائی۔ طغرل بیٹی اور دایہ کی گمشدگی پر افسردہ ہوا۔ پولیس تلاش کے باوجود ناکام رہی۔ طغرل نے اپنی جائیداد کے بل پر تہران میں محل سا بنوالیا تھا۔ بڑی آسائش و عیش کی زندگی بسر کررہا تھا۔ سیاست مداروں اور ارکان حکومت سے راہ رسم پیدا کرنے کے بعد مجلس شوریٰ ملی کا نمائندہ بھی منتخب ہو چکا تھا۔

دایہ کو ایک قافلہ والوں نے اٹھایا اور تہران جانے کا وسیلہ بنادیا۔ وہ ایک صاحب کے گھر خادمہ بن گئی۔ ان کا ایک نوکر عباس تھا۔ دایہ نے اپنی دکھیا بھری داستان سنائی۔ فرصت کے اوقات میں وہ منصور اور سہراب کی تلاش میں رہے۔ آخر ایک قہوہ خانے میں ان کو ڈھونڈ نکالا جو انہوں نے خود کھولا ہوا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا راز فاش ہوگیا ہے تو وہ عباس کو مار ڈالنے کے درپے ہوئے۔ شور سن کر حمید بھی وہاں پہنچا۔ یہ نوجوان افسر شریف الملوک کا بھائی تھا۔ اب تینوں رازدار بن گئے۔ انہوں نے مدرسہ سے آتے آتے پروین کو پہچان لیا۔ حمید نے شریف کو بھی لے جاکر دکھایا۔ شریف نے بھائی کو اکسایا۔ روپیہ صرف کیا اور پروین کو نابود کرنے کیلئے جوش دلایا۔ حمید خود پروین کی جوانی اور حسن پر فریفتہ تھا۔ ایک دن تینوں نے سازش کرکے پروین کو موٹر میں بٹھایا اور دور دراز گاؤں میں لے جاکر بند کردیا۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ جناب اجلال کی لڑکی گم ہوگئی۔ عباس نے دایہ کو بتایا وہ بھکارن بن کر اس کے گاؤں میں پہنچی اور اس کو بچا کر لے آئی اور اپنے پاس رکھا۔ ایک دفعہ طغرل نے ان کو دیکھ لیا اور گھر لے گیا۔

شریف کو معلوم ہوا تو اس پر سکتہ طاری ہوا۔ آخر اس پر فالج گرا اور اس کی زندگی ختم ہوئی۔ جب پولیس کو راز معلوم ہوا تو انہوں نے طغرل کے ہاتھوں اجلال کے خلاف اغوائے دختر کی شکایت کروائی اور اجلال کو گرفتار کرلیا گیا بعد میں اس بہانے سے کہ طغرل نے پروین کو بیانات کیلئے پیش کیا۔ اس کو بھی قید کردیا گیا۔ آخر جب رضا شاہ کبیر تخت چھوڑ کر ایران سے چل گئے تو عام معافی کے تحت قیدیوں کی رہائی ہوئی۔ پروین کی شادی جناب اجلال کے صاحبزادے انوشیرواں سے ہوگئی اور دو محبت بھرے دل مل گئے۔

یہ تو اس ناول کی کہانی کا خلاصہ ہے مگر مصنف نے اس کے پلاٹ کو جن پیچ و خم سے گزار کر اس کو انجام تک پہنچایا ہے اور اس میں جو جو دلبستگیاں پیدا کی ہیں۔ وہ تبھی سمجھ میں آسکتی ہیں جب ہمیں معلوم ہو کہ اشخاص قصہ نے اس کہانی میں کیا کیا کردار نبھایا ہے اور وہ کہاں کہاں تک ان واقعات میں شریک ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے لیجئے عباس کو۔ یہ زنجان کا رہنے والا ایک شریف نوجوان تھا۔ اجباری فوجی خدمت میں تہران میں تھا اور ایک افسر کے ساتھ اردلی تھا اس گھر میں دایہ خانم خادم آکر رہی۔ اس نے دایہ کی درد بھری داستان سنی اور ڈاکوؤں کا سراغ نکالا۔ اپنی جان کو خطرے میں بھی ڈالا۔ اس کی ملازمت ختم ہوئی تو حمید نے اس کو اپنے ہتھے چڑھایا اور اپنی ہوس کی تکمیل کیلئے اس کو بھی آلہ کار اور رازدار بنایا جب وہ اپنی ماں کی خبرگیری کیلئے زنجان جارہا تھا تو اس نے بسوں کے اڈے پر انوشیرواں (پسر اجلال) کو ٹکٹ لانے میں مدد دی۔ پھر وہ قزوین میں انوشیرواں کو ملا جو پروین کی تلاش میں غلط ٹکٹ خرید کر قزوین آپہنچا تھا۔ انوشیرواں نے اپنی بہن پروین کے گم ہوجانے کا قصہ بیان کیا اور اس کو ایک رقعہ دیا کہ اس کے والد کو پہنچا دے۔ عباس رقعہ دینے گیا تو حمید نے دیکھ لیا۔ جب اسے انوشیرواں کی موجودگی کا علم ہوا تو اس نے اپنے حریف کو راستے سے ہٹانے کیلئے سازش کی اور کہا کہ وہ اس کے پاس جائے اور کہے کہ پرین قریب کے گاؤں میں ہے اور وہ اس کے پاس لے جائے گا۔ سہراب اور منصور موٹرے لیکر اس کو لینے آئیں گے۔ جب وہ لینے آئے اور کار میں بیٹھے تو تھوڑی دور جاکر وہ دوسرے راستے پر جالئے۔ عباس کو شبہ ہوا اور انوش کو بھی ہوشیار کیا۔ عباس نے سہراب کے منہ پر کپڑا ڈالا اور کار رک گئی۔ منصور نے چاقو مار کر عباس کو زخمی کر دیا اور بھاگ گیا۔ انوش نے سہراب کو گولی مار کر زخمی کردیا۔ پولیس کے گشتی دستے نے عباس اور سہراب کو گرفتار کرکے ہسپتال میں پہنچا دیا۔ وہاں دایہ خانم سے ملاقات ہوئی جو اب ہسپتال میں خادمہ بن کر کام کررہی تھی۔ عباس نے دایہ کو پروین کا پتہ

بتایا۔ عباس جیل سے رہا ہوا تو امیر طغرل کے گھر ملازم ہوگیا۔ اس نے آخر تک فداکارانہ کردار ادا کیا۔ پروین کے خط چھپے چوری انوش تک پہنچائے۔

• عباس سے زیادہ جاں نثارانہ کردار دایہ خانم کا ہے جس نے پروین کو پرورش کیا اس کے درد دکھ میں شریک ہوئی۔ اگرچہ وہ گاؤں کی سادہ لوح بڑھیا تھی لیکن اس نے بڑی جرات اور جانبازی کا ثبوت دیا۔ جب وہ پروین کی تلاش میں چل پڑی تو موٹر میں بیٹھ کر اس نے منصور کے سر پر زور سے ڈنڈا مارا کہ اس کو بے ہوش کردیا۔ اس نے پروین کو ہر مصیبت میں حوصلہ دیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے انوش کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا اور طغرل کو فرض پدرانہ یاد دلایا۔ طغرل کا کردار پہلے پہلے تو جوان مردانہ نظر آتا تھا کہ وہ دیہاتی فضا میں پہلا ہوا شہلا جوان خوددار' بہادر اور شریف ثابت ہوگا کیونکہ وہ اپنی نوجوان بیوی کی وفات پر رنجیدہ تھا' اپنی بچی سے محبت کرتا تھا اور دوسری شادی کا نام نہیں لیا تھا لیکن بعد میں وہ اس قدر غافل ہوا اور اپنی بیوی اور ساس اور سسر کے ایسے شکنجے میں آیا کہ کٹھ پتلی ہوکر رہ گیا۔ دولت ملی تو افیون اور شراب پینا شروع کردی۔ بیوی کی رضا کیلئے بچی کو مدرسے سے اٹھا کر گاؤں بھیجنا منظور کیا۔ اس کا سب سے افسوسناک' بزدلانہ اور احمقانہ یہ ارادہ تھا کہ وہ پروین کی شادی حمید خان سے کرنا چاہتا تھا جو عصمت لوٹنے اور برباد کرنے کیلئے اس کو اغواء کرکے لے گیا تھا۔ اس نے ایک اور بڑا بزدلانہ فعل کیا کہ رئیس شہربانی کے رعب میں آکر اپنی بیٹی کے محسن اور مربی کے خلاف اغوائے دختر کی شکایت کی اور اس کو جیل بھجوانے کا ذمہ دار بنا لیکن بعد میں وہ اپنے اعمال پر پشیمان ہوا۔ سب سے زیادہ قابل نفرت طغرل کی بیوی شریف کا کردار ہے جو مکروتزویر کا مجسمہ اور سنگدلی اور بے رحمی کا حقارت آمیز نمونہ تھی۔ اس نے پروین پر ظلم کیا۔ بیٹا آخر اس کو گھر سے باہر نکالا۔ جب وہ دوبارہ مل گئی تو اپنے بھائیوں کو بے دریغ روپیہ دیکر پروین کو برباد کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں بہت خوش ہوں گی۔ اگر یہ لڑکی چکلے میں جائے۔ آتشک و سوزاک کی مریض ہوکر چیتھڑے پہن کر بھیک مانگے اور میرا بیٹا اس کو روٹی کے ٹکڑے دے۔ آخر قدرت نے اس سے انتقام لیا اور وہ پشیمان ہوکر مری۔ شریف سے ملتا جلتا ذلیل کردار اس کے بھائی حمید خاں کا ہے جو ہوس کار' اوباش اور عیار بھی ہے وہ بہن سے خوب مال بٹورتا رہا۔ اس نے منصور اور سہراب کو اپنا آلہ کار بنایا۔ منوچہر کی عصبانیت سے فائدہ اٹھا کر پروین اور انوشیرواں کو خط لکھنے پر مجبور کیا تاکہ اغواء کرنے کا الزام اس پر آئے۔ وہ احمق بھی نکلا کہ پروین کے فریب میں آگیا اس نے یہ کتنی بڑی ذلت کی حرکت کی کہ جیل میں جاکر رئیس شہربانی کو پروین کے حسن و جمال کا شوق دلا

کر اس کے ستم کا شکار بنانا چاہا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ پروین کو کسی شہزادے سے متوسل کرکے خود فوج میں مراتب حاصل کرے۔ جہاں دوسرے بدمعاش اپنی سزاؤں کو پہنچے۔ سہراب کی ٹانگ کٹی۔ اس نے کئی کوڑے کھائے اور جیل میں مرا۔ منصور کو بھیڑیئے پھاڑ کر کھاگئے لیکن حمید جیل سے رہا ہوگیا۔ یہ حکمت سمجھ میں نہیں آئی کہ مصنف نے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔ اب صرف رہ گئی خود پروین جو مرکزی کردار ہے اور سارا ناول جس کے گرد محیط ہے وہ حسن صورت کے ساتھ درد مند اور حساس بھی تھی۔ اس نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اپنی عفت کو سنبھالا۔ اس نے گاؤں کے ایک ویران مکان میں تنہا حمید کو ایسا چکر دیا اور اپنی محبت کا ایسا یقین دلایا کہ وہ دست درازی سے باز رہا اور منصور سے جان بچانے میں تو اس نے نہایت ہی ہوشیاری اور عیاری سے کام لیا اور دایہ کو کار میں بٹھلا کر منصور کو اپنی طرف لگایا۔ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کو ایسا مجذوب کیا کہ دایہ نے اس کا کام تمام کیا۔ اس نے تہران میں داخل ہونے سے پہلے کار کو پٹرول ڈال کر آگ لگادی تاکہ اس پر شبہ کا امکان نہ ہو۔ اس کی نیک دلی اور ترحم کے کیا کہنے۔ اس نے شریف جیسی رزیل عورت کو بخش دیا۔ وہ اپنے حقوق کیلئے کتنی بے باک ہوگئی اس نے باپ کو بری طرح جھنجھوڑا۔ اس کے اعمال پر سرزنش کی اور اپنے آپ کو اس کی بیٹی نہ کہلانے اور ورثہ میں محروم ہوجانے کو افضل سمجھا اور حمید کے ساتھ بیاہ کرنے سے انکار کیا۔ وہ اپنی مظلومیت کے ساتھ ساتھ محبوب کردار ہے۔ اس نے اپنے لئے ہر دل میں محبت پیدا کی۔ انوش لندن میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس کی ماں بیگم اجلال نے پروین کا تعارف اس سے کرایا اور اس سے خط بھی لکھوایا پہلے تو برادرانہ محبت رہی اور پھر وہ عشق کی صورت اختیار کرگئی وہ پروین کو اپنے دوست منوچہر سے شادی پر مجبور کررہا تھا لیکن وہ صرف انوش کو چاہتی تھی اور یہ رمز کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جب وہ غائب ہوگئی اور انوش نے میز کی دراز میں اس کی یادداشتیں پڑھیں تو اس کا دل اس کی محبت سے جگمگا اٹھا۔ جب پروین واپس آگئی تو اس نے اس کی پاکدامنی پر یقین کرلیا اور اس کی شادی منتہائے سعادت تھی۔

اس پلاٹ اور کرداروں سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ کس فضا اور ماحول میں یہ سارا ماجرا واقع ہوا ہوگا۔ اس ناول میں مصنف نے رضا شاہ کبیر اور اس کے عہد سلطنت پر سخت تنقید کی ہے۔ لکھا ہے کہ ساری فضا میں ایک خوف و ہراس طاری تھا۔ ذکر و فکر کی آزادی نہ تھی۔ پولیس اور فوج کا نظام تھا۔ پولیس والے شیر تھے۔ پاک و بے نفس اور حب وطن سے سرشار جانیں جیلوں میں گل سڑ گئیں۔ انگریزوں نے ایران کو سیاسی گرفت میں لے رکھا تھا۔ امراء سیاست مدار'

نمائندگان مجالس تریاکی اور شرابی تھے۔ بادشاہ خود تریاکی تھا۔ رشوت عام تھی۔ اجباری فوجی خدمت بے چارے کسانوں' مزدوروں کیلئے ایک مصیبت تھی۔ رضاخاں کو ہدف ملامت بنایا ہے کہ وہ روسیوں کے خوف سے اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔ اگر وہ لڑ کر جان دیتا تو تاریخ میں جانباز وطن مشہور ہوتا۔ اس کے کارہائے نمایاں پر بھی تنقید کی ہے کہ اس کے عہد زریں میں کچھ اقتصادی ترقی نہیں ہوئی۔ عوام کی زندگی کا معیار بلند نہیں ہوا۔ خلیج فارس سے بحیرہ خزر تک جو ریلوے لائن بنائی گئی اور جس کی ساخت پر چپے چپے پر سیروں سونا خرچ ہوا۔ اقتصادی نقطہ نظر سے فائدہ بخش نہیں۔ ریلوے سے ان اقتصادی مراکز کو وابستہ کرنا چاہئے تھا۔ جہاں سے پیداوار اور مصنوعات کے حمل و نقل میں آسانی ہو۔ یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ یونیورسٹی کا کٹہرا الگ کھڑا کرنے کے بجائے عوام میں وسعت تعلیم کا انتظام کرنا چاہئے تھا وغیرہ۔

مجموعی طور پر کہانی دلچسپ ہے۔ پلاٹ کا جوڑ توڑ خوب ہے۔ پروین بعض اوقات ایسے حالات میں گھر جاتی ہے کہ اس کا بچ نکلنا محال ہوتا ہے لیکن مصنف ایسی صورت نکالتا ہے کہ اس کی سلامتی دیکھ کر مسرت اور لذت پیدا ہوتی ہے۔ پڑھنے والا گھبرا اٹھتا ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بدکرداروں کا انجام دیکھنے کیلئے بھی اضطراب رہتا ہے۔ کہانی کے آخر تک تعطل موجود رہتا ہے۔ بعض جگہ پلاٹ مصنوعی معلوم ہوتا ہے اور ناول حادثاتی رہ گیا ہے لیکن جس طرح ایک ایک کردار دوسرے کردار سے آشنا ہوتا ہے اور پھر جس طرح ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کے بعد ایک دوسرے کو دوبارہ ملتا ہے پلاٹ میں اس کا بناؤ اور نبھاؤ قابل تعریف ہے۔

سب کردار زندہ ہیں اور ایرانی زندگی کے چلتے پھرتے افراد ہیں۔ مصنف نے تہران اور اس کے ماحول کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ واقعات اور زمان و مکان کا بیان اس قدر واضح ہے کہ آپ خود کو ان بازاروں' مکانوں اور گلی کوچوں میں آتے جاتے محسوس کرتے ہیں۔

مہتاب

مہتاب بھی ایک مقصدی ناول ہے جس میں ازدواجی اور جنسی مسائل زندگی کے تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ کہانی بیان کرنے والا ایک ہنرمند وائلن نواز ہے جو ریڈیو کے پروگراموں میں آرکسٹرا کی رہنمائی کرتا ہے اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔ ایک دفعہ بس میں کسی بس جا رہا تھا کہ ایک سیاہ چشم تیز نظر لڑکی سے اس کی نگاہیں دوچار ہوئیں۔ اس سے متاثر

ہو کر اس نے آہنگ مہتاب بھی بنایا۔ دو تین سال اتفاق سے اپنے آرکسٹرا میں ایک مغنی ک ضرورت پڑی۔ اتفاق سے وہی لڑکی ملازم ہونے کیلئے آگئی۔ ناصر خاں راگ بتاتا اور وہ دلربا آوا سے گاتی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی دکھ بھری داستان سنائی یعنی کہ وہ یتیم ہے۔ ماں کے پاس رہتی تھی۔ متوسط تک تعلیم پائی۔ پروان چڑھی۔ گھر میں تیس پینتیس سال کا ایک شخص آیا کرتا تھا۔ لغزش ہوئی تو اس سے حمل ٹھہر گیا۔ پھر زبردستی شادی کرنی پڑی بچی ہوئی اور مرگئی۔ ایک دفعہ تہران کے ایک بازار میں کسی آوارہ گرد نے مذاق کیا اور تھپڑ مار کر گرا دیا۔ ایک افسر نے رحم کھایا اور اٹھا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس کی ہمدردی سے متاثر ہوئی اور اس کی یاد دل میں رکھی۔ وہ افسر یعنی کیومرث بھی اس کے حسن و جمال سے متاثر ہوا اور اس نے شادی کا پیغام بھیجا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فرج اللہ (اس کا شوہر) اس کا باپ ہے۔ وہ خط افسانہ (لڑکی کا نام) کے ہاتھ لگا۔ اس نے سچ سچ کہہ دیا کہ وہ شوہردار ہے لیکن عشق کی آگ سلگتی رہی اور کیومرث اور افسانہ چھپے چوری ملتے رہے۔ فرج اللہ نے دیکھ لیا اور طلاق دیدی۔ کیومرث کی ماں کو افسانہ کی سابقہ زندگی کا علم ہو گیا اس لئے وہ ان کی شادی میں مانع تھی جب وہ مرگئی اور موانع اٹھے گئے تو کیومرث ایک اور شوہردار اور دولت مند تیس پینتیس سالہ خوبصورت عورت کے ہتھے پر چڑھ گیا اور عشق و فسق کی زندگی گزارنے لگا۔ ظاہرداری کیلئے اس نے افسانہ سے بھی شادی کرلی۔ وہ عورت یعنی فرشتہ خانم ایک سالار کی بیٹی تھی۔

.... اس نے کئی نوجوانوں کو پھانسا اور پھر چھوڑ دیا۔ کیومرث اس سے جدائی کی تاب نہ لاسکا اور اس کو قتل کرنے پر تل پڑا۔ فرشتہ کے شوہر نے دوبارہ ان کو اکٹھا دیکھ کر دونوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ تفتیش ہوئی تو ناصر خاں پر قتل کا الزام لگا بات یہ بنائی کہ وہ اب فرشتہ سے عشق کرتا تھا اور دوسری طرف افسانہ کو اپنے آرکسٹرا میں رکھ کر استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے اس کے شوہر اور رقیب کیومرث کو قتل کر دیا۔ آخر عدالت میں فرشتہ کے شوہر نے اصل حقیقت بیان کر دی ناصر خاں رہا ہوئے۔ افسانہ کی ماں مرگئی اور وہ مایوس و نامراد ہو کر یورپ چلی گئی۔

یہ ایک سیدھی سی کہانی ہے۔ کہانی میں ایچ پیچ نہیں۔ کردار بھی مختصر ہیں۔ مصنف نے افسانہ کی سابقہ زندگی بیان کرنے میں ناول کا زیادہ حصہ صرف کر دیا ہے اور جب سے راوی یعنی وائلن نواز قصہ میں شامل ہوا ہے وہ حصہ تھوڑا ہے۔ مصنف نے یہ بتا کر کہ افسانہ نے اپنی آپ بیتی ایک قہوہ خانے میں بیان کی اور ساری رات اپنا قصہ بیان کرتی رہی۔ خواہ مخواہ کہانی کو غیر طبعی بنا دیا ہے کیونکہ اس نے اپنی داستان میں تمام خطوط نقل کئے ہیں جو کیومرث اور افسانہ کے

درمیان ردوبدل ہوئے اور قہوہ خانہ بھی ساری رات نہیں کھلا رہتا کہ بیگانے مرد عورت بیٹھ کر کہانی کہتے رہیں۔

ناول کی افادیت اور مقصدیت واضح ہے۔ انمل اور بے جوڑ شادیاں کس قدر تباہ کن اثرات رکھتی ہیں۔ ماں باپ کی جہالت، غفلت اور رسم و رواج کی اندھی تقلید ہے کہ وہ مادی اغراض کی خاطر اپنی لڑکیاں قصائی کے کھونٹے پر باندھ دیتے ہیں۔ تربیت یافتہ حسین و جمیل لڑکیاں اپنے حسن و ذوق کی تسکین نہیں پاتیں اور بے راہ زندگی اختیار کرلیتی ہیں۔ اس کہان میں الھڑ بے لگام نوجوانوں کیلئے بھی سبق موجود ہے کہ اپنے اندھے جذبات کے ہاتھوں حسن و دولت کے دام میں گرفتار ہوکر اپنی زندگیوں کو خطرہ کی آماجگاہ بناتے ہیں۔ دوسرے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی ایک بدبخت عورت کی داستان ہے۔ ماں اپنی بیٹی کو کہتی ہے یہ نہ بھول کہ تو عورت ہے اور عورت بھی ایرانی عورت یعنی محنت کش روزگار، ہرلحاظ سے بدبخت۔ تجھے اپنے فرض کو پہنچاننا چاہئے اور تمام حوادث میں آرام و استقلال سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس کہانی میں بھی دکھ ہے لیکن نو یسندہ اور ماجرا جیسا سوزو اخلاص نہیں۔ ان کہانیوں میں دو ایک جگہ سوزو غم کی وجہ سے دم گھٹنے لگتا ہے۔

کرداروں میں ذہنی اور قلبی کشمکش یہاں بھی موجود ہے۔ عشق و فراق کی کشاکش میں پستے چلے جارہے ہیں۔ کوئی کردار محبوب نہیں۔ افسانہ اپنے کمال ہنر کے باوجود گھناؤنی ہوگئی ہے اور ہماری خاص ہمدردی حاصل نہیں کرتی۔ افسانہ کی ماں کا کردار قابل ترحم ہے۔ اس نے محنت و جفاکشی سے بیٹی کو تعلیم دلائی اور اس کی زندگی کے مدوجزر میں شریک رہی اور ہر آڑے وقت میں مشورے دیتی رہی۔ وہ غلطیاں کرنے والی اور غلطیوں کی اصلاح کرنے والی ماں تھی۔ آخر پے درپے حوادث کے نیچے پس گئی۔ ناصر خاں کا کردار اچھا ہے اور ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ ایک طرف وہ بیوی کی زنجیروں سے پابند ہے۔ دوسری طرف افسانہ کی سحرکارانہ سیاہ چشمی اور دلگداز آواز اس کیلئے الہام سے کم نہیں تھی لیکن وہ بے بس تھا اور اندر ہی اندر گھلتا تھا۔ اس کردار کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف موسیقی سے آشنا ہے اور راگوں کو جانتا ہے تبھی تو وایلن نواز کی زبان سے اس کا اپنا کردار بیان سکتا ہے۔

محمد علی افغانی

محمد علی افغانی صنعت سے وابستہ ایک خاندان میں 1304 ش / 1925 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم سے فراغت کے بعد تہران میں دانش کدہ افسران نظامی میں داخل ہوئے اور 1328/ 1949ء میں ڈگری حاصل کی۔ 1950 میں وہ مزید مطالعہ کیلئے سات مہینوں کیلئے امریکہ گئے۔ واپسی پر تہران میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے فوج میں داخل ہوئے۔ سیاسی وجوہ کی بنا پر 1954ء میں موت کی سزا ملی جو بعد میں عمرقید کی سزا میں تبدیل ہوگئی۔ 1960ء میں سزا معاف ہوگئی۔ آجکل وہ ایک جاپانی کمپنی میں ملازم ہیں۔

افغانی، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں وہ فارسی کے معاصر مصنفین سے بھی آشنا ہیں۔ ان کے دو ناول شائع ہوچکے ہیں 1- شوہر آہو خانم 2- سیندخت 1360 ش

شوہر آہو خانم

افغانی کا ناول "شوہر آہو خانم" 863 صفحات پر مشتمل 1961 میں شائع ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اخبار وجرائد میں اس کا اتنا چرچا ہوا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

بزرگ علوی مشہور افسانہ نگار، نقاد اور محقق نے اس ناول کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اگر ایک شخص اس بات کا جائزہ لے کہ اس ناول میں ایرانی معاشرے کے بہت سے مسائل سے بحث کی ہے اور ناول کے سٹائل اور ترتیب و ترکیب کو مدنظر رکھا جائے اور عوامی محاورے کو بھی زیر نظر رکھا جائے تو اس کے فنی محاسن اور معاشرتی قدر و قیمت کے اعتبار سے فارسی نثر کے ارتقاء میں اس ناول کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

اس ناول میں فارسی محاورے میں اصناف، کاسب کار یا اہل بازار، دستکار اور پیشہ ور اشخاص کی زندگی اور ان کے احوال و کوائف کا دقیق مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اس ناول میں مصنف نے ایک نانبائی کی گھریلو زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی دکانداری میں دوسرے کارکنوں، شاگردوں اور ملازمین سے اس کے تعلقات بیان کئے ہیں۔ مالک یا استاد اور اس کے دوسرے ملازمین اہل خانہ کے امتیازات اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک طبقہ خوشحال ہے دوسرا اس کا محتاج و طفیلی۔ مصنف نے نانبائی، اس کی بیوی، اس کے لڑکوں اور

لڑکیوں کے کرداروں کو علیحدہ علیحدہ خصوصیات اور ان کے باہمی روابط کو خوب اجاگر کیا ہے۔ اشخاص قصہ کے مذہبی عقائد اور رجحانات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

1- **یاد نامہ یان ریپکا** _ پراگ 1968، مقالہ از محمد علی جمالزادہ بعنوان

She have Ahu Khanum recent persion novel of out standing quality,
PP 173 - 170

افغانی نے خاندان نانبا اور اس کے کاروبار سے متعلق ایسی تفاصیل اور ایسی **واقعیت** سے کوائف بیان کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس کنبے کا ایک فرد ہے۔ 1963ء میں "شوہر آہو خانم" کو سال کی بہترین کتاب کا انعام ملا۔

کرمانشاہ میں سید میران نانوا کے خاندان کا قصہ ہے۔ اس کی بیوی آہو خانم اور بچے بھی ہیں۔ ایک اور جوان طرار عورت ہما اپنے کرشمہ و ناز سے سید مردان کو گرویدہ بناتی ہے اور وہ اسے داشتہ بنا کر گھر لے آتا ہے چنانچہ گھر کا امن تہہ و بالا ہو جاتا ہے۔ آہو خانم اپنے حقوق کی بازیافت کیلئے صبرو استقلال کے ساتھ جدوجہد کرتی ہے اور آخر میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

محمد علی افغانی نے اس ناول میں شوہر کی مقتدرانہ اور ظالمانہ حیثیت، قانون اور رسم و رواج کی قیود میں جکڑی ہوئی ایرانی عورت کی مظلوم و مقہور زندگی کو اجاگر کیا ہے جس مہارت سے اس نے ایرانی معاشرے کی اس دکھتی رگ کو چھیڑا ہے اور جس کمال ہنرمندی سے اس کو بیان کیا ہے۔ فارسی نثر کی تاریخ میں بے مثل ہے۔

ناول کے کردار جیتے جاگتے متحرک ہیں اور خاندانوں میں ان سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ بڑی صراحت و وضاحت اور جزئیات نگاری سے انہیں متعارف کرایا گیا ہے۔ ہر کردار انفرادی اور اجتماعی حیثیت کا حامل ہے۔ ہر کردار کا موضوعی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے مشاہدات غائر ہیں۔ ہر منظر کو کمال صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

مصنف نے کردار کی ذہنی و عملی سطح کو مد نظر نہیں رکھا اور اس کی زبانی ایسے علوم و فنون کے متعلق تبصرے کرائے ہیں اور نظریئے بیان کئے ہیں جو **واقعیت** کے خلاف ہیں۔ مثلاً سید میران نانبا جو دستخط بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ **لپکل** اور بالزاک کے حوالے دیتا ہے اور فن، فلسفہ اور موسیقی پر رائے دیتا ہے۔ ہما ایک دہقانی لڑکی اوتھیلو اور ڈون کواکزوٹ کے نام لیتی ہے وہ کلوپٹرہ اور ہندوؤں کی رسم ستی سے آشنا ہے۔ حسین خان قحبہ خانہ کا سرپرست **کنفیوشس** اور بدھا کے اعتقادات سے بحث کرتا ہے۔ آہو خانم آخر میں انسانی معاشرے کی پیچیدہ مسائل کا تجزیہ

پیش کرتی ہے۔

بعض جگہ مکالمے طویل کردیئے گئے ہیں اور بیانیہ مناظر نامناسب حد تک پھیل گئے ہیں۔

عصر حاضر میں پریس

ایران میں سب سے پہلا اخبار محمد شاہ قاچار کے عہد سلطنت یعنی 1253ھ "کاغذ" کے نام سے جاری ہوا۔ مرزا صالح شیرازی اس کے ایڈیٹر تھے۔ مرزا صاحب انگلستان میں تین ساڑھے تین سال رہے۔ انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں کے علاوہ انہوں نے چھاپہ خانہ کی سیاہی بنانے کی ترکیب بھی سیکھی۔ ان کا اخبار دو بڑے سائز کے صفحوں پر مشتمل تھا۔ صفحے کے ایک طرف ہی لکھا جاتا تھا۔ اس کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک میں اخبار ممالک شرقیہ اور دوسرے میں اخبار ممالک غربیہ، یہ اخبار مہینے میں ایک بار شائع ہوتا تھا اور لتھو میں چھپتا تھا۔

دوسرا اخبار 7 فروری 1781ء میں دس سال کے بعد امیر کبیر نے روزنامچہ اخبار "دار الخلافہ تہران" کے نام سے جاری کیا۔ پھر یہی اخبار روزنامہ "وقایع اتفاقیہ" کے نام سے جاری رہا۔ ہفتہ میں ایک بار چھپتا تھا۔ اس کے مدیر حاجی مرزا جبار ناظم المہام تھے۔ 1870ء میں اس کا نام روزنامہ "دولت عالیہ ایران" رکھ دیا گیا۔ اس میں مشہور و معروف اشخاص کی تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ اسی زمانے میں چند ایک اور اخبار بھی چھپنے شروع ہوئے لیکن اکثر اخبار سرکاری ہوتے تھے۔ جو ادارہ دارالطباعہ مبارکہ کی زیر نگرانی چھپتے تھے۔ محمد خاں ضیع الدولہ کی ادارت میں ایران، مریخ اور علم کے نام سے اسی قسم کے اخبار جاری ہوئے۔ اراکین سلطنت، امراء اور دوسرے افسر چندہ دیتے تھے۔ کچھ اخبار صوبہ، گورنروں اور ضلع افسروں کو بھی بھیجے جاتے تھے جو سال میں ایک مرتبہ اخبار کی قیمت وصول کر کے بھیجا کرتے تھے۔ ان اخبارات کی کوئی مقبولیت نہ ہوئی۔ اس لئے ناصرالدین شاہ قاچار نے 16 مئی 1867ء کو حکم جاری کیا کہ تمام افسران اخبارات کی فروخت میں مدد دیں۔ اگر وہ قیمت وصول کر کے نہیں بھیجیں گے تو یہ رقم ان کی تنخواہوں سے کاٹ لی جائے گی۔ ان کے ذمہ 1100 اخبار کی تقسیم واجب تھی۔ مظفر الدین شاہ کے زمانے میں یعنی 1906ء میں سب سے پہلا آزاد اخبار روزنامہ "مجلس" کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید محمد طباطبائی تھے۔ اس زمانے میں اخبارات دو قسم کے ہوتے تھے۔ روزنامہ ہائے دولتی اور روزنامہ ہائے آزاد ایک سرکاری اخبار 1898ء میں **خلاصتہ** الحوادث کے نام سے جاری ہو چکا تھا۔ یہ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ رائٹر تار کے ذریعے ہندوستان میں خبریں بھیجتا تھا جو وہاں کے اخباروں میں چھپتی تھیں۔ ان خبروں کی ایک نقل تہران میں انگریزی سفارتخانہ اور شاہ ایران کو پہنچتی

تھی۔ یہ اخبار ہفتے میں پانچ مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ جمعہ اور اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔

اعلان مشروطیت کے بعد یعنی 1906ء میں "مجلس، ندائی وطن، حبل المتین" اور صبح صادق کے نام سے چار غیر سرکاری اخبار جاری ہوئے جو پہلے ہفتہ وار تھے پھر روزانہ شائع ہونے لگے۔

ایران میں سب سے پہلا علمی اور فنی اخبار 1864ء میں اور طنزیہ و مذاحیہ پرچہ "طلوع" کے نام سے 1900ء میں بوشہر سے جاری ہوا۔

1908ء سے پہلے اخباروں کو آزادی نہیں تھی چھپنے سے پہلے خبروں کو سنسر کرانا پڑتا تھا۔ باہر آنے والے اخبار و جرائد پر بھی پابندیاں ہوتی تھیں۔ کلکتہ کے حبل المتین اور قاہرہ کے ثریا کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ لوگ چھپے چوری ان کے پرجوش مضامین پڑھتے تھے۔ 1910ء میں ان کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ آزادی پسندوں اور وطن پرستوں نے شب نامے نکالنے شروع کئے جو چھپے چوری دستی لکھے ہوتے تھے۔ 1905ء اور 1906ء کے درمیان یہ شب نامے تہران میں جاری رہے۔ ایرانی مجلس کے قیام کے باوجود اخباروں پر سختی ہوتی تھی۔ مظفر الدین شاہ نے اکثر اخباروں کو بند کردیا اور مدیروں کو قید کردیا لیکن چند وطن دوست اور تعلیم یافتہ اشخاص نے انجمن گلستان بنا کر متحدہ کوشش کی اور پریس کی آزادی کیلئے پارلیمنٹ سے ایک بل منظور کرایا جس کے دوسرے دن ہی اخباروں نے آزادانہ رائے کا اظہار کیا اور سنسر کی پابندی ختم ہوئی۔ عوام میں حکومت کے استبداد کے خلاف جذبہ نفرت پیدا ہوا۔ آخر محمد علی شاہ نے 1908ء میں مجلس پر بمباری کرائی ہے۔ اخبار نویسوں اور مدیروں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ روح القدس اور صور اسرافیل کے مدیروں کو مروا ڈالا۔ بعض ایڈیٹر یورپ، مصر اور ہندوستان بھاگ گئے۔

1909ء میں محمد علی شاہ بھاگ گیا اور اس نے روسی سفارتخانے میں پناہ ڈالی۔ اس کے بعد سلطان احمد شاہ نابالغ کو عضد الدولہ کی سرپرستی میں بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ نئی پارلیمنٹ بنائی گئی۔ قومی رہنما اور اخباروں کے مدیر اپنے ملک میں واپس آگئے۔ پھر سے اخباری جاری ہوئے۔ سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے۔ جمہوریت پسندوں، اعتدالیوں اور حزب اتفاق اور ترقی شرق، کی جماعت نے ایران نو، شوریٰ اور استقلال ایران کے نام سے اخبار جاری کئے۔ اشاعت بھی بڑھ گئی۔ "صور اسرافیل" پانچ ہزار اور "مجلس" دس دس ہزار تک چھپتا رہا۔

1911ء میں پھر مجلس توڑ دی گئی۔ روسیوں کے ظلم و تشدد کی وجہ سے بہت سے اخبارات بند ہوگئے۔ اخباروں کے مدیر جلا وطن ہو کر دوسری جگہوں میں چلے گئے۔ ملک الشعراء بہار مشہد سے تہران چلے آئے اور ان کے اخبار "نوبہار" اور "تازہ بہار" کی اشاعت بند ہوگئی۔

1914ء میں جب تیسری مرتبہ پارلیمنٹ وجود میں آئی تو ملی اخبار پھر سے جاری ہونے شروع
ئے۔ "نوبہار' شوریٰ اور رعد" تہران سے جاری ہوئے۔ ستارہ ایران اور بامداد روشن
السلطنت کی طرف سے شائع ہوئے۔ جنگ عظیم میں بین الاقوامی خبروں کی بڑی وقعت ہوئی۔
زاد اخباروں کی تنقید حکومت کو راس نہ آئی۔ چنانچہ وزیراعظم مستونی الممالک نے 1918ء میں
ب نیم سرکاری اخبار "ایران" کے علاوہ سب اخبارات کی اشاعت بند کرادی۔

جنگ عظیم کے بعد ملک میں بدامنی پھیل رہی تھی۔ یورپین طاقتیں ایران کے خلاف
ازشوں میں مصروف تھیں۔ شاہ ایران اکثر یورپ میں رہتا تھا۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس سے
ابستہ نہ رہیں۔ 1923ء میں وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا اور 1930ء میں وہیں وفات پائی۔ دسمبر 1925ء
یں مجلس ملی نے رضا شاہ کو بادشاہ منتخب کیا جو 1941ء تک حکمران رہا۔ رضا شاہ نے ایک طرف تو
بے لگام اور تیز و تند لکھنے والوں کو روکا اور دوسری طرف ان کی رہنمائی اور ان کے کام کی دیکھ
بھال کیلئے ایک خاص ادارہ قائم کیا۔ پہلے دور کے اکثر اخبار بند ہوگئے لیکن ان کے بجائے نئے
اخبارات نئے انتظامات کے ساتھ جاری ہوئے۔ ان میں سے اطلاعات' ایران' گیہان' ستارۂ
ایران' کوشش اور اقدام وغیرہ کثیر الاشاعت تھے اور آج تک جاری ہیں۔

مشروطیت سے پہلے "طلوع" اور "ایران" کے چند شماروں کے علاوہ تمام اخبارات لتھو میں چھپتے تھے۔ بعض جرائد میں تصویریں بھی چھپتی تھی۔ ان کے چھاپنے میں کاغذ اور سیاہی کی کافی مشکلات حائل ہوتی تھیں۔ استبداد کی وجہ سے تنقیدی حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ خبروں کی فراہمی کوئی مرتب صورت میں نہ تھی۔

آجکل اخبار و جرائد ٹائپ میں چھپتے ہیں۔ خبروں کی بہم رسانی کیلئے خبروں کی ایجنسیاں قائم ہیں۔ خبروں کے لحاظ سے بھی اور تنقید مطالب کے لحاظ سے بھی اخبار و جرائد کا معیار کافی بلند ہوچکا ہے ہر قسم کی سادہ و رنگین چھپائی کا انتظام ہے غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی کافی تعداد میں پہنچتے ہیں۔

اخبار و جرائد نے بھی زبان کے تحول میں بڑا اہم حصہ لیا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ خبروں کی فراوانی اور سیاسیات کی روزمرہ تبدیلیوں نے مجبور کیا کہ جلد سے جلد خبریں شائع ہوں اور اخبار کے مدیر اور دوسرے سیاسی رہنما اپنے خیالات اور تاثرات دوسروں تک پہنچائیں۔ اس لئے اس عجلت اور تیزی کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز کی عربی مابانہ نثر ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ سیاسی اور علمی اصطلاحات کیلئے مغربی زبانوں سے الفاظ لینا ناگزیر تھا۔ خبرنگاری اور نامہ نگاری کیلئے

بھی عام فہم زبان کا استعمال کرنا ضروری ہوگیا۔ اس لئے جہاں صحافتی زبان مغربی صحافتی اسلوب سے متاثر ہوئی وہاں اخباری زبان عوام کے زیادہ قریب ہوگئی تاکہ تھوڑا بہت لکھا پڑھا آدمی بھی اخبار پڑھ سکے اور خرید سکے اور اس طرح اخبار کی کثرت میں بھی مدد ملے چنانچہ اخبار کی زبان سادہ آسان اور رواں ہوتی ہے۔ ہر تکلف و تصنع سے عاری فنی' اداری اور سیاسی اصطلاحات کا آنا البتہ ناگزیر ہے۔

1978ء میں رضا شاہ کے خلاف جہاد کے موقع پر اخبار کی تعداد میں اضافہ ہوا چنانچہ 1979ء میں چار سو اخبار شائع ہوئے۔ ایران و عراق جنگ کے دوران ہی اخبارات کی تعداد کم ہوگئی لیکن 1989 میں جنگ کے اختتام پر پھر اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہوا اور تعداد 560 تک پہنچ گئی اور تعداد اشاعت میں بھی بڑھ گئی۔ 1992 میں ایک جائزے کے مطابق 13 اخبارات کی 1,500,000 سے 1,860,000 تعداد تک ہوگئی تھی۔ تقریباً 80 فیصد اخبار فارسی میں چھپتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں چھپنے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

انگریزی = 9

عربی = 7

آذربائیجانی' ترکی' ا ینجا' کردی' اردو سیریل = 1 یا 2

دو زبانی: انگریزی + فارسی = 59

فارسی + ترکی = 10

فارسی + عربی = 4

فارسی کردی' فارسی فرانسیسی' انگریزی فرانسیسی + انگریزی عربی = 1

سہ زبانی: فارسی + انگریزی + فرانسیسی = 20

ترکی' روسی' کریل = 10

1986ء میں اخبارات کے متعلق ایک قانون نافذ ہوا۔ اس قانون کی شق 4 کے مطابق ہر قسم کی خبریں شائع کرنے کی اجازت ہے شق 34 کے مطابق قانون کی خلاف ورزی کی عدالت تفتیش کرے گی۔ اخبارات پر سنسر نہیں۔ قانونی محیط کے اندر اخبارات کو کام کرنے کی آزادی ہے۔

مجلّات

سب سے پہلا ادبی مجلّا "بہار" ہے جو 1321ھ میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر یوسف اعتصامی تھے۔ اس رسالہ میں مشاہیر کے سوانح زندگی، اخلاقی و اجتماعی مضامین، افسانے، نئی نظمیں اور یورپین اشعار کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ "بہار" ایک سال جاری رہ کر بند ہوگیا۔ 1329 میں پھر جاری ہوا۔ یوسف اعتصامی سادہ رواں اور آہنگ دار زبان لکھتے تھے۔ بعد میں اس اسلوب کا پھر رواج ہوا۔ یورپین اشعار کی تقلید میں اکثر نئے شاعروں نے نئے موضوعات پر قطعات لکھے 1336 میں "دانش کدہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا۔ یہ رسالہ ایک انجمن ادبی کی طرف سے شائع ہوا تھا جس کا نام پہلے "جرگہ دانشوری" تھا۔ بعد میں اس کا نام "دانش کدد" تبدیل کرلیا گیا۔ اس رسالہ کی اشاعت کے مقاصد میں یہ بات بھی مندرج تھی کہ اساتذہ متقدین کے اسلوب کا لحاظ بھی رکھا جائے اور زمانہ جدید کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ اس مجلّہ کے بانی ملک الشعراء بہار تھے اور اس میں عباس اقبال، رشید یاسمی، سعید نفیسی، رضا کمال شہزاد جیسے صاحب قلم حضرات کے مقالات چھپتے تھے۔ ملک الشعراء بہار نے 1341 میں "نو بہار" کے نام سے ایک ہفت روزہ رسالہ جاری کیا۔ اس میں بھی "بہار" کی طرح تاریخی و ادبیات ایران و فرانس اور مغربی ممالک میں ادبی انقلابات کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ یورپین افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی چھپتے تھے۔ ان رسائل کی وجہ سے نوجوانوں کے ذوق پر کافی اثر پڑا۔ 1338 میں مجلّہ ارمغان وحید دستگردی کی ارادت میں جاری ہوا اور سترہ سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے میں شعروسخن کے متعلق زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دیگر مشہور علمی ادبی رسائل میں آئندہ مہر، یادگار، کاوہ اور ایرانشہر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ مجلّہ آئندہ ڈاکٹر محمود افشار کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس میں سیاسی، اجتماعی اور دیگر مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایک حصہ عورتوں کیلئے مخصوص تھا۔

مہر، ادبی، تاریخی، علمی، اجتماعی ماہنامہ تھا۔ اس کے مدیر و موسس مجید موقر تھے۔ اس میں بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ "یادگار" عباس اقبال کی یادگار تھا۔ اس میں بھی معاصر

ادیب، استاد اور محقق اپنے تحقیقی اور انتقادی مضامین شائع کرتے تھے۔ مجلّہ "کاوہ" تقی زادہ نے 1916ء میں برلن سے شائع کیا۔ یہ ہر پندرہ روز کے بعد شائع ہوتا تھا۔ 1919ء تک تو سیاسی و انتقادی مضامین پر مشتمل تھا۔ 1920ء سے علمی و ادبی موضوعات کا بھی اضافہ ہوگیا۔ مجلّہ "ایرانشہر" 1922ء میں برلن سے شائع ہوا تھا جس کے مدیر حسین کاظم زادہ ایرانشہر تھے۔

فارسی میں افکار نو اور اسالیب نو کو رواج دینے میں ان رسائل کا بڑا حصہ ہے حاکمانہ تشدد سنسر اور زبان و قلم کی پابندیوں کے زمانہ میں نہ تو شاعر جی کھول کر نظم لکھ سکتا تھا اور نہ مقالہ نگار ہی علمی و تحقیقی مضامین میں بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرسکتا تھا کیونکہ اس میں سیاسی مصلحتیں حارج ہوتی تھیں۔

اب علمی و ادبی رسائل کو آزادی حاصل ہے۔ تاریخی اور ادبی موضوعات پر اچھے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نظم و نثر میں نئی نئی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ رسائل میں سے یغما، سخن اور مجلّہ دانش کدہ ادبیات تہران، مجلّہ دانش کدہ ادبیات تبریز، آموزش و پرورش خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ہفت روزہ رسائل میں سے تہران مصور، اطلاعات ہفتگی، آسیا جوان اور ترقی قابل ذکر ہیں۔

نثر

(ادبی، علمی تحقیقی)

صفویوں کے زمانہ سلطنت میں عام لکھنے پڑھنے کی نثر اور کتابی زبان سادہ اور رواں تھی لیکن فنی نثر کا بھی رواج تھا۔ انشاء پرداز منشی، ظفر نامہ اور تاریخ اوصاف کی تقلید میں پر تکلف، پیچیدہ اور شاعرانہ نثر لکھتے تھے۔ مشکل اور مغلق عربی الفاظ، فنی اصطلاحات اور مترادفات کی تکرار سے نثر مبہم ہو کر رہ جاتی تھی۔ بادشاہوں کے نام جو خطوط لکھے جاتے تھے یا بادشاہوں کی طرف سے جو فرامین جاری ہوتے تھے۔ وہ بے جا مدح و تشبیب سے پر ہوتے تھے۔ بیکار عبارت آرائی سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہوتا تھا۔ معترضہ جملوں کی اکثریت سے فہم مطالعہ میں دشواری ہوتی تھی۔ اس قسم کی پر تکلف اور مصنوعی عبارت کا نمونہ دیکھئے۔ شاہ عباس بزرگ کا ایک فرمان:

"سپاس معرا از ملابس حدو قیاس کہ دایت جذبات اشواق طالبان جلوہ آگاہ انس و نہایت سر باطن افروز معتکفان وحدت سوای اقدس تواند بود سزاوار عظمت و جلال کبریائیست کہ ذرات داعیان موجودات جماں انوار و مظاہر اسرار جلال اوست"۔

نئی نثر کی مثال بھی دیکھئے۔ مرزا طالب وحید ایک آلہ کے متعلق بیان کرتے ہیں جو نواب ایران مداری نے ایجاد کیا تھا۔

"برارباب دید و دریافت و صاحبان تحقیق و شناخت کہ گزلیک انتظار شان مو شگ اف غوامض عالم ایجاد و مبین اسرار و معاداست پوشیدہ نیست کہ شرافت نوع انسان و تفوق این نوع برسایر انواع حیوان کہ بقوۂ عاقلہ محک عیار خطا و ثواب وجویای مسببات از اسباب است، تامل در مصنوعات الٰہی نمودہ جواہر مکنونہ و مکتومہ امور غریبہ رابہ مفاتح شعور .عرصہ روزگار و پیشگاہ ظہور آورد"

اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مورخوں نے سادہ ادبی زبان میں اپنی تاریخیں لکھیں مثلاً منشی سکندر بیگ کی کتاب "تاریخ عالم آرای عباسی" بعض علماء نے بھی عوام کی سہولت کیلئے مذہبی کتابیں عام سادہ نثر میں لکھی ہیں مثلاً "تصانیف ملا باقر مجلسی دوم"

صفویوں کے خاتمہ پر عہد افغاناں میں بھی نثر فارسی کا یہی اسلوب جاری رہا مثلاً مرزا مہدی خاں کی وہی متکلفانہ پیچیدہ نثر اور شہزادہ رضا قلی خاں کے سفینہ پر لطیف و سادہ نثر میں لکھا

ہوا دیباچہ-

قاچاریوں کے عہد میں یعنی تیرھویں صدی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کی ابتدا تک زبان ادبیات میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اور ایک پسندیدہ اور نفیس نثر وجود میں آئی- محمد شاہ اور فتح علی شاہ قاچار کی فتوحات سے ملک میں امن ہوا، تعلیم و تربیت کی طرف شوق بڑھا- علما نے عوام کو تعلیم یافتہ و ترقی یافتہ بنانے کیلئے توجہ دی- انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگیں بھی اثر انداز ہوئیں- ایران اور مغربی ممالک میں تعلقات بہتر ہو گئے- ایرانی اروپائی کتابوں اور رسائل و جزائد سے آشنا ہوئے- ایران و روس کی جنگ کے بعد خیر خواہان سلطنت نے مشورہ دیا کہ نظام تعلیم کا از سر نو انتظام ہونا چاہئے اور نئے علوم و فنون سیکھنے کیلئے طالب علموں کو یورپ بھیجنا چاہئے چنانچہ مرزا صالحہ و مرزا حاج بابای تعلیم کیلئے لندن گئے- فتح علی شاہ قاچار کے زمانہ میں پریس جاری ہوا اور پتھر پر چھپائی کا رواج ہوا- اس زمانہ میں نئی اور پرانی کتابوں کے ترجمے ہوئے- ناصرالدین شاہ کے عہد سلطنت (1848- 1896) میں اخبار بھی جاری ہوا اور نثر کا رنگ ڈھنگ بھی تبدیل ہوا- قائم مقام (1193- 1251ھ - (1835ء) نے اپنی فطری ذوق اور حسن سلیقہ سے ایک اسلوب نو کی بنیاد رکھی- چھوٹے چھوٹے جملے لکھے- مترادفات کو کم کیا- خط و کتاب میں زاید القاب اور بے جا تعریفوں کو حذف کیا- قائم مقام کی نثر کا نمونہ یہ ہے-

ہر کس کہ بدست جام دارد سلطانی جم مدام دارد

" اگر خواجہ راست میگفت- مرزا علی خاں کہ جام در دستش است بایست یک دانہ شلغم داشتہ باشد کہ خود از گرسنگی نمیرد تا بماہا کہ امہمان ایں سر زمینیم، چہ رسد- حالانیز بگردو زردش گاہ بگاہ "
-

(مخزن الانشاء)

اس مصنف کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ "کہ" تعطیل کو حذف کرتا ہے- "را" علامت مفعول کو زیادہ استعمال نہیں کرتا- "ہا" غیر جانداروں کی علامت جمع کو جانداروں کیلئے بھی استعمال کرتا ہے مثلاً نوکر ہا و آدم ہا وغیرہ- کبھی غیر جانداروں کیلئے جمع کی خبر لاتا ہے- اس عہد کے دوسرے مصنف قائم مقام کی تقلید میں سادہ نویسی کی طرف مائل ہیں- شیخ احمد روحی نے موریر کی کتاب حاجی بابا کا ترجمہ انگریزی زبان سے فارسی میں کیا- یہ کتاب ایک طرف تو سلاست و لطافت اور پختگی زبان کی وجہ سے گلستان سعدی کا مقابلہ کرتی ہے اور دوسری طرف اپنے نئے اسلوب کی وجہ سے یورپ کے بہترین ناولوں کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہے- مرزا جعفر علی

قراجہ داغی نے آذربائیجانی ترکی سے حکم نباتات، وزیر خان لنگران اور وکلائے مرافعہ وغیرہ ڈراموں کا ترجمہ آسان روزمرہ فارسی میں کیا- ناصرالدین شاہ خود تین مرتبہ یورپ گئے اور انہوں نے سلیس فارسی میں سفرنامے لکھے- یورپ میں علوم و فنون سیکھنے کیلئے انہوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں پڑھنے کیلئے ایران میں مدرسے قائم کئے- انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجمے ہوئے مثلاً روبن سن کروسو، گل بلاس اور مونٹی کرسٹو وغیرہ، پر تصنع فارسی میں یورپین افکار و خیالات کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا- اس لئے لازمی طور پر سیدھی، سادہ اور واضح نثر رائج ہوئی- بہت سے نئے نام اور نئی اصطلاحات زبان میں داخل ہوئیں- مصر میں ثریا و پرورش- استامبول میں اختر، کلکتہ میں حبل المتین اور لندن میں قانون جیسے بلند پایہ اخبارات و رسائل میں سیاسی و اجتماعی مضامین پر مقالات لکھے گئے- اس لئے **الیکترک** ہیئت، کابینہ، کنفرانس اور مجلس مبعوثاں جیسے اجنبی الفاظ استعمال ہونے لگے- اعلان مشروطیت کے بعد بہت سے اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے اور ایک زبردست ادبی انقلاب رونما ہوا اور **تکلفات** سے عاری سادہ نثر کا رواج ہوا-

تطہیر زبان

فارسی قدیم کے اسلوب کو تبدیل کرنے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبات کا بھی کافی اثر ہوا- کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئے جو عربی الفاظ کو نکال کر باہر کرنے میں کوشاں تھے- شاہنامہ اور گرشاسب نامہ کو نمونہ سمجھ کر خالص فارسی میں نثر لکھتے تھے .... نامہ خسرواں اور داستان ترکتازان ہند اس تحریک کی بنا پر خالص فارسی میں لکھی گئیں- ایک شاعر نے لکھا ہے:

بیا کہ پاک الفبائی مرزا ایران رلر زعین و قاف ط ظ و صاد و ضاد **کنیم**

اس تحریک کو رواج دینے کیلئے ابوالقاسم خاں آزاد نے 1906ء میں (علی اصغر حکمت نے پارسی **نغز** میں نامہ آزاد کا ذکر کیا ہے) نامہ پارسی کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا- آئیتی نے نمک دان کے نام سے ایک ماہوار مجلّہ شائع کیا جس میں فارسی سرہ کے عنوان کے تحت خاص فارسی میں نظمیں چھپتی تھی- امیری کی "پیوستہ فرہنگ پارسی" اسی زمانے کی یادگار ہے- اس میں عربی الفاظ کے معنی فارسی میں منظوم کئے گئے ہیں- احمد کسروی نے زبان کی اصلاح اور عربی الفاظ و مصطلحات کو نکال باہر کرنے کیلئے عملی تجاویز پیش کیں- اور "زبان فارسی" کے

عنوان سے ایک رسالہ بھی لکھا۔ ذبیح بہروز نے زبان کو آسان کرنے کیلئے بنیادی اصلاحات تجویز کیں اور فارسی رسم الخط کو آسان بنانے کیلئے خط و فرہنگ' کودک دبیرہ اور نو شتن در دو خواندن رود ہفتہ لکھیں۔ عربی زبان کے نقائص گنوانے کیلئے انہوں نے زبان ایران' "عربی یا فارسی" کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور عربی زبان کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے بحث کر کے عربی الفاظ کے اخراج کی تلقین کی۔ ایک عربی فارسی لغت بھی مرتب کیا جس میں عربی کے مقابل فارسی الفاظ بھی لکھے ہیں۔ ان کے متبعین میں ڈاکٹر صادق اور پروفیسر محمد مقدم معروف ہیں۔ بعض حلقوں سے اس تحریک کی مخالفت بھی ہوئی اور زبان کے ماہروں نے اس تحریک کو زبان کے طبعی ارتقاء کے منافی سمجھا ہے۔ علامہ محمد قزوینی اور بہار جیسے محققوں نے معتدل راہ اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ استاد عباس اقبال' استاد بہمنیار' اپنی تحریروں میں بے تکلف کثرت سے عربی الفاظ استعمال کرتے تھے اور اب ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا طرز تحریر بھی انہیں سے ملتا جلتا ہے۔ ادبیات فارسی میں عربی الفاظ اس قدر سرایت کر چکے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔ اجتماعی' اقتصادی مضامین اور فلسفہ و سیاست کی اصطلاحات کیلئے عربی الفاظ و مرکبات نہایت موزوں و مناسب تھے۔ اس لئے صحافی اور ادیب اخباروں' رسائل میں عربی الفاظ استعمال کرنے کیلئے مجبور ہوگئے۔ آجکل عربی الفاظ مثلاً مجلس شوریٰ ملی' وکیل' مسئولیت' تجدد' استبداد' قوہ مجریہ' مشروطہ' حقوق ملی' حقوق بین الملکی' انقلاب اور معاون وغیرہ ہر جگہ استعمال ہوتے ہیں۔

فرہنگستان

عربی اور فرانسیسی دفتری اور فنی اصطلاحات کیلئے فارسی الفاظ وضع ہونے لگے۔ ہر ادارے اور دفتر نے اپنے اپنے مطلب کے الفاظ وضع کرلئے اور عربی کے بجائے اوستا اور پہلوی زبانوں کے متروک اور غیر مانوس الفاظ بنابنا کر رائج کرنے پر زور دیا۔ ایسا کرنے سے یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی اور عوام یعنی سرکاری دفاتر کی طرف رجوع کرنے والوں کو اصطلاحات کے سمجھنے اور استعمال کرنے میں دقت پیش آئی۔ محمد علی فروغی' حسن تقی زادہ اور علی اصغر حکمت کے مشورہ سے رضا شاہ کبیر نے 1935ء میں فرہنگستان قائم کرنے کا حکم دیا یعنی ایک اکاڈیمی قائم ہوئی جس میں زبان و علوم کے ماہرین نے حصہ لیا اور فنی اداری اصطلاحات سادہ اور عام فہم زبان میں وضع

کیں۔ فرہنگستان کی یہ بہت بڑی خدمت ہے لیکن نئے الفاظ وضع کرنے والوں کا رجحان یہ رہا کہ خالص فارسی کے الفاظ لائے جائیں اس لئے بعض اصطلاحات غیر مانوس ہونے کی وجہ سے رواج نہ پاسکیں۔

فرہنگستان کی سرپرستی میں ایک مجلّہ "نامہ فرہنگستان" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں زبان اور گرامر کے متعلق تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ اصطلاحات کے علاوہ فرہنگستان کے اور بھی فرائض تھے۔

1- فارسی زبان کی ایک گرامر مرتب کرنا اور فارسی الفاظ وضع کرنے اور خارج کرنے کے قواعد بنانا۔

2- پیشہ وروں اور صنعت گروں کے الفاظ و اصطلاحات بنانا۔

3- علاقائی زبانوں کے گیت' ترانے' ضرب الامثال' محاورات اور الفاظ جمع کرنا۔

4- قدیم کتابوں کی تلاش اور ان کے تعارف اور ان کی اشاعت کیلئے تشویق۔

5- افکار ادبیات کی حقیقت کی طرف رہنمائی اور کلاسیکی ادب سے پسندیدہ کا انتخاب اور نامناسب سے انحراف۔

6- ادباء و شعراء کیلئے شاہکار کی تخلیق کیلئے تشویق۔

نثر معاصر کے اسلوب

عصر حاضر کی فارسی نثر میں ہم کئی قسم کے اسلوب دیکھتے ہیں لیکن عام طور پر سادہ نثر لکھنے کا رواج ہے۔ عوام کی زبان رسائل و جرائد کی زبان اور افسانہ ناول اور ڈرامہ کی زبان بالعموم سادہ اسلوب رکھتی ہے یعنی عبارت لفظی آرائشوں سے پاک ہے۔ بیان میں الجھاؤ نہیں۔ البتہ شاعرانہ نثر کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ادیب اپنے احساسات و کیفیات ذہنی کو بیان کرنے کیلئے تخیل اور جذبات کی آمیزش سے کام لیتا ہے جس سے ادب لطیف وجود میں آتا ہے۔ محمد حجازی اور علی دشتی کی تحریروں میں اس قسم کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ علمی کتابوں کی نثر کا انداز جدا ہے۔ سائنس اور فلسفہ کی معلومات اور مسائل کو سمجھانے کیلئے جزو نگاری کی ضرورت ہے اور اس میں وضاحت بیان لازمی ہے اس لئے علمی مضامین کی نثر سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ محکم ہے اور لفظی پیچیدگیوں سے پاک ہے اس علمی نثر سے ملتی جلتی تحقیقی مضامین کی نثر ہے۔ اس

میں تحقیق کے علاوہ تبصرہ و تنقید کے مضامین شامل ہیں اگرچہ ایسی نثر بھی سادہ ہے لیکن اس میں عقائد و افکار کے اظہار کیلئے عربی الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ اسلوب استادوں اور محققوں کی تحریروں میں نمایاں ہے کہیں کہیں پرانے مدارس کے پڑھے ہوئے مولویوں کی تحریروں میں عربیت کا زور عیاں ہے۔ بعض یورپ زدہ اشخاص انگریزی اور فرانسیسی الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن اب اس کا رواج بھی کم ہوتا جاتا ہے البتہ علمی و ادبی کتابوں کے ترجموں میں مغربی انداز تحریر کا اثر نمایاں ہے۔ الفاظ و محاورات اور جملوں کی ساخت تک اروپائی ہے۔ 1942ء تک فرانسیسی کا اثر زیادہ رہا۔ علمی، ادبی کتابوں کے ترجمے براہ راست فرانسیسی زبان سے ہوتے رہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد انگریزی زبان کا اثر زیادہ بڑھا۔ علوم و فنون کی ترقیات اور اختراعات میں انگلینڈ اور امریکہ کا حصہ زیادہ رہا اور سیاسی دنیا میں بھی زیادہ غلبہ انہی ممالک کا رہا۔ اس لئے انگریزی کو بین الاقوامی حیثیت مل گئی۔ ایران میں 1942ء کے بعد انگریزی زیادہ مقبول ہوئی اور فرانسیسی کو زوال ہوا۔

فارسی سرہ کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جو لوگ عربی کلمات استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور پہلوی اوستا کے نامانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں فصاحت نہیں رہتی اور روانی میں بھی فرق پڑتا ہے۔

نثر کی ایک اور صورت ہمیں دفتری زبان میں ملتی ہے اس کیلئے خاص تکنیک کی ضرورت ہے۔ چند ایک خاص اصطلاحیں اور جملے مقرر ہیں جن کے استعمال اور تکرار سے سرکاری اور تجارتی اداروں کے مراسلات لکھے جاتے ہیں۔

ا۔ ادبی نثر لکھنے والے

1- محمد حجازی 2- محمد علی جمال زادہ 3- صادق ہدایت 4- دحمذا 5- علی دشتی 6- حسین قلی مستعان

ب۔ علمی، اجتماعی اور سیاسی نثر لکھنے والے

1- محمد علی فروغی 2- سید احمد کسروی 3- مرزا ملکم خاں 4- حسن تقی زادہ، یوسف اعتصامی

ج۔ تحقیقی و تنقیدی نثر لکھنے والے

1- محمد قزوینی 2- محمد تقی بہار 3- رشید یاسمی 4- سعید نفیسی 5- عباس اقبال 6- پور داؤد

د۔ صحافتی نثر لکھنے والے

1- حسن تقی زادہ 2- کاظم زادہ ایران شہر 3- عباس مسعود مدیر روزنامہ اطلاعات 4- عبدالرحمٰن فرامرزی مدیر روزنامہ کیہان

علامہ قزوینی

ان کا نام محمد ہے۔ بعضوں نے ان کو شیخ محمد خاں لکھا ہے۔ اکثر وہ محمد عبدالوہاب قزوینی کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدالوہاب تہران میں مدرسہ دوست علی خاں معیر الممالک میں استاد تھے اور اپنے زمانہ کے فاضل علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ نامہ دانشوراں کی تالیف میں انہوں نے کافی حصہ لیا اور لغت، ادب، صرف و نحو اور فقہ کے علماء و رجال کے حالات زندگی لکھ کر کتاب میں شامل کئے۔ محمد 15 ربیع الاول 1294ھ تہران میں پیدا ہوئے۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ 1306ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد شمس العلماء شیخ محمد مہدی کی سرپرستی میں شہر کے لائق اور فاضل استادوں سے پڑھتے رہے۔ اپنی ذاتی استعداد اور محنت کی بنا پر جوانی میں ہی علوم قدیمہ خاص طور پر ادب و لغت اور اشعار عرب میں کافی علم و بصیرت حاصل کرلی تھی۔ انہوں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق کی تسکین کیلئے حاجی شیخ ھادی، ادبی پشاوری اور محمد حسین ذکاء الملک جیسی متبحر شخصیتوں سے بھی فیض صحبت حاصل کیا۔

محمد قزوینی اپنی جوانی میں اسی وظیفہ پر گزارا کرتے رہے جو ان کے والد کو ناصر شاہ کے زمانہ سے دارالتالیف اور دارالترجمہ میں کام کرنے کی وجہ سے ملتا تھا۔ کچھ نوجوان دوستوں کو بھی عربی پڑھاتے تھے۔ مرحوم فروغی کی تشویق سے روزنامہ تربیت اور دوسری کتابوں کی اشاعت میں معاون کے طور پر عربی زبان سے مقالات کا ترجمہ بھی کرتے رہے۔ 1323 میں جب ان کے

چھوٹے بھائی احمد عبدالوہاب ایک کمپنی کی طرف سے لندن میں متعین ہو کر رہ گئے تو انہوں نے اپنے بھائی کے علمی و تحقیقی ذوق کی خاطران کو لندن میں بلایا تاکہ وہ وہاں کے علمی ذخائر کو یکجا دیکھ کر ان سے استفادہ کر سکیں۔ وہاں پہنچے تو پروفیسر براؤن سے دوستی ہو گئی اور انہوں نے تاریخ و ادب کے پرانے اور نادر نسخوں کی تصحیح، مقابلہ اور اشاعت کا کام ان کے سپرد کیا اور خود انہوں نے بھی مستشرقین کے اسلوب کار، تحقیق و انتقاد کا رنگ ڈھنگ بھی دیکھا۔ پروفیسر براؤن کی وساطت سے ان کو تاریخ جہانگشا جوینی کی تصحیح و اشاعت کا کام سپرد ہوا چونکہ اس کتاب کا صحیح ترین نسخہ کتاب خانہ ملی پیرس میں موجود تھا، اس لئے وہ لندن سے پیرس میں آگئے اور پھر ایسے آئے کہ 6 سال تک وہیں رہ گئے۔ صرف پہلی جنگ عظیم 1333 (1915ء) کے دوران برلن میں چلے گئے تھے وہاں بھی آقائے تقی زادہ اور مکتبہ ایران کیلئے روزنامہ کاوہ میں کام کرتے رہے اور برلن کے کتب خانوں میں عربی فارسی کے قدیم نسخوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ 1920ء میں مرحوم محمد علی فروغی کی وساطت سے پھر پیرس واپس آگئے اور تاریخ جہانگشا کے ادھورے کام کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اسی سال انہوں نے ایک اطالوی خاتون سے شادی کرلی اور اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور یہی اکلوتی بیٹی ان کا سرمایہ حیات رہی۔

پیرس کے مدت قیام میں انہوں نے لندن، پیرس، لبون، لینن گراڈ کی لائبریریوں سے عربی فارسی کی نادر کتابوں کے اٹھارہ نسخے حاصل کئے۔ اس مقصد کیلئے حکومت ایران کی طرف سے انہیں ایک لاکھ فرانک کی رقم ملی تھی۔ انہوں نے ان کتابوں پر دیباچے لکھ کر دس سال کے عرصے میں ان کو تہران میں بھیجا۔ ان میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں اور کچھ کتاب خانہ ملی اور کتاب خانہ دانش کدہ ادبیات میں اب بھی موجود ہیں۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یورپ میں بیرونی ممالک کے باشندوں کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ اس لئے وہ بھی 1318 ش میں تہران میں واپس آگئے اور جنگ کے اختتام پر اپنا نفیس کتب خانہ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ تہران میں بھی اپنی عمر کے آخری دنوں تک قدیم نسخوں کی تصحیح میں مشغول رہے۔ سال ڈیڑھ سال بیمار رہ کر 1338 ش (1368ھ) میں 84 سال کی عمر میں وفات پاگئے اور حضرت عبدالعظیم کے قریب دفن ہوئے۔

علامہ قزوینی نے کوئی مستقل علیحدہ تصنیف تو نہیں کی۔ البتہ یادداشتوں کی صورت میں جو چیزیں چھوڑی ہیں ان کو ترتیب دینے سے کتاب بن سکتی ہے ان کی اکثر تحریریں مقالوں، رسالوں، حواشی یا دیباچوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ان کی معنوی یادگاریں مندرجہ ذیل ہیں۔

1- لوائح جامی کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔
2- شرح حال مسعود بن سلمان۔
3- **نفثتہ الصدور** مولفہ محمد نسوی کے متعلق ایک تحقیقی و تاریخی مقالہ لکھا۔
4- شرح حال ابو سلیمان منطقی جو پیرس میں شائع ہوئی۔
5- تصحیح مقدمہ قدیم شاہنامہ۔
6- مقالہ شرح حال ممدوحین سعدی جو 1316 ش میں سعدی نامہ میں شامل ہو کر شائع ہوا۔
7- شرح حال شیخ ابوالفتوح رازی مولف تفسیر فارسی۔
8- وفیات معاصرین۔ ان معاصرین کے شرح حال و وفات جن سے ان کی ملاقات ہوئی اور جن کو وہ قریب سے جانتے تھے۔ رسالہ یادگار میں حرف عین تک مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

جن کتابوں کی تصحیح کی۔ حواشی لکھے اور شائع کیا یا دوسروں کی معیت میں شائع کرایا ان کے نام یہ ہیں۔

1- مرزبان نامہ از سعد الدین وراوینی 1336 میں شائع ہوئی۔
2- **المعجم فی معاییر** اشعار العجم از شمس الدین قیس رازی 1327
3- چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی 1327
4- تاریخ جہانگشای جوینی 3 جلد
5- لباب الالباب عوفی جلد اول
6- دیوان خواجہ حافظ شیرازی۔ ڈاکٹر غنی کی معیت میں تصحیح کیا۔
7- شدالازار در مزارات شیراز۔ تالیف معین الدین جنید۔ عباس اقبال کی معیت میں۔
8- ہفت اقلیم از امین رازی۔
9- مجمل التواریخ از فصیح خوافی۔
10- **عتبتہ الکتبہ** از اتابک منتخب الملک جوینی۔ آخری تینوں کتابوں میں عباس اقبال کی شرکت سے تصحیح ہوئیں۔
11- وہ محققانہ مقالے جو انہوں نے تذکرۃ الاولیای عطار اور **نقطتہ الکاف** میرزا جانی کاشانی کی تصنیف مرتبہ براؤن پر لکھے۔

ان کے علاوہ ان کے مقالات کی 4 جلدیں بیست مقالہ قزوینی کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ڈائری کے طور پر بھی اپنی زندگی کے مشہور واقعات لکھتے رہے۔ یہ یادداشتیں تاریخ معاصر

میں بڑی اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی یاد داشتوں کی تیس کاپیاں ان کے ورثا کے پاس موجود ہیں۔

علامہ قزوینی کا نام ایک فاضل محقق کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ عربی، فارسی زبان و ادب اور تاریخ کا غائر مستقبل میں مطالب کی تحقیق و تتبع کیلئے ان کے کام آیا۔ انہوں نے جس کتاب کی تصحیح کا ذمہ لیا جس مسئلہ کی تحقیق کا کام شروع کیا۔ اس کو بڑی محنت اور استقلال سے سرانجام دیا۔ براؤن کا مسلک یہ تھا کہ شروع شروع میں جتنی تحقیق ہوسکے اس کو مصرف میں لاکر کتاب شائع کردی جائے تاکہ نادر و نایاب نسخے جلد علم و ادب کے چاہنے والوں کے پاس پہنچ جائیں لیکن علامہ قزوینی نے اس رائے سے اختلاف کیا اور جب تک حتی المقدور تحقیق کرکے اپنا اطمینان نہیں کرلیا، اس مقالے یا کتاب کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے بعض تحقیقی مضامین عالمانہ مباحث کے حامل ہیں۔ انہوں نے مستشرقین کے طرز تحقیق کو پسند کیا اور اس کو اپنا لیا۔ وسعت مطالعہ کی بنا پر ان کی نظر دور تک پہنچتی تھی۔ وہ تحقیق طلب امر کیلئے حوالہ اور سند لاتے تھے۔ ان کی نثر میں **منطقیانہ** استدلال ہوتا ہے۔

جب نئے تمدن کا سیل آیا تو زبان و اسلوب کی تبدیلیاں ساتھ لایا۔ لوگوں نے فرانسیسی کلمات کا جابجا استعمال شروع کیا۔ تطہیر زبان کی تحریک شروع ہوئی تو عربی میں افراط و تفریط کی مذمت کی اور مناسب اور متوازن راہ اختیار کی۔ انہوں نے لکھا کہ زبان کا اصل مقصد تبادل افکار ہے۔ اگر زبان سے مفہوم روشن تر اور نزدیک تر ہوجائے تو گویا زبان کا مقصد پورا ہوگیا اور اگر ایسے کلمات کے استعمال سے مفہوم میں دقت اور مشکلات آئیں اور مطلب دور تر ہوجائے تو اس سے گویا زبان کی غرض و غایت ہی زائل ہوگئی۔

ان کی اپنی نثر میں اروپائی زبانوں کے الفاظ شاذ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ عربی کلمات استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے اور اکثر مشکل اور بھاری الفاظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سعدی، حافظ، رومی جس زبان میں لکھ گئے ہیں وہی اصل فارسی ہے اسی کو عوام سمجھتے ہیں ان کو ترک کرنا کسی حال میں مناسب نہیں۔ ان کی نثر تحقیقی انداز رکھتی ہے۔ اس لئے مضبوط ہے۔ شاعرانہ **تکلفات** کا استعمال نہیں۔ وہ اپنے مفہوم کی وضاحت کیلئے موزوں سے موزوں الفاظ کام میں لاتے ہیں اور مرکب جملات لانے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی نثر سادہ اور بے تکلف نہیں کہی جاسکتی۔ نمونہ کیلئے یہ عبارت دیکھئے:

"حاصل اینکہ **نویسندگان** و شعرای ما (باستثناءِ قلیلی) ابدا مبتلی بہ "مالیخولیای استعمال عربی" نبودہ اند بلکہ نویسندگان و شعرا خود در تحت نفوذ اجباری یک امر طبیعی تاریخی خارج از اختیار ایشان کہ قبل از وجود ایشان و بدون مشورت باایشان در نتیجہ حوادث عظام تاریخی و قوانین تکامل متدرجاً بعمل آمدہ بودہ اند و چارۂ جز از استعمال زبان رائج معمولی عصر خود نداشتہ اند"۔

دھخدا

علی اکبر دھخدا 1297ھ تہران میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خان بابا خان قزوین کے ایک متوسط زمیندار تھے لیکن تہران میں ہی آبسے تھے۔ دھخدا ابھی دس سال کے تھے کہ ان کے والد وفات پاگئے اور اپنی ماں کی سرپرستی میں اپنی تحصیلات جاری رکھ سکے۔ شروع شروع میں وہ ایک فاضل ملا غلام حسین بروجردی سے ابتدائی تعلیم پاتے رہے بعد میں مدرسہ سیاسی تہران میں داخل ہوگئے۔ ان دنوں استاد محمد حسین فروغی اسی مدرسہ میں تھے وہ دھخدا کی قابلیتوں سے فائدہ اٹھانے کیلئے کبھی کبھی ان کو ادبیات پڑھانے کا موقع بھی دیتے۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں آیت اللہ حاج شیخ ہادی نجم آبادی کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ انہی دنوں انہوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ بعد میں معاون الدولہ غفاری سفیر ایران در بلکان کے ہمراہ یورپ گئے۔ دو سال وی آنا میں رہ کر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

یورپ سے واپس ہوئے تو ایران میں مشروطیت کے چرچے تھے۔ انہوں نے جہانگیر خاں اور قاسم خاں کی رفاقت میں روزنامہ صور اسرافیل جاری کیا اور "خودوخو" کے نام سے ایک فکاہی مضمون "چرندپرند" کے عنوان سے لکھتے رہے۔ محمد علی شاہ قاچار نے جب مجلس شوریٰ ملی کو توڑ دیا اور آزادی خواہوں کو قید و بند میں ڈالا تو دھخدا بھی جلاوطن کردیئے گئے۔ وہ پیرس میں علامہ محمد قزوینی کے ساتھ رہے۔ بعد میں **سوئٹزر لینڈ** جاکر "صوراسرافیل" کے صرف تین شمارے نکال سکے۔ پھر استنبول گئے اور دوسرے ایرانیوں کی معیت میں "سروش" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا جس کے صرف پندرہ شمارے نکل سکے۔ جب محمد علی شاہ برطرف ہوا اور نئی مجلس وجود میں آئی تو دھخدا ہمدان و کرمان کے حلقہ سے نمائندہ منتخب ہوئے۔ جنگ عظیم اول میں ناسازگار حالات کی وجہ سے قبیلہ بختیاری کی ایک بستی میں جاکر گوشہ نشین ہوگئے۔ جنگ کے بعد تہران آئے اور سیاسی مشاغل سے کنارہ کشی کرکے علمی و ادبی کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ابتدا میں وزارت تعلیم میں دفتر کے رئیس۔ بعد میں مدرسہ علوم سیاسی اور مدرسہ عالی

حقوق کے پرنسپل رہے۔ ان فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد آخری عمر تک تحقیق و تحریر میں منہمک رہے اور 1375ھ یعنی 1956ء میں وفات پاگئے۔

دھخدا اپنی عملی فضیلتوں اور وسعت معلومات کی بنا پر واقعی علامہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ علوم قدیم و جدید پر عبور کے ساتھ ساتھ تحقیق میں دقت نظر اور بے مثال محنت و زحمت کے باعث معاصرین ان کو اپنے زمانے کا بہترین فاضل محقق کہنے پر مجبور ہیں۔ فرانسیسی زبان پر مہارت ہوتے ہی انہوں نے **مونتسکیو** کی دو مشہور کتابوں کے ترجمے فارسی میں کئے۔ 1- عظمت و انحطاط رومیان 2- روح القوانین اور ایک فرہنگ فرانسہ بفارسی بھی مرتب کی اور فارسی و عربی کی بلند پایہ بنیادی کتابوں سے اصطلاحات تلاش کرکے فرانسیسی علمی اصطلاحات کے مقابل لکھیں۔

فارسی عربی شعر و ادب کے مطالعہ کے دوران انہوں نے امثال و حکم جمع کئے اور 1308- 1311 کے درمیان ان کو چار جلدوں میں شائع کیا۔ انہیں مجلدات سے ان کی بے پایاں خستگی ناپذیر طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی بے نظیر باریک بینی اور تحقیقی نظر کی بدولت انہوں نے شعراء کے کلام کو غور سے پڑھا اور قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے باہمی مقابلہ کرکے اپنی شعری استعداد اور فن سخن وری سے شناسائی کی وجہ سے اشعار میں تصحیح کی اور حواشی لکھے۔ انہوں نے دیوان ناصر خسرو ...... دیوان سید حسن غزنوی، دیوان فرخی، دیوان مسعود سعد سلمان، دیوان منوچہری، دیوان حافظ اور دیوان سوزنی پر مفید حواشی لکھے ہیں اور نہایت مناسب **تصحیحات** کی ہیں۔

لغت پر انہیں خوب عبور تھا۔ الفاظ کی تحقیق و تدقیق ان کا شیوہ رہا۔ انہوں نے لغت فرس اسدی کی تصحیح کرکے گراں بہا خدمت کی ہے۔ لغت نویسی میں ان کا بے مثال تاریخی کارنامہ ان کا لغت نامہ ہے جس کی تدوین و تحریر میں انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ وہ تقریباً آخری پینتیس سال اسی عظیم الشان جاں گسل کام کے انجام میں مشغول تھے۔ یہ ایک انسائیکلو پیڈیا کی طرز کا ایک مبسوط لغت ہے جس میں الفاظ کے معنی اور ان کے شواہد کے علاوہ رجال و اعلام و اماکن پر بھی مقالات شامل ہیں۔ ان کی زندگی میں اکیس بائیس جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ اپنے بعد لاکھوں مرتب شدہ کارڈ چھوڑ گئے تھے۔ ایک ادارہ کے تحت باقی جلدیں شائع ہوئیں۔ ان کی مرتب شدہ تالیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

آثار علی اکبر دھخدا

امثال و حکم (2 جلد)	1310 -1939

لغت نامہ	1325
شرح حال ابوریحان بیرونی	1324
تعلیقات بر دیوان ناصر خسرو	1307 -1304
چرند و پرند	1341
دیوان اشعار	1334
تصحیحات دیوان سید حسن غزنوی	1328

آثار چاپ نہ شدہ دھخدا

فرہنگ فرانسہ بہ فارسی
تصحیح دیوان حافظ
تصحیح دیوان منوچہری
تصحیح لغت فرس
تصحیح صحاح الفرس
تصحیح دیوان سوزنی
تصحیح دیوان فرخی
تصحیح دیوان مسعود سعد
عظمت و انحطاط رومیان (ترجمہ)
روح القوانین (ترجمہ)

وہ شاعر بھی تھے ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر محمد معین دانش گاہ تہران کے اہتمام سے شائع ہوا۔ جس میں قدیم و جدید طرز کے اشعار کے علاوہ زبان عامیانہ کے فکاہی اشعار بھی شامل ہیں۔

ان کے نثری کارناموں میں لغت کے بے شمار مضامین اور ان کی صحافتی زندگی کی یادگاریں یعنی روزنامہ صور اسرافیل، سروش، ایران کنونی اور آفتاب میں شائع شدہ سیاسی و اجتماعی مقالات ہیں۔

فارسی نثر کے تحول و تبدل میں دھخدا کی شخصیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں

نے اخباروں کی عربی آمیز بھاری بھر کم زبان کو چھوڑ کر روزمرہ کی زبان کو استعمال کیا اور اپنی شوخی، شگفتگی اور طنز کی چاشنی سے نثر کو عوام کیلئے دل پسند بنا دیا مثلاً صور اسرافیل کے شمارہ نمبر 12 کا یہ ٹکڑا دیکھئے۔ نثر لکھے رہے ہیں گویا باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک عربی نما خط ملا ہے وہ پڑھا نہیں جاتا۔ لکھتے ہیں۔

"چہ **نکینم**! آخرش عقلمان باین جارسید کہ ببریم خدمت یک آقا شیخ جلیل القدر فاضلی کہ بابابا از قدیم دوست بود۔ برویم داویم و خواہش کردیم کہ زحمت نباشد آقا این را برای مابفارسی ترجمہ کن۔ آقا فرمود۔ حالا من مباحثہ وارم بود عصری من ترجمہ می کنم می آرم اوارہ"۔

عربی نما فارسی لکھنے والے ملاؤں کی مبہم زبان کا خاکہ اڑانے کیلئے مندرجہ ذیل عبارت اپنے اندر ظرافت اور طنز کا نشتر بھی لئے ہوئے ہیں اور مصنف کی قدرت زبان پر دلالت بھی کرتی ہے۔

"ای کا بین صور اسرافیل چہ چیز است مرشمارا کہ نمی نو۔سید جریدۂ خود تان را بچنانی کہ سزا وار است مرشمارا کہ بنیو ۔سید آزاد چہ چیز است مرشمارا باکاغذ لوق و امردادن و تمتع از غیریا سات در صورت تیقن بعدم حفظ مرۂ مرعدہ خود را در صورت دیدن ماآناں را کہ آلان از حجرۂ دیگر خارج شدہ اند"۔

ایران میں طنزیہ نگاری کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں عبید ذاکانی کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے بعد پچھلی صدی کے اواخر میں سیاحت نامہ ابراہیم بیگم میں واقعات کے بیان اور تبصرہ میں کہیں کہیں طنزیہ جھلکیاں مل جاتی ہیں اخبار نویسی میں تو یہ چیز بالکل عنقا تھی۔ دھخدا نے اس کو شروع کیا اور مختلف طرزوں میں اس کو نبھایا ہے۔ بادشاہ، امراء، وزرا اور علماء کے اعمال پر تنقید کرنے کیلئے طنز کو خوب کام میں لایا گیا ہے۔ ایک شمارے میں لکھتے ہیں۔ لوگ اس ضرب المثل کے معنی نہیں سمجھے۔

امان   از   دوغ   لیلی
ماستش   کم   آبش   خیلی

انہوں نے لکھا اس کے معنی سمجھنے آسان ہیں مثلاً امیر اعظم تین ماہ گزرے ہر روز بہارستان میں لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر کے **دموستھینز** جیسی خطابت کے ساتھ آزادی کے فوائد پر لیکچر دیا کرتے تھے لیکن جب گیلان کے حاکم بن کر گئے اور احمد علی شاہ نے مجلس شوریٰ ملی کو توڑ دیا اور لوگوں نے بادشاہ کے خلاف آواز اٹھائی تو انہوں نے وہاں سے تار بھیجا۔

"گیلان در نہایت انتظام۔ بازار ہا باز، مردم آسودہ بجائی خود ہستند، ریعنی من در دیوان خانہ نطق کردہ ام کہ بابا دیگر مجلس بہما خوردہ ہیچ وقت ہم برپا نخواہد شد۔ بروید سرکارھا تان۔ **بکا سبی**۔ تان **بچسپید**۔ یک لقمہ نان پیدا کیںد۔ ازین مشروطہ بازی چہ در می آید"

جب آدمی امیر اعظم کی خدمات کا خیال کرتا ہے تو فوراً یہ مثل یاد آتی ہے۔

امان   از   دوغ   لیلی
ماستش   کم   آبش   خیلی

طنز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کو ایسی صفات سے متصف کرنا جو اس میں موجود نہ ہوں۔ ایسے طرز بیان سے بھی پڑھنے والے کے دماغ میں شخص موصوف کے خلاف حقارت کے جذبات ابھرتے ہیں مثلاً یہ عبارت دیکھئے۔ پولٹیکل اکونومی کے مصنف **ایڈم سمتھ** کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"ای آدم سمت پس تو ہنوم خامی۔ ہنوز علم تو کامل نیست۔ ہنوز تو لائق پدر اکونومی پلیتک نیستی پدر اکونومی پلیتک بادشاہ جم جاہ ملایک سپاد۔ پدر والا گہر، ایرانیاں اعلیٰ حضرت قدرت فلک حشمن، کیوان شوکت رستم صولت، محمد علی شاہ قاجار است، والسلام"۔

حسین کاظم زادہ ایران شہر

10 جنوری 1884ء کو تبریز میں پیدا ہوئے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ ماں باپ دونوں سے محروم ہو گئے اور بڑھے بھائی ڈاکٹر زین العابدین ایران شہر کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ ابتدائی تعلیم تو مسجد کے ملاؤں اور مکتبوں سے شروع کی لیکن جب نئی طرز کا مدرسہ قائم ہوا تو اس میں داخل ہو گئے۔ اپنی ذہانت اور تعلیم کی طرف طبعی ذوق کی وجہ سے استادوں کی نظروں میں عزت پائی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ ابتدائی جماعت کو درس دینے پر مامور ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ سکول کا حساب کتاب، کتابخانہ کا انتظام ان کے سپرد ہوا اور مختصر سی تنخواہ بھی ملنے لگی۔ چار صفحے کا ایک روزنامہ "کمال" جاری ہوتا تھا۔ اس کی ادارت بھی ان کے ذمہ تھی۔

1319 یا 1320ھ میں تبریز کے ملاؤں نے نئے مدارس اور روسی فرانسیسی زبانوں کی تعلیم کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا۔ دکانیں بند کروادیں اور دین و ایمان کو خطرے میں بتا کر لوگوں کو ابھارا۔

محمد علی شاہ ولی عہد کے حکم سے جو ان دنوں تبریز میں تھا نئے مدارس بند کردیئے گئے اور حسین کاظم زادہ کا سلسلہ تعلیم و تعلم رک گیا۔ ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ بعد میں وہ اپنے بھائی کے دواخانہ میں کام کرتے رہے اور طبی معلومات حاصل کرتے رہے۔ جب اس کام میں جی نہ لگا تو انہوں نے اپنی کتابیں اکٹھی کرکے بازار میں کتاب فروشی کی دکان کھول لی اور روشن فکر جوانوں کے جمع ہونے اور علمی ادبی محفلوں کے منعقد کرنے کا ایک مرکز بنالیا۔ اس عرصہ میں ترکی بچوں کو فارسی زبان سکھانے کیلئے ایک "زبان آموز" لکھی اور کتاب بعنوان ہنر آموز' فرانسیسی سے ترجمہ کراکے شائع کی۔ 1332 میں مرزا حسین خاں کمال جو مدرسہ بند ہوجانے سے قفقاز جاچکے تھے۔ تبریز واپس آئے اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ وہ مصر جاکر "کمال" کے نام ایک اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں۔ ایران شہر کو بھی مصر چلنے کی دعوت دی چنانچہ وہ اپنے بھائی اور رشتہ داروں سے اجازت لیکر قفقاز چلے گئے۔

قفقاز میں کچھ ماہ ٹھہرنے کے بعد معلوم ہوا کہ کمال صاحب اخبار جاری کرنے کیلئے مالی وسائل مہیا نہیں کرسکے۔ انہوں نے کاظم زادہ سے کہا کہ وہ باطوم جائیں۔ اور وہ خود مصر جاکر انتظام کریں گے اور پھر ان کو اطلاع دیں گے۔ کاظم زادہ باطوم گئے اور ملا حسین منتخب الذاکرین کے ہاں مہمان رہے۔ کچھ عرصہ وہاں ان پڑھ ایرانیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے رہے۔ جب مصر سے کوئی خبر نہ آئی تو انہوں نے اپنے میزبان سے طربزون جانے کی اجازت لی۔ جہاں سے وہ استنبول میں جاکر علم طب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ملا حسین نے وہاں تک پہنچنے کا انتظام کردیا۔

استنبول جاکر معلوم ہوا کہ عبدالحمید خاں شاہ ترکیہ نے طبی کالج میں خارجیوں کا داخلہ ممنوع کردیا ہے۔ کاظم زادہ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کے پاس کچھ وسائل معاش بھی نہیں تھے۔ پہلے کچھ عرصہ کیلئے ایک سرائے میں تبریز کے ایک پرانے آشنا کے پاس ٹھہرے رہے پھر محمد علی سروش نے جو ملا حسین منتخب الذاکرین کے بھائی تھے اور ایرانی کونسل گری میں منشی تھے۔ کاظم زادہ کی مدد کی۔ وہ تین مہینے کیلئے چھٹی لیکر تبریز گئے اور ان کو اپنی جگہ مامور کرا گئے جب وہ واپس آئے تو انہوں نے نوکری چھوڑ کر کتاب فروشی کی دکان کھول لی اور یہ ان کی جگہ مستقل طور پر متعین ہوگئے۔ 1906 سے 1911 تک اسی دفتر میں ملازم رہے۔

ترکی کے اس دوران قیام میں انہوں نے دانش کدہ حقوق میں اعزاز کے ساتھ قانون کا امتحان پاس کیا۔ اسی عرصہ میں انہیں ایک ذخیرہ کتب تک رسائی ہوئی اور ان کو فلسفہ' تاریخ اور ادبیات کی بے مثال کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ کتابیں کونسل خانہ میں ایک انبار کی صورت میں

پڑی ہوئی تھیں اور حکومت ترکیہ کے حکم سے ایرانی کتاب فروشوں کی دکانوں سے تفتیش کے دوران میں قابل اعتراض سمجھ کر جمع کرلی گئی تھیں۔ یہیں رہ کر انہوں نے اپنے وطن کی آزادی اور مشروطہ طلبی کی تحریک میں حصہ لیا۔ انجمن ایرانیاں اور انجمن سعادت کی تشکیل میں کام کیا اور علی اکبر دھخدا کے اخبار سروش اور دوسرے روزنامہ "شمس" میں مضامین بھی لکھے۔ حج کے موقع پر جدہ کے کونسل خانہ میں معاون کی حیثیت سے تین مہینے کیلئے ان کا تقرر ہوا اور حج کے فریضہ سے بھی سبکدوش ہوئے۔ حقیقت حج پر انہوں نے فرانسیسی میں ایک کتاب بھی لکھی۔

مسٹر کولہ بالزیکی کے توسط سے ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی یعنی وہ یورپ کی دانش گاہوں میں تعلیم حال کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ مسٹر کولہ ترکیہ میں سفارت ایران کے مفتش مالیات تھے اور کاظم زادہ کی لیاقت کے قائل تھے۔ دانش کدہ لوون میں علوم اجتماعی اور سیاسی کا مطالعہ کیا اور تین سال کا نصاب ایک سال میں مکمل کرکے ڈپلومہ حاصل کیا۔ 1912 میں پیرس گئے۔ وہاں یونیورسٹی کے استادوں سے ملاقاتیں کرتے۔ علوم اجتماعی پر لیکر سنتے اور فن جریدہ نگاری پر تعلیم حاصل کرتے رہے۔

1913ء میں پروفیسر براؤن کی ہمکاری میں فارسی کے معلم مقرر ہوکر کیمبرج میں رہے۔ ڈیڑھ سال تک تدریس و تحقیق میں مصروف رہے۔ 1914ء میں جنگ شروع ہوئی تو حسن تقی زادہ نے برلن سے خط لکھ کر ان کو بلوالیا تاکہ ایران کی آزادی و استقلال کیلئے باہم مل کر کام کریں۔ مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ کاظم زادہ ایران جاکر ڈیموکریٹ جماعت کو اپنے ساتھ لیکر ایران کی فوجی پولیس کو تیار کرنے اور روسیوں اور انگریزوں کو باہر نکالنے کی کوشش کریں جنہوں نے ایران کے حصے بانٹ کر اپنے حلقہ ہائے اثر بنالئے تھے لیکن حالات سے مجبور ہوکر وہ ایران سے مہاجرت کرگئے۔ کچھ عرصہ کرمانشاہ میں قید و بند کی کڑیاں جھیلتے رہے۔ رہائی کے بعد استنبول میں ایک سال تک مقیم رہے پھر 1917ء میں دوبارہ برلن پہنچے۔ برلن میں ان کا قیام انیس سال تک رہا۔ پہلے تو انہوں نے کتاب فروشی کی دکان کھولی۔ پھر ایران شہر کے نام سے ایک مجلّہ جاری کیا اور اکیس رسالے انتشارات ایران شہر کے نام سے شائع کئے۔ جب گرانی طباعت کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہوا تو جرمنی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ 1921ء تک سات کتابیں اس زبان میں لکھی تھی' کچھ عرصہ کیلئے انہیں سوئٹزرلینڈ میں لیکچر دینے کیلئے بلایا گیا۔ وہاں کی آب و ہوا' سکون و آزادی ان کو بہت پسند آئی۔ اتفاق سے وزارت فرہنگ ایران کی طرف سے تعلیم و تربیت پر ایک کتابچہ لکھنے کا کام بھی مل گیا اور وہ 1936ء میں سوئٹزرلینڈ میں چلے آئے

اور وہاں مدرسہ عرفان کے نام سے ایک سکول کی بنیادی رکھی- دوسرے شہروں میں اس کی شاخیں بنائیں- ایک کورس بھی مقرر کیا جو سوا تین سال میں ختم ہوتا تھا- کاظم زادہ ایک درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے- سبزیاں کھا کر گزارہ کرتے اور لوگوں میں جسمانی اور روحانی تربیت کے اصول پھیلاتے رہے- آخر اپریل 1962ء میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے- انہوں نے تقریباً تیس کتابیں جرمنی زبان میں تصنیف و تالیف کی ہیں- ان میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں-

فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں-

1- کتاب الدوای روحی یا طریقہ تلقین بنفس
2- راہ نور 4 جلد
3- رہبر تراد نو یا در جستجوی خوش بختی
4- معارف
5- تجلیات روحی ایران
6- رسالہ ایران شہر
7- رستم و سہراب (ڈرامہ)
8- اصول اساسی فن تربیت
9- شرح حال خود نوشت

کاظم زادہ کو مختلف ممالک میں فارسی پڑھانے کا موقع ملا- انہوں نے پڑھنے لکھنے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا جس کی مدد سے چھ ہفتوں میں لکھنا پڑھنا سکھایا جا سکتا تھا- وہ بھی اس بات کے حامی تھے کہ فارسی زبان کو عربی زبان سے پاک کرنا چاہئے اور عربی حروف ع غ ق ط ظ وغیرہ کو ان کے مقابل و معادل حروف فارسی میں لکھنا چاہئے-

ایران کی ان چند شخصیتوں میں کاظم زادہ کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے بیرونی ممالک میں جا کر بھی ایرانی آزادی اور استقلال کے متعلق اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور غیر زبانی ممالک میں جا کر علم و ادب کی شمعیں فروزاں کیں- ان کا مجلّہ ایران شہر اور مجلّہ کاوہ، سروش، ثریا، اختر اور حبل المتین- اسی قبیل کے جرائد اور مجلات ہیں- جنہوں نے اپنے ملک سے باہر سیاسی خدمت کے علاوہ علم و ادب کی خدمات بھی انجام دیں-

کاظم زادہ نے اکثر تعلیم و تربیت، علوم اجتماعی اور عرفانی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے- ایسے علوم

کی اصطلاحات کے استعمال کرنے میں اور مطالب سمجھانے میں کافی وقت کا سامنا ہوتا ہے جن پر پہلے سے تحریریں موجود نہ ہوں- ان بزرگوں کا زبان پر بڑا احسان ہے جنہوں نے نازک سے نازک خیالات کو سادہ اور واضح طرز بیان میں ادا کیا- کاظم زادہ کی نثر بھی علمی نثر ہے جس میں ادبیت کے بجائے مطالب کی وضاحت پر زیادہ توجہ دی گئی- مصنف کی کوشش یہی ہے کہ آسان فارسی زبان لکھی جائے اور صرف انہی عربی الفاظ کو استعمال کیا جائے جو مطلب کے اظہار میں مدد دیتے ہیں- ان کی نثر میں زائد لفظ کی گنجائش ہی نہیں مثلاً راہ نو در تعلیم و تربیت کی نثر کا یہ ٹکڑا دیکھئے-

"فیلسوف یونانی' افلاطون' فن تربیت را
چنیں تعریف کردہ تربیت عبارت است از
رسانیدن جسم و روح بہ بلند ترین پایہ کمال و جمال
من این تعریف را کمال ترو موافق تر از تعریفہای
دیگر میدانم' زیرا کہ نخست' تربیت را شامل
جسم و روح کردہ دودوم اینکہ غرض اصلی و نتیجہ
آخری تربیت را کمال و جمال انسانی قرار دادہ است"

محمد علی فروغی

محمد علی فروغی 1878ء تہران میں پیدا ہوئے- ان کے والد محمد حسین فروغی اپنے زمانے کے فاضل دانشمند شمار ہوتے تھے- انہیں کی ادارت میں مشہور روزنامہ "تربیت" نکلتا رہا اور شاید وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رومانی ادب کے ترجمے شروع کئے اور چالیس پچاس سال پہلے "شاتوبریان" کے مشہور ناول آخرین بنی سراج کا ترجمہ "عشق و عفت" کے نام سے شائع کیا- فروغی نے ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی پھر دارالفنون میں طب پڑھتے رہے- اس کو ناتمام چھوڑ کر فلسفہ میں فضیلت حاصل کی اور بعد میں اسی مدرسہ میں تاریخ، طبیعات اور فرانسیسی کی تعلیم دیتے رہے- 1902ء میں جب مدرسہ سیاسی تہران قائم ہوا تو اس کے استاد مقرر ہوئے اور بعد میں باپ کی وفات پر پرنسپل مقرر ہوئے-

1909 میں مجلس شورئ ملی کے رکن منتخب ہوئے اور بعد میں مجلس کی صدارت کے فرائض

بھی انجام دیتے رہے۔ علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے اور مختلف زمانوں میں وزیر عدلیہ' وزیر خارجہ' وزیر مالیہ' وزیر جنگ و اقتصاد ملی اور وزیر اعظم کے عہدوں پر بھی سرفراز رہے اور اپنی دوراندیشی اور بصیرت کی بنا پر اپنے ملک کو سیاسی بحران سے نجات دلانے کا سبب بنتے رہے۔

وہ پانچ سال تک ترکیہ میں ایران کے سفیر رہے اور انہوں نے دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات بڑھانے میں موثر اقدامات کیئے۔ کمال اتاترک نے فروغی کی بے نظیر شخصیت کی بہت تعریف کی تھی۔

وہ یورپ میں کئی بار گئے۔ 1919ء میں بین الاقوامی صلح کانفرنس میں شرکت کی۔ 1927ء میں انجمن اقوام متحدہ میں ایران کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور انجمن کے بعض اہم اجلاس ان کی صدارت میں منعقد ہوتے رہے۔

وہ اپنی علمی ادبی شخصیت کی بنا پر بھی دوسرے ملکوں میں معروف تھے اور کئی انجمنوں اور اکاڈمیوں کے اعزازی رکن تھے اور ان میں شرکت بھی کرتے تھے۔ آخر میں وہ روس کی اکاڈمی علوم کے رکن منتخب ہوئے۔

جشن ہزارۂ فردوسی انہی کے توسط اور کوششوں سے منعقد ہوا تھا جس میں دنیا کے مشہور و معروف علماء و فضلاء نے شرکت کی تھی۔ وہ فرہنگستان کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ ان دنوں وزارت عظمیٰ کے عہد بردار تھے جب اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

وہ علمی' ادبی اور سیاسی پر افتخار زندگی گزارنے کے بعد 1948ء میں وفات پاگئے ان کی مختلف تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

طلبہ کیلئے درسی کتابیں

1- چرا باین جہت (علم ہیئت)
2- اصول علم ثروت
3- تاریخ ایران
4- حقوق اساسی
5- تاریخ ملل قدیم مشرق (فرانسیسی سے ترجمہ)

6- تاریخ مختصر روم قدیم
7- علم فزیک

تصحیح کردہ کتابیں

1- کلیات سعدی
2- خلاصہ شاہنامہ (2 جلد)
3- منتخب شاہنامہ
4- زبدۂ حافظ
5- رباعیات خیام

ترجمے

1- حکمت سقراط بقلم افلاطون (فرانسیسی)
2- سماع طبیعی (کتاب شفا سے ترجمہ)
3- سماع طبیعی و آسمان و جہان کون و فساد (شفا سے ترجمہ)
4- عروس بی.
5- مرزا کمال الدین (ڈرامہ)

دیگر تالیفات

1- سیر حکمت در اروپا (3 جلد)
2- آئین سخن وری (2 جلد)
3- رسالہ پیام فرہنگستان
4- رسالہ اندیشہ' دور و دراز

فروغی کو اپنی زبان پر بڑا اختیار ہے۔ وہ علمی مسائل کی وضاحت کیلئے موزوں الفاظ استعمال

کرتے ہیں۔ فلسفہ کے خشک اور پیچیدہ مسائل بیان کرنے کیلئے چھوٹے چھوٹے جملے لاتے ہیں۔ ”سیر حکمت در اروپا“ اور ”سماع طبیعی“ اس بات کے شاہد عادل ہیں کہ انہوں نے الجھے ہوئے موضوع کو سادہ سلیس نثر میں لکھ کر بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کیلئے سیر حکمت کی یہ عبارت دیکھئے۔

”تحقیقات حکما در فلسفہ طبیعت از اقسام دیگر تحقیقاتش کمتر طرف توجہ است و نقص و عیش بیشتر، زیرا اوہم مانند فیلسوفان پیشین خواستہ است با معلومات ناقص زمان خود بخیال بانی حقیقت عالم خلقت را معلوم کند و راز جہاں را بکشاید و حال آنکہ راز جہاں اگر کشودنی باشد پس از آن خواہد بود کہ تفحص کنندگان . بمشاہدہ و تجربہ اسرار طبیعت رایگان یگان کشف کنند“۔

ترجمہ کرتے وقت بھی اور اپنی نثر لکھتے وقت بھی ان کا اسلوب بیان سادہ اور واضح ہے۔ فروغی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فارسی زبان کو علمی زبان بنانے میں مدد دی ہے اور سیاسی، تاریخی اور اقتصادی مضامین پر خود کتابیں لکھ کر یا ترجمے کرکے زبان کو وسعت بخشی ہے۔

ان کے بیان میں پیچیدگی نہیں۔ وہ عربی کے وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ وہ مرکب جملے کم استعمال کرتے ہیں ترجمے میں بھی ان کی نظر مطالب کی صراحت پر ہوتی ہے۔ نپولین بوناپارٹ کی تقریر کا ایک ٹکڑہ دیکھئے۔

”ای فرانسویان! دو سال پیش در چنین روزی اختلافات داخلی خود را کنار گذاشتید دوست فتنہ را بستید و از نیرو توانستید ہم خود را واحد کنید و آنچہ در نظر انسانیت بزرگ و برای میہن سود مند است بچنگ آورید۔ دولت شما ہمہ جا راہنما و مددگار شما است“۔

سعید نفیسی

سعید نفیسی تہران میں 1315ھ (1284 شمسی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ پھر فرانس چلے گئے دس سال تک وہیں رہے اور اروپائی ادبیات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کے گھر والے چاہتے تھے کہ وہ طب کی تعلیم حاصل کریں لیکن ان کا طبیعی رجحان اس طرف نہ ہوا۔ فرانس سے واپسی پر وزارت فوائد عامہ میں ملازم ہوگئے لیکن تھوڑے عرصے کے بعد وہاں سے الگ ہوکر مدرسہ علوم سیاسی، دارالفنون اور دارالمعلمین عالی میں استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شمسی تہران یونیورسٹی کے دانش کدہ ادبیات میں استاد مقرر ہوگئے اور علوم سیاسی،

تاریخ ادبیات، تاریخ تمدن اور تاریخ تصوف پڑھاتے رہے۔ 1331 میں خود استعفاء دیکر اپنے کام سے سبکدوش ہوگئے اب ملازمت کے تو کوئی مشاغل نہیں تھے پھر بھی مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں سارا وقت صرف کرتے تھے۔

نومبر 1966ء میں وفات پاگئے۔ سوم آیان 1345 ش

1903 میں انہوں نے مجلّہ شرق کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو ایک سال کے بعد بند ہوگیا۔ **سعید نفیسی** فرہنگستان کے مستقل رکن تھے اور وضع اصطلاحات میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں۔

نفیسی عہد حاضر کے نامور استادوں، محققوں اور نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں وہ بہت تیز نویس ہیں۔ ان کی تالیفات اور تصانیف کے علاوہ تصحیح و **تحشیہ** ترجمہ ملا کر کل تعداد 245 تک پہنچ چکی ہے۔ کتابوں کے علاوہ ان کے تقریباً 600 تحقیقی اور علمی مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ 150 کے قریب وہ مقالات ہیں جو یورپ اور ایشیاء میں فرانسیسی، انگریزی، روسی، عربی، اردو اور ارفنی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انہیں کتابوں پر بڑا عبور ہے۔ فرانسیسی اور عربی میں تو مہارت رکھتے ہیں۔ انگریزی جرمنی اور روسی کو بھی استفادہ کے مراتب تک سمجھتے ہیں۔ زبان شناسی پر ان کی گہری نظر ہے۔ زبان فارسی کو بنانے سنوارنے میں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اصلاح زبان پر ان کے استادانہ مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ الفاظ کی تحقیق میں ان کو بڑا درک ہے۔

ان کا ذہن بڑا حاصل خیز ہے۔ وہ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ ڈرامہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور شعر گوئی کا بھی مشغلہ رکھا ہے۔ ایرانی ادبیات میں ایک ایسا وقت آیا ہے جس سب مصنفوں نے ناول، افسانے یا ڈرامے لکھنے پر زور طبع آزمایا ہے۔ حجازی، صادق ہدایت جن کا اصل میدان ناول یا افسانہ تھا۔ انہوں نے بھی ڈرامہ پر قلم اٹھایا اور جو ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے افسانے اور ناول لکھے۔

سعید نفیسی کی تالیفات اور تصانیف پر نظر کرکے ان کی انتھک طبیعت پر حیرت ہوتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی تصانیف اور تالیفات کی مرتب شدہ فہرست حسب ذیل ہے۔

کتاب شناسی آثار سعید نفیسی

(الف، آثار ادبی)

1- اتشهائی نهفته (یا حسابها در نیامد) 1330
2- آخرین یادگار نادر شاه (نمایشنامه) 1306 (چاپهای دیگر هم دارد)
3- ستارگان سیاه (مجموعه داستان) 1317 (چاپ دیگر هم دارد)
4- فرنگیس _ 1310 (چاپهای دیگر هم دارد)
5- گلچینی از دیوان سعید نفیسی، 1333 (کتاب فروشی طهو
6- ماه نخشب (مجموعه داستان) 1326 (چند چاپ دیگر دارد)
7- نیمه راه بهشت (داستان) 1332 (چند چاپ دراد)

(ب، ادبیات اروپائی)

8- آدام میتسکیه ویچ (ترجمه) 1334
9- آرزوهای برباد رفته- اثر بالزاک (ترجمه) 1327
10- ادیسه، اثر همر (ترجمه) 1337
11- افسانه های گریلف، 1323
12- ایلیاد، اثر همر (ترجمه) 1334 (چاپ دوم نیز دارد)
13- به یاد ماکسیم گورکی 1315
14- پل در ویرزنی- اثر برنارون دوسن پیر- 1335 (ترجمه)
15- پوشکین 1325

از ذکر محل چاپ در مورد تهران خود داری شدو اگر در جای دیگری غیر از تهران بچاپ رسیده تذکر داده شده است- این فهرست توسط ایرج افشار گرد اوری شده است-

16- تاریخ ادبیات روسی- جلد اول 1344
17- زندگی و کاروهنر ماکسیم گورکی (باچند داستان) 1336
18- عشق چگونه زایل شدو چند داستان دیگر اثر لون تالستوی 1331
19- نائب چاپارخانه، اثر پوشکین 1326

20- نمونه ای از آثار پوشکین 1315
21- یادبود گریلف 1323

(ج، متون فارسی)

22- پندنامه انوشیروان از بدایعی بلخی 1312
23- تاریخ گیتی گشا- تالیف میرزا محمد صادق موسوی- بادو ذویل تالیف عبدالکریم شریف و آقا محمد رضا شیرازی 1317
24- تاریخ مسعودی (معروف به تاریخ بیهقی)
25- دستور الوزرراء- تالیف خواند میر 1337
26- دو تقریر از خواجه امام عمر خیام مندرج در مجلّه شرق 1309
27- دیوان ازرقی هروی 1334
28- دیوان انوری 1337
29- دیوان اوحدی مراغی 1340
30- دیوان قصاید غزلیات معین الدین جنید شیرازی 1320
31- دیوان رشید وطواط 1339
32- دیوان قصاید و غزلیات عطار نیشاپوری 1319 (دو چاپ بعد هم دارد)
33- دیوان قصاید و غزلیات نظامی 1338
34- دیوان عمعق بخارائی 1339
35- دیوان قاسم انوار 1337 (چند بار چاپ شده است)
36- دیوان مقطعات و رباعیات ابن یمین 1318
37- دیوان لامعی گرگانی 1319
38- دیوان هلالی چغتائی 1337
39- رباعیات بابا افضل کاشانی 1311
40- رباعیات حکیم عمر خیام 1306 (چاپ 316)
41- رساله روحی انارجانی- مندرج در فرهنگ ایران زمین 1333

42- رسالہ صاحبیہ مندرج در فرہنگ ایران زمین 1332
43- رسالہ فریدون بن احمد سپہ سالار در احوال جلال الدین مولوی 1325
44- رسالہ مجدیہ نوشتہ مجد الملک سینکی 1321
45- زین الاخبار تالیف ابوسعید عبدالحی گردیزی (شامل تاریخ ساسانیاں تاپایان دورۂ صفاری) 1333_
46- سامنامہ خواجوی کرمانی جلد اول 1316
47- سخناں منظوم ابوسعید 1334
48- سیر العباد الی المعاد- اثر سنائی غزنوی 1314
49- شاہنامہ جلد ہای 7/ 8/ 9/ 1 چاپ بروخیم 1314
50- شاہنامہ جلد اول چاپ خاور 1310
51- فتوت نامہ ناصری، مندرج در فرہنگ ایران زمین 1339
52- کلیات عراقی 1335
53- گشایش و رہایش، تالیف ناصر خسرو بمبئی 1328 (چاپ دوام دارد)
54- گلستان سعدی شیرازی 1340
55- لباب الالباب 1335
56- مقامات عبدالخالق غجدوانی و عارف ریوگری، مندرج در فرہنگ ایران زمین 1333
57- منتخب قابوسنامہ، وزارت فرہنگ ایران 1320
58- مواہب الٰہی (در تاریخ آل مظفر) تالیف معین الدین یزدی جلد اول 1326
59- نصیحت نامہ (قابو سنامہ) 1312 (چاپ دیگر ہم دارد)

(د، تحقیق در ادبیات فارسی و ایران)

60- آثار گمشدہ ابوالفضل بیہقی 1315
61- ابن سینا در اروپا 1333
62- احوال و منتخب اشعار خواجوی کرمانی 1307
63- احوال و اشعار رودکی سہ جلد 1309/ 1319 (چاپ دوم در یک جلد و تغیرات)

64- احوال و اشعار فارسی شیخ بہائی 1316
65- تاریخ نظم و نثر ایران در زبان فارسی 1334 (دو جلد)
66- جستجو در احوال و اشعار فریدالدین عطار 1320
67- در پیرامون احوال و اشعار حافظ 1321
68- در مکتب استاد (مباحث دستوری و املائی) 1434
69- روزگار ابن سینا 1331
70- زندگی و کار و اندیشہ روزگار پور سینا 1332
71- سخناں سعدی در بارۂ خودش 1316
72- سرچشمہ تصوف 1345
73- سرگزشت ابن سینا بہ قلم خود او 1332
74- شاہکار ہای نثر معاصر فارسی (2 جلد) 1330- 1332 (چاپ دوم دارد)
75- مجد الدین ہم گر شیرازی 1314
76- نظامی در اروپا 1314
77- (ترجمہ جشن نامہ ابن سینا) 1953
LELIVRE OU MILLENAIRE D' AVICENNE'

ہ، تاریخ ایران

78- بابک خرم دین، دلاور آذر بائیجان 1333 (چاپ دوام دارد)
79- بحرین، حقوق 1700 سالہ ایران
80- تاریخ اجتماعی ایران از انقراض ساسانیاں تا انقراض امویان 1342
81- تاریخ اجتماعی در دوران پیش از تاریخ و آغاز تاریخ 1342
82- پیشرفتہای ایران در دورۂ پھلوی
83- تاریخ بیمارستانہای ایران 1329
84- تاریخ اجتماعی و سیاسی ایران در دورہ معاصرہ 1335- 1344 (دو جلد)
85- تاریخ اجتماعی قرون معاصر 1334

86- تاریخ تمدن ایران ساسانی 1331- 1344 (متن جلد اول با ضمیمه آن)
87- تاریخ شهریاری رضاشاه پهلوی 1344
88- خاندان سعد الدین حمویه، مندرج در گنج کاوهای علمی و ادبی 1326
89- خاندان طاهریان 1335
90- در پیرامون تاریخ بیهقی 1342 (2 جلد)
91- درفش ایران و شیر و خورشید 1328
92- شیخ زاهد گیلانی، رشت 1307
93- مدرسه نظامیه بغداد 1313
94- مسیحیت در ایران 1343
95- یزدگرد سوم 1312

(و، لغت)

96- فرهنگ فارسی جیبی 1343
97- فرهنگ فرانسه فارسی 1309- 1310
98- فرهنگ نفیسی (فرنودسار) تألیف علی اکبر ناظم الاطباء 1318- 1339 (5 جلد)
99- فرهنگ نامه پارسی 1319 (جلد اول)

(ز، کتاب شناسی)

100- فهرست کتاب خانه مجلس شورئ ملی 1344 (جلد ششم)
101- فهرست آثار اروپائی در بارهٔ ابن سینا 1953
DES PRINCIPAUX TRAVAUX EUROPEENNE SUR AVICENNE
BIBLIOGRAPHIE

(ح، ترجمه تاریخ)

102- ابن خلدون و تیمور لنگ تألیف والترفیشتل، ترجمه باهمکاری نوشین نفیسی 1339

103- تاریخ ترکیه، تألیف لاموس 1316

(ط، آثار دیگر)

104- پیشرفتهای فرهنگی در اتحاد جماهیر شوروی 1323
105- سازمان آموزش عمومی در اتحاد جماهیر شوروی 1323
106- سرانجام آلمان (ترجمه) 1326
107- صنعت تخم نوغان ایران، تألیف ف لافن و- ه- ل- رابینو (ترجمه) 1298
108- معالجه تازه برای حفظ و ندانهای طبیعی ودهان، تألیف گریگوریان
109- هفتاد سال زندگی، پنجاه سال خدمت به دانش (زندگی عبدالعظیم قریب) 1326
110- هدیه دوستانه 1304

(ی، مجلّات)

111- امید (روزنامه) هفت شماره 1302
112- پیام نو (مجلّه ماهنامه) دوازده شماره 1309- 1310
113- شرق (مجلّه) سال اول دوازده شماره 1313
114- مجلّه فلاحت و تجارت 1297- 1299 (سه سال)

یا، مقالات

مقالات نفیسی بسیار متعدد و متفرق و در زمینه های متنوع است و از سال 1290 در جرائد و مجلّات ایران دیده شده است

یب- آثار چاپ نه شده

درین باب مراجعه شود به مقاله کتاب خانه سعید نفیسی و نسخه های خط او مندرج در یاد نامه

سعید نفیسی، چاپ دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی دردانشگا، تھران (تھران، 1351)

سعید نفیسی ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ عبدالغفار طھوری نے گل چینی ازدیوان استاد سعید نفیسی کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے۔

سعید نفیسی نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ پھر ڈرامے پر طبع آزمائی کی ہے اور تاریخ و تنقید پر تو ان کا بے شمار کام ہے۔ ہم یہاں اس مختصر تذکرہ میں ناول نگار، افسانہ نگار یا ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ادبیات فارسی میں ان کا مقام متعین نہیں کرسکتے کیونکہ یہ ان کی زندگی کے ادوار میں مختلف کارنامے ہیں جو روش زمانہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی انجام دیئے ہیں۔ یہاں ہم ان کو صرف نثرنگار کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کی نثر رواں دواں ہے۔ ہر لحاظ سے فصیح ہے۔ عوامانہ محاورہ کے زیادہ نزدیک ہے چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں سوز و اخلاص جھلکتا ہے۔ خصوصاً افسانوں اور ناولوں کی زبان نہایت شیریں ہے۔ فرنگیں کا یہ نمونہ دیکھئے۔

"شاید درماتیب دیگر ترا عزیز من یا معبود من خطاب کنم یا بالاتر ازہمہ شاید ترا باسم خودت بخوانم۔ آیا ہمین مقدمہ کافی نیست کہ بدانی برای چی این مکتوب رابتو می نویسم! تاچھار ساعت پیش تو در زندگی من مقامی نداشتی۔ در دل من جای برای تو بنود دل ازین پس حس مکینم کہ توئی و من، منم و تو، دلھا چقدر زودبی مقدمہ فریفتہ می شوند"۔

رشید یاسمی

غلام رضا ان کا نام تھا۔ وہ اصلاً کرد تھے اور قبیلہ گوران سے تعلق رکھتے تھے، کرمانشاہ میں 1314ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے لوگ اہل فضل و ادب میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے نانا محمد باقر مرزا خسروی صاحب دیوان تھے اور داستان "شمس و طغرا" کے مصنف ان کے والد محمد ولی خان میرپنج خوشنویس، شاعر، نقاش اور صاحب سیف والقلم تھے۔ ابتدائی تعلیم کرمانشاہ میں حاصل کی۔ بعد میں تہران آگئے اور سن لوئی کے مدرسہ میں تحصیلات کی تکمیل کی۔ تہران میں ان کو بہار، سعید نفیسی، عباس اقبال، علی دشتی اور دوسرے ادباء و فضلا سے فیض صحبت پانے کا موقع ملا اور ان کی معیت میں وہ اخبار و رسائل میں کام بھی کرتے تھے۔ بعد میں کچھ عرصہ کیلئے وزارت مالیہ، وزارت تعلیم اور وزارت دربار میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ ان خدمات کے بعد آخرکار دانش کدہ ادبیات میں تاریخ کے پروفیسر ہوگئے اور اپنے علمی و ادبی مشاغل سے تاریخ و ادبیات کی خدمات انجام دیتے رہے۔ 11 اسفند 1327 ش تاثیر عقائد و افکار حافظ درگوت، کے موضوع پر تقریر کررہے کہ اچانک سکتہ طاری ہوگیا۔ ایک مہینہ تہران میں علاج کرانے کے بعد یورپ چلے گئے۔ جب لوٹے تو 18 ارد یبشت 1330 (1951ء) کو تہران میں وفات پاگئے۔

رشید یاسمی کا نام بھی اپنے زمانے کے مشہور استادوں، محققوں اور شاعروں میں لیا جاتا تھا۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی میں مہارت کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور پہلوی ادبیات میں بڑا تسلط رکھتے تھے۔ ان کی تالیفات سے ان کی وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے استادوں کی طرح انہوں نے بھی پرانے قلمی نسخوں کی مدد سے شعراء کے دیوان اور دوسری تصانیف کو مفید حواشی اور تعلیقات کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا۔ ان میں چند ایک یہ ہیں۔

1- دیوان مسعود سعد سلمان
2- دیوان محمد باقر خسروی
3- دیوان ھاتف
4- دو بیتی ھای باباطاہر
5- سلامان و ابسال جامی
6- منتخب اشعار فرخی سیتانی
7- اندر زنامہ اسدی طوسی
8- نصائح فردوسی

انہوں نے مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے کئے۔

انگریزی سے

1- چنگیز خاں از ھارلہ لمب
2- تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم از براؤن

3- مقام ایران و تاریخ اسلام مارگولیت
4- آئین دوست یابی از ڈیل کارنگی

فرانسیسی سے

1- تاریخ عمومی قرن بجدہم از البرمالہ
2- تاریخ نادر شاہ
3- ایران در زمانہ ساسانیاں از کرستن سن
4- از قصر شیریں بطوس
5- اندرزھای اپیکتتوس

پہلوی سے

1- اردا ویراف نامہ
2- اندرز آذر بادرمار سپندان
3- اندر زاد شنزداناک

دیگر تالیفات

1- تتبع در احوال و آثار سلمان ساوجی
2- تاریخ ملل و نحل
3- پرورش افکار بوسیلہ کلیات تاریخ
4- آئین نگارش تاریخ
5- کرد، پیوستگی نژادی و تاریخی او
6- تتبع در احوال و آثار ابن یمین
7- ادبیات معاصر
8- تاریخ مختصر ایران
9- قانون اخلاق
10- دستور زبان فارسی بادیگر اساتذہ

شعر

منتخب اشعار رشید یاسمی کے عنوان سے 1312 شمسی میں ان کا ایک مجموعہ کلام شائع ہوا تھا۔

آئین نگارش تاریخ ان کی بڑی اہم کتاب ہے۔ انہوں نے اس میں تاریخ کی مختلف تعبیرات بتائی ہیں۔ تاریخ کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کون کونسی چیزیں مستند تاریخ لکھنے کے کام آتی ہیں اور کس قسم کے مدارک پر اعتماد کرنا چاہئے۔ اس کتاب کی تحریر سے تاریخ نویسی کے بارے میں انہوں نے جو تحقیق کی اس سے اپنی تاریخ کی کتابوں سے کام لیا۔ انہوں نے شعراء کے احوال زندگی کی تحقیق کیلئے جو طریق کار اختیار کیا وہ مستند ہے۔ شاعر کے اپنے کلام میں داخلی اسناد کے علاوہ اس کے معاصرین کی گواہیوں پر اعتماد کرکے مستند حالات زندگی پیدا کئے ہیں۔ یہ طریق کار بڑی محنت اور دقت نظری کا کام ہے۔ اس موضوع پر فارسی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو لکھی گئی۔ یہ کتاب علمی ہے اس لئے اس میں بہت سی جزئیات فلسفہ اجتماع اور سائنسی نقطہ نظر سے بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس وجہ سے کہیں کہیں زبان پیچیدہ ہوگئی ہے اور کئی جگہ ترجمے کا زیادہ شبہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ ٹکڑہ دیکھئے۔ مطلب میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔

"امکان دارد کہ یک حکم در نزد کسی مجرب کلی و در نزد دیگری مجربی اکثری و در نزد شخص ثالثی اصلاً غیر مجرب باشد۔ نمیتوان برای شخص منکری کہ خودش مباشر تجربہ بنودہ است، حکم مجربی را اثبات دو نیز از خواص مجربات این است کہ مقرون بہست خاص باشد' بہ عبارت اخری باید احکام تجربی مقید باشد یا بزمان معین یا بمکان معین یا باشی معین"۔ (ص 37)

ان کا عام اسلوب بیان قدیمی ہے۔ وہ زبان کے صحافتی رجحانات سے متاثر نہیں ہوئے تطہیر زبان کی تحریک سے بھی وہ غیر متعلق رہے ہیں۔ وہ بے تکان عربی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جن کے بجائے آسان فارسی کے الفاظ لکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً عوام الناس، علی متعلق العمیا، مبرہن، تطاول، **مستخفظ**، مسامحت رادرع۔

ادبیات معاصر سے رشید یاسمی کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے زندہ شعرا کے متعلق انتقاد سے گریز کیا ہے لیکن قدیم شعراء کے متعلق انہوں نے جہاں کہیں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس سے شاعر کا کلام سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شاعر کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

"گفتارش انعکاس امواج ابدی و اصوات حقیقی است علاوہ بر طبعی کشادہ یک بے خبری و حساسیتی لازم است کہ گاہ گاہ اور ابحال یک جذبہ ملازم و شیرینی بیندا زد"۔

پھر لکھتے ہیں: جس وقت شاعر بولتا ہے ایک محسوس اور بلا ارادہ موسیقی اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔

احمد کسروی

سید احمد کسروی 1308 ہجری (1890ء) تبریز میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اہل تصوف اور عرفان کیلئے معروف تھا۔ انہوں ہی نے اپنی تحصیلات اپنے شہر کے مدرسہ **طالبیہ** میں تمام کیں۔ 1333ھ میں مدرسہ میموریل امریکائی میں داخل ہوئے۔ انگریزی زبان سیکھنے کے ساتھ وہ اس مدرسہ میں ادبیات عربی و فارسی پڑھاتے رہے۔ 1298 شمسی میں وہ وزارت مالیہ میں ملازم ہوگئے۔ تھوڑی مدت کے بعد کام چھوڑ کر تہران آگئے اور مدرسہ ثروت میں عربی کے معلم ہوگئے لیکن از سرنو وزارت عالیہ کی خدمت قبول کرلی اور مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اور کچھ عرصہ تک شہرستان، خوزستان، زنجان اور اردبیل میں رئیس وادگستری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ خراسان اور تہران کے مدعی العموم (ایڈووکیٹ جنرل) بھی رہے۔ اس کے بعد ملازمت سے استعفاء دے کر وکالت کا پیشہ اختیار کرلیا۔

زندگی کے آخری سالوں میں وہ اصول مذہب اسلام، ادبیات اور تصوف کے خلاف سخت تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ 1324 ش 1946ء میں عدالت میں ایک مقدمہ کی پیروی کیلئے حاضر تھے کہ ایک شدید قسم کے متعصب شخص نے گولی مار کر ان کو ہلاک کردیا۔

کسروی نے 1312 ش 1933ء میں ایک مجلّہ "پیمان" کے نام سے جاری کیا جو 32 صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ غیر مرتب طور پر 1320 تک جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے روزنامہ "پرچم" بھی جاری کیا جو ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور روزانہ بھی شائع ہوتا رہا۔

تالیفات و تصانیف

تاریخی و تحقیقی

1- آوزی یا زبان باستان آذربائیجان
2- شہریاران گم نام 3 جلد
3- نامہای شہرہاودیہ ہاو سالہا
4- **تاریخیہ** شیرو خورشید
5- تاریخ مشعشا
6- تاریخ مشروطہ ایران (3 جلد)
7- تاریخ ہجدہ سالہ آذربائیجان
8- مقالات کسروی (2 جلد)

9- کاف نامہ
10- **تاریخیہ** پانصد سالہ خوزستان
11- شیخ صفی و تبارش
12- **تاریخیہ** چپق وغلیان

اجتماعی، ادبی اور سیاسی

1- حافظ چہ میگوید
2- در پیرامون شعر و شاعری
3- در پیرامون اسلام
4- در پیرامون روان
5- در پیرامون خرد
6- در پیرامون زمان
7- قانون دادگری
8- آئین 2 جلد
9- فرہنگ چیست؟
10- کاروپیشہ وپول
11- پرسش وپاسخ
13- پیام دانشمندان اروپا امریکا
13- در راہ سیاست
14- دہ سال راعدلیہ
15- سرنوشت ایران چہ خواہد بود
16- پاک خوی
17- دادگاہ
18- عطسہ بہ صبرچہ ربط دارد
19- بخوانید وداوری **کنید**
20- زبان پارسی
21- زبان پاک
22- درپیرامون ادبیات
23- دین و جہان
24- راہ رستگاری
25- پندارہا
26- سیزدہم مردار
27- صوفی گری
28- بہائیگری
29- شیعیگری
30- فرہنگ است یا نیرنگ
31- درجاوند بنیاد
32- افسران ما
33- خواہران و دختران ما
34- بہمن ماہ
35- خدا باماست
36- درپاسخ حقیقت گو
37- گفت و شنید
38- درپاسخ بدخواہان
39- نیک و بد
40- یکم آذر
41- یکم ویماہ
42- امروز چارہ چیست
43- از سازمان ملل چہ نتیجہ تواندبود
44- امروز چہ باید کرد
45- زندگانی من

ترجمے

1- کارنامہ اردشیر پاپکان (پہلوی سے)
2- پلو تارخ 2 جلد (انگریزی سے)

کتب بزبان عربی

1- الدره الثمینه(درسی کتب) 2- النجمتہ الدریہ (درسی)
3- التشیع و شیعہ 4- قھوہ السورات (ترجمہ از اسپرانتو)

زبان دان

کسروی ان متقدمین میں سے ہیں جنہوں نے مشروطہ کے بعد زبان کی اصلاح کیلئے کوششیں کیں اور معقول تجاویز پیش کیں اور ان پر خود عمل کرکے بھی دکھایا- انہوں نے مجلّہ "پیان" جاری کیا تو سادہ خالص فارسی زبان لکھنے کا رواج کیا- وہ اس بات کے مخالف تھے کہ فارسی سرہ لکھتے لکھتے اوستا اور پہلوی کے متروک اور نافہم الفاظ داخل کرکے زبان کی فصاحت اور لطافت کو نقصان پہنچایا جائے اور عربی کے بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے کے تو وہ مخالف تھے- نصراللہ وصاف اور حمید کاتب کو زبان فارسی کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے- زبان کے مسئلہ پر ان پر بڑی لے دے ہوئی- وضع اصطلاحات کیلئے فرہنگستان قائم ہوئی تو انہوں نے ان پر بھی اعتراضات کئے- وزیراعظم کی طرف سے ان کو ہدایات بھی موصول ہوئیں کہ وہ اس قسم کی فارسی نہ لکھیں لیکن انہوں نے ان کی سفارشات کی بالکل پروا نہ کی- ان کا عقیدہ تھا کہ فارسی زبان دنیا بھر کی زبانوں سے شیریں اور آسان زبان ہے اور گرامر کے بغیر بھی سیکھی جاسکتی ہے- صرف علمی، فنی اور اداری کاموں کیلئے اس کو بنانا اور سنوارنا ہے- انہوں نے زبان کا پورا جائزہ لینے کیلئے فارسی باستان اوستا، پہلوی اور دارمنی کے علاوہ مازندرانی، دماوندی، شوستری، سمنانی، سرخہ ی اور کردی بولیوں کو بھی سیکھا-

ان کی اپنی نثر میں عربیت کا تو شائبہ بھی نہیں اور نہ ہی پرانے متروک الفاظ کا استعمال ملتا ہے بلکہ فارسی کے اندر سے ہی ایسی ایسی ترکیبیں بناتے اور افعال نکالتے ہیں کہ فارسی بھی خالص کی خالص رہتی ہے اور عبارت کی روانی اور فصاحت میں بھی فرق نہیں پڑتا اور یہ زبان پر کمال قدرت کی نشانی ہے- اکثر متعصب اشخاص نے بھی فارسی سرہ لکھنے کا التزام کیا ہے لیکن ناگوار اور ناموزوں الفاظ کے استعمال سے عبارت غیر فصیح اور نافہم ہوکر رہ گئی ہے- کسروی کی نثر کا نمونہ یہ ہے- مجلّہ "پیان" میں ایک شاعر کے متعلق لکھتے ہیں-

"ما آرزو مندیم کہ ہمہ جواناں ایران بد -لساں پاکدرون و بیدار دل باشندو و ازین جہت ہیچگہ

نہ پذیرائی از آقای گوہری و شعرہای اور ادریغ نمی سازیم و ہمیشہ کوشش داریم کہ اینگو نہ جوانان درمیان ہمگناں نیک نام و بلند آوازہ باشند و ہمیشہ سرفرازی ایران را در فزوئی و فراوانی این گونہ جواناں میشناسیم"

تنقید نگار

کسروی ادبیات کی افادیت کے قائل تھے- شاعری ہو یا فلسفہ، ناول ہو یا افسانہ- اگر ان سے اجتماع میں فساد اخلاق پیدا ہوتا ہے تو وہ جلا دینے اور مٹا دینے کے قابل ہیں- کسروی پہلے شخص ہیں جنہوں نے بڑی جرات اور بے باکی سے اپنی تنقید کو پیش کیا اور کہا کہ مولوی و عطار کی شاعری نے ہماری قوم میں فقیر، درویش اور بھکاری پیدا کئے ہیں- مغلوں اور تیموری عہد کے شعراء نے چاپلوسی اور جھوٹی مدح سرائی سے ملت ایران کو جھوٹا اور خوشامدی بنادیا- انوری، سوزنی، عبید زاکانی اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء نے فضول گوئی، دشنام طرازی اور عیب جوئی کا سبق سکھایا- خیام جس کو سیاسی اغراض کی خاطر یورپ والوں نے بھی اچھالا- عیش کوشی اور شراب نوشی کے سوا کوئی تعلیم نہیں دیتا- وہ کہتے تھے کہ ہمیں ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو ہماری قوم کے نوجوانوں میں شہامت نفس اور علوہمت پیدا کرے- شروع شروع میں تو لوگوں نے ان کو دشمن ادبیات کہا لیکن ایسے بھی نکل آئے جنہوں نے غزل و ہجو کے دیوان جلا کر اپنی توجہ ملی شاعری کی طرف مبذول کی- اروپائی فلسفہ کے متعلق بھی انہوں نے بتایا کہ وہ دین و خداشناسی اور نیک خواہی کا مخالف ہے- انہوں نے جان درواں درپیرامون خرد، اور دین و دانش، جیسے پرمغز مقالات لکھ کر خرابی ہائے فلسفہ کی طرف توجہ دلائی اور اسی طرح عشقیہ افسانوں اور ناولوں کا سیلاب جو اروپائی ادبیات سے ترجموں کی صورت میں ایرانی ادبیات میں داخل ہورہا تھا نوجوانوں کیلئے اس کو ضرر رساں قرار دیا-

مورخ و محقق

کسروی بڑے محنتی اور دقیق نظر تھے- تاریخ اور جغرافیا پر ان کی گہری نظر تھی- جستجو اور کاوش کے مسئلہ کی تحقیق کرتے تھے- تاریخ پر ان کی کتابیں اس بات کی عینی شاہد ہیں- خاص

طور پر شہریاران گمنام ان کی نہایت قابل قدر کتاب ہے جس میں انہوں نے و یلمیوں، روادیوں اور شدادیوں کے نامعروف خاندانوں کے حکمرانوں کا حال لکھا ہے- دنوں، شہروں اور اطراف کے بارے میں ان کی تحقیقات ان کی کاوش کو واضح کرتی ہیں- تاریخ طبرستان پر ان کی تنقید ان کی علمی وسعت کام پتہ دیتی ہے وہ تاریخ کو زمانے کے سیاسی و اجتماعی احوال کا آئینہ سمجھتے تھے اور غیر متعصب اور دیانت دار مورخ ان کی نظروں میں قابل قدر تھے- ان کا خیال تھا تاریخ ایران میں تاریخ بیہقی اور تاریخ آراء عباسی کے سوا تقریباً تمام مورخ خوشامدی اور مدح سرا ہیں- وہ تحقیق و تنقید میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھے- انہوں نے التنبیہ علی حدوث التصحیف کے بارے میں ملک الشعراء بہار پر بے باکی سے تنقید کی اور ان کی ادبی بد دیانتی کو برملا بیان کیا-

کسروی کی ایک عجیب جامع شخصیت تھی- زبان و ادبیات اور دین و سیاست میں انہوں نے اپنی انفرادی رائے کو نمایاں کیا- وہ محب وطن تھے- انہوں نے زندگی کے ہر کام میں قوم و وطن کی بہبود کو مد نظر رکھا- اس لئے زبان، شاعری اور فلسفہ میں افادیت اور مقصدیت کو ترجیح دی- زبان و خط کو آسان بنانے کیلئے معقول تجاویز پیش کیں- وہ اپنے عقاید و افکار کی خاطر شہید کردیئے گئے-

سید تقی زادہ

تقی زادہ 1296 ہجری کو تبریز میں پیدا ہوئے- ان کے والد سید تقی تبریز کے موقر علما میں سے تھے- تقی زادہ نے دینی ماحول کے مطابق مروجہ تعلیم یعنی صرف و نحو، معانی و بیان، منطق و بدیع اور مختصر سی ادبیات فارسی و عربی اور تاریخ وغیرہ پڑھی- بعد میں علوم کی تکمیل اور معلومات کی وسعت کیلئے خود مطالعہ کرتے رہے- اسلامبول کے روزنامہ "اختر" اور بیروت و قاہرہ کی مطبوعات و رسائل پڑھتے رہے- طالب اف اور اخوندوف کی تصانیف کو بھی دلچسپی سے پڑھا- محمد علی خان تربیت کے کتب خانے سے خوب استفادہ کیا- یہی سیاسی، علمی اور ادبی مباحث میں حصہ لیتے رہے 1320ھ میں مرزا یوسف اعتصام الملک اور محمد علی تربیت کی معیت میں نہایت کامیاب مجلّہ گنجینہ فنون کے نام سے جاری کیا- کچھ عرصہ کیلئے تقی زادہ معلومات کی تکمیل کیلئے مصر بھی گئے-

انہوں نے اپنے روشن خیالات کی وجہ سے اچھا نام پیدا کرلیا تھا اور مشروطیت خواہوں میں ان

کا نام لیا جانے لگا تھا- چنانچہ وہ پہلی مجلس شورئ ملی کیلئے 1324ھ 1940ء میں نمائندہ منتخب ہوئے- انہوں نے مجلس کے مباحث میں خوب حصہ لیا- قانون اساسی کی تصویب میں کوشش کی- 1326ء میں محمد علی شاہ کے حکم سے مجلس پر بمباری ہوئی اور پہلی مجلس کا خاتمہ ہوا- بادشاہ کے مخالفین کو سزائیں ملیں- تقی زادہ سفارت انگلیس میں پناہ گزین ہوئے آخر ایک سال کیلئے جلا وطن کر دیئے گئے- وہ قفقاز کے راستے اسلامبول پہنچے، وہاں بھی انہوں نے ایرانیوں میں مشروطیت کیلئے تبلیغ جاری رکھی- تبریز میں واپس آئے تو شاہ کے خلاف مجاہدین زور آزما تھے مگر ساتھ ہی عوام پر بھی زبردستی کرتے تھے اور جبرا روپیہ وصول کرتے تھے اور خطرہ تھا کہ اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر کہیں روس نہ آدھمکے چنانچہ تقی زادہ نے اپنی کوششوں سے مجاہدین کو ضبط میں رکھا- آخر تہران فتح ہوا- محمد علی شاہ برطرف ہوا اور دوسری مرتبہ مجلس کا قیام ہوا- تقی زادہ پھر نمائندہ منتخب ہوئے- اس مجلس میں وہ ڈیمکرٹ پارٹی کے لیڈر تھے- علمائے نجف نے ان کے خلاف بے دینی کا فتوئ دیا اور سید بیہمانی کے قتل کا محرک سمجھا چنانچہ وہ تہران چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے اور تبریز سے ہوکر اسلامبول گئے- کچھ عرصہ ٹھہر کر امریکہ چلے گئے اور ترجمہ کرکے روزی کماتے رہے- 1333ھ میں تیسری مجلس قائم ہوئی- وہ تہران سے نمائندہ منتخب ہوئے لیکن وہ ایران واپس نہ آئے- جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ امریکہ سے یورپ آکر جرمنی میں مقیم ہوگئے- ایران میں روسی نظام سے تنگ آکر تحریک آزادی کے دوسرے علمبردار بھی ہجرت کرکے ممالک مغرب میں آگئے- انہوں اپنے عقائد کی تبلیغ کیلئے اور ایران کی سیاسیات کو دول یورپ کو سمجھانے کیلئے روزنامہ "کاوہ" کی بنیاد رکھی اور نکات و ملاخطات کے عنوان سے سیاست اور اجتماعی مسائل پر تنقید کرتے رہے-

جنگ ختم ہوئی اور روس میں زار حکومت بھی ختم ہوئی- تقی زادہ نے ایرانی لیڈروں کو مشورہ دیا کہ وہ نئی حکومت سے معاہدات کریں چنانچہ بالشویک روس سے صلح ہوئی- ایران میں بھی امن ہوا- 1299 ش 1920ء میں رضا خان نے حکومت پر قبضہ کرلیا- تقی زادہ مجلس چہارم میں بھی نمائندہ منتخب ہوئے اور پنجم میں بھی- 1302 میں مجلس پنجم میں شرکت کیلئے وہ تہران واپس آگئے- نمائندگان مجلس احمد شاہ کی برطرفی کے حق میں تھے اور رضا خان کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن تقی زادہ اعلانیہ کہتے تھے کہ یہ تغیر سلطنت اساسی قانون کے مخالف ہے- آخر 1304 میں رضا شاہ کو شہنشاہ ایران تسلیم کرلیا گیا- 1305 میں وہ پھر مجلس ششم میں منتخب ہوئے- 1308 میں ان کو لندن میں ایران کا وزیر مختار متعین کیا گیا- چند مہینوں کے بعد واپس بلائے گئے بعد میں

وزیر مالیہ ہوگئے اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر حسن اسلوب سے خدمات انجام دیتے رہے۔ رضا شاہ کے ساتھ اصولاً ان کی ناموافقت تھی اور وہ بادشاہ کی مستبدانہ رائے کے خلاف رائے دیتے رہے۔ 1312 میں ان کو وزارت مالیہ سے الگ کردیا گیا اور ان کو پیرس میں وزیر مختار ایران مقرر کیا گیا لیکن تھوڑے عرصے کے بعد انہیں معزول کردیا گیا۔ اس کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور تدریس و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ 1320 میں انہیں پھر لندن میں وزیر مختار بنایا گیا۔ رضا شاہ کی تبعید کے بعد نیا نظام قائم ہوا اور وہ تہران میں واپس آگئے اور مسلسل مجلس کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ فرانس میں بھی کام کرتے رہے۔ آجکل مجلس سنا کے صدر ہیں اور ان کی شخصیت سیاسی اور علمی حلقوں میں قابل احترام شمار ہوتی ہے۔ 92 سال کی عمر میں 8 بہمن ماہ 1348ش 1389ھ 1969ء میں وفات پاگئے۔

تقی زادہ نہ صرف ایک روشن فکر سیاست دان اور فدائی وطن پرست شمار ہوتے ہیں بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے "کاوہ" اجراء کرکے روزنامہ "نگاری" کا معیار بلند کیا اور ایرانیوں کیلئے مثالی نمونہ پیش کیا۔ اس زمانے میں ایرانی صحافت کا معیار پست تھا۔ زبان کا تحول ہورہا تھا اور زبان عجیب ملغوبہ سا بن رہی تھی۔ تقی زادہ ان رہنماؤں میں سے ہیں جنہوں نے زبان کی اصالت کو قائم رکھنے پر زور دیا۔ "کاوہ" کے دور جدید میں جو جنوری 1920ء میں جاری ہوا۔ ان کی زیادہ توجہ ادبی، علمی اور اجتماعی مضامین کی طرف رہی اور انہوں نے بہترین مقالات شائع کئے۔ کاوہ کے مقاصد میں ترویج، تمدن، درایران اور زبان و ادبیات فارسی کی پاکیزگی اور حفاظت میں کوشش بھی شامل تھی۔ بہت سے لکھنے والے جن کی معلومات کافی نہ تھیں۔ وہ فرانسیسی اور ترکی زبان و ادب سے متاثر ہوکر لکھتے تھے۔ تقی زادہ ان کی تحریروں کو ادبیات کربلا یا ادبیات منطق الطیر کہہ کر ان کے منتخبات شائع کرتے تھے اور ان کے مقابل میں ادبیات قدیم کو ادبیات حاجی مرزا آقائی کے عنوان سے شائع کرکے پڑھنے والوں پر واضح کرتے تھے کہ اس قسم کی تحریریں ذوق ادبی سے محروم اور قابل تنسیخ ہیں۔ جمال زادہ اور علامہ قزوینی نے سب سے پہلے اسی مجلہ میں لکھنا شروع کیا۔ علمی و ادبی مقالات کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ تاریخ و تحقیق میں لکھنے والوں نے اروپائی تحقیق و تنقید کا اسلوب اختیار کیا۔ تقی زادہ نے فردوسی کے بارے میں جو تحقیقی مقالات لکھے اس سے پیشتر ایسے مقالات کسی ایرانی یا اروپائی کے قلم سے نہیں نکلے تھے۔

تقی زادہ کی مستقل تصانیف اور یادگار مقالات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- تحقیق حالات کنونی ایران یا محاکمات تاریخی۔ یہ ایک پر مغز مقالہ ہے جس میں مصنف نے ایرانی عظمت یاد دلا کر اور زمانہ کے تحولات کا جائزہ لے کر تلقین کی ہے کہ متمدن قوموں کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کو بھی نیا تمدن قبول کرلینا چاہئے۔

2- از پرویز تا چنگیز۔ یہ کتاب ساسانیوں سے لیکر خلفائے اسلام تک ایک مختصر سی نامکمل تاریخ ہے۔

3- کشف الغطاء۔ اس رسالہ میں سیاسی مسالک پر بحث ہے اور حزب دمکراسی کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے۔

4- سفینہ غواصہ یا سیاحت تحت البحر، ژول ورن فرانسوی کی کتاب کا ترجمہ جس میں علوم و جدید نظریات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

5- گاہ شماری در ایران

6- مختصر تاریخ مجلس ملی ایران

7- تمدنات قدیمہ ترجمہ کتاب گوستاکیابون جو مجلہ گنجینہ فنون میں شائع ہوا۔

8- مقالات تقی زادہ

9- مقدمہ دیوان ناصر خسرو۔ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔

10- ایران و جنگ فرنگستان

11- جنبش ملی ادبی۔ اس مقالے کا موضع لزوم تجدد ادبی، اصلاح زبان فارسی اور فرہنگستان پر اعتراضات ہیں۔

12- مقدمہ تعلیم عمومی یا یکی از سر فصل ہائی تمدن۔ اس مقالہ میں عربی رسم الخط کی خامیاں بیان کرکے لاطینی رسم کی خوبیاں اور آسانیاں بیان کی گئی ہیں۔

13- حفظ زبان فصیح فارسی

ان کتابوں کے علاوہ اور بھی مقالات ہیں جو انہوں نے مجلہ "آئندہ" میں انتخابات اور مربوط قوانین کی خرابیوں کے بارے میں اور مجلہ "تقدم" میں مالیاتی بجٹ اور اساسی اصلاحات کے بارے میں لکھے ہیں۔

شروع شروع کی تحریروں میں تقی زادہ کا اسلوب بیان عربی سے متاثرہ ہے۔ عربی آیات و امثال اور منشیانہ استعارات، کنایات موجود ہیں۔ روزنامہ "کاوہ" کے اجراء پر ان کی طرز تحریر میں اعتدال آگیا ہے۔ طویل جملوں کے بجائے چھوٹے جملے آگئے ہیں۔ زیادہ سلاست و روانی

نمایاں ہے۔ سیاسی اور علمی دقیق مسائل سمجھانے میں جس قدر وضاحت اور صراحت کی ضرورت ہے وہ عیاں ہے۔ عبارت کی پختگی اور کلمات کی متانت کے ساتھ ساتھ مصنف کی علو فکر اور اس کے دل کا اخلاص شامل ہے۔ ان کی بعض تنقیدی تحریروں میں نامحسوس طنز و استہزاء بھی موجود ہے۔ ان کے بیانات میں منطقی استدلال موجود ہے۔ نثر کا نمونہ یہ ہے۔

"نو روز اسم روز اول ساز زردشتی و نخستین روز از فرور دین ماہ بودہ است۔ ماھھای ایران کہ حالا ما در حساب سال و ماہ خود مان استعمال میکنیم اگرچہ از سال 1304 ہجری شمسی بایں طرف در ایران رائج شدہ قبل از آن تاریخ نیز در تقویم ہای ایرانی ثبت میشد"۔

عباس اقبال اشتیانی

عباس اقبال 1314 ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آشتیان کے رہنے والے تھے۔ ایک معمولی پیشہ سے ان کی گزران ہوتی تھی۔ اقبال نے اپنا بچپن تنگ دستی میں گزارا۔ وہ اپنی روٹی کمانے کیلئے ایک بڑھئی کی دکان پر کام کرتے تھے لیکن ان کے دل میں پڑھنے لکھنے کا وہ والہانہ شوق پیدا ہوا کہ بڑھئی کی دکان سے اٹھ کر مکتب میں جا پہنچے۔ مکتب سے تحصیل کی تکمیل کر کے دارالفنون میں داخل ہوئے اور اپنی محنت و کوشش سے درجہ اول طلبہ میں ان کا شمار ہوا چونکہ اپنے ہم سبقوں سے زیادہ باہوش اور دانا تھے۔ اس لئے کتاب خانہ "معارف" کے معاون منتخب ہوئے اور اس کے بعد دارالفنون میں پڑھانے پر بھی مامور ہوئے۔ آہستہ آہستہ مدرسہ نظام علوم سیاسی اور دارالمعلمین عالی میں معلم مقرر ہوئے۔ 1314ش میں ہیئت نظامی کے ساتھ منشی ہو کر پیرس گئے۔ وہاں جا کر علم کی تکمیل علم میں وقت گزارا اور سربن یونیورسٹی سے ادبیات میں لیسانسن کا ڈپلوما حاصل کیا۔

جن دنوں کتاب خانہ معارف کے معاون تھے۔ مشہور و معروف ادبی شخصیتوں کے ساتھ ان کی آشنائی ہوئی۔ مرحوم غلام حسین رہنما' مرحوم علی فروغی اور عبدالعظیم قریب جیسے فاضل اشخاص کی صحبتوں میں بیٹھے رہے۔ ملک الشعراء بہار نے جب مجلّہ دانش کدہ جاری کیا تو وہ مجلس ادارت کے رکن تھے۔ اس رسالہ میں بھی اور مجلّہ فروغ تربیت اور فروغ علم میں بھی اپنے مقالات شائع کرتے رہے جن سے ان کی استعداد اور قابلیتوں کی شہرت ہوئی۔ پیرس میں علامہ قزوینی سے دوستی ہوئی اور آخر عمر تک ان کی معیت میں تحقیق و تنقید کا کام کرتے رہے۔

ایران واپس ہوئے تو استاد دانش گاہ مقرر ہوئے اور فرہنگستان کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ وہ اپنا علمی و ادبی کام کررہے تھے کہ خستگی اور پریشان حالی نے آلیا۔ آخر وہ ترکیہ اور اٹلی میں ایران کی طرف سے نمائندہ فرہنگ متعین ہوکر روم چلے گئے اور وہیں بیمار ہوکر 1334 ش / 1955ء میں عالم بقا کو سدھارے۔

اقبال نے 1324 میں یادگار کے نام سے ایک علمی، ادبی اور تاریخی رسالہ شروع کیا اور پرانی تصانیف شائع کرنے کیلئے ایک انجمن نشر آثار ایران بھی قائم کی۔ یادگار اپنے وقت کے اول درجے کے رسائل میں شمار ہوتا تھا اور اپنے علمی و تحقیقی مضامین کیلئے واقعی قابل قدر یادگار تھا۔ کچھ عرصہ تک انجمن کے زیر صدارت چند کتابیں شائع کیں۔ بعد میں دوستوں نے بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ اس لئے اقبال کا دل بھی ملول ہوا اور انہوں نے تصنیف و تالیف سے کنارہ کشی کرلی۔ یادگار بھی بند ہوگیا اور وہ ایک نئے کام پر مامور ہوکر چلے گئے۔

تصانیف و تالیفات

1342ق۔ قابوس وشم گیر زیاری، از انتشارات، مجلّہ ایران شہر، برلین، 27 ص
1307ش۔ شرح محال عبداللہ بن المقنع فارسی۔ از انتشارات مجلّہ ایران شہر، برلن، 85 ص
1308_ ترجمہ یاد داشت ہائی ژنرال ترہ زل فرستادہ ناپلون بسمت ہند، از انتشارات ادارہ شورائی نظام ز+ 149 + 8 صفحہ
1309 تصحیح (حدائق السحر فی دقایق الشعر) اثر وطواط، از انتشارات کتاب خانہ کاوہ، عج المقنع س ص
1310 ترجمہ ماموریت ژنرال گاردان در ایران، تالیف پسرش کست آلفرد و گار دان، از انتشارات ادارۂ شورای نظام، 193 ص
1311 خاندان نوبختی، یو+ 197 ص
1312 ترجمہ طبقات سلاطین اسلام، تالیف استانلی لین پول، از انتشارات کتاب خانہ مہر، یط + 339 ص
تصحیح و بیان الادیان، تالیف ابوالمعالی محمد الحسینی العلوی، یج+ 47 ص
تاریخ مفصل ایران از استیلای مغول تا اعلان مشروطیت (جلد اول) از جملہ چنگیز تا تشکیل دولت

تیموری ز+ 37 ص (چند بار بعد چاپ شدہ)
کلیات علم جغرافیا 2470 ص
نشر بیست مقالہ قزوینی، جلد دوم، 290 ص (چاپ دوم دو سال 1332)
تصحیح معالم العلماء (متن عربی) تالیف رشید الدین ابی جعفر محمد السروی (ابن شہر آشوب) 12+ 142 ص
تصحیح اور تبصرہ العوام فی معرفہ مقالات الانام تالیف منسوب بہ سید مرتضی ابن داعی حسنی رازی، ی+ 295 ص
تصحیح، تجارب السلف در تواریخ خلفاء و وزراء ایشان، تالیف ہندو شاہ بن عبداللہ صاحبی نخجوانی، ید+ 348 ص
تصحیح (تتمہ الیتیمہ (متن عربی) تالیف ابومنصور ثعالبی، در دو جلد 8+ 183+ 128 ص
1314 تاریخ اکتشافات جغرافیائی و تاریخ جغرافیا، 247 ص
1314 تصحیح شاہنامہ فردوسی، از چاپ کتاب فروشی بروخیم، جلد ہای 2، 3، 4، 5ء
1315 کلیات جغرافیای اقتصادی، ج+ 221 ص
1315 ترجمہ سیرت فلسفی رازی، ابوبکر محمد بن زکریای رازی، یو+ 16 ص
1317 تصحیح، طبقات الشعراء فی مدح الخلفاء و الوزراء (متن عربی) تالیف ابن المعتز، از انتشارات اوقاف گیب، لندن 201+ 6+ 609+ xxx11 ص
1319_ تصحیح دیوان امیر معزی، از انتشارات کتاب فروشی اسلامیہ س + 868 ص
1319 تصحیح (لغت فرس، تالیف اسدی طوسی، ک+ 561 ص
1320 تصحیح و تاریخ طبرستان، تالیف بہاء الدین محمد ابن حسن بن اسفندیار کاتب، از انتشارات کلالہ خاور
1320 تصحیح و انتخاب سیاست نامہ، تالیف خواجہ الملک، از انتشارات وزارت فرہنگ یو+ 299 ص
1320 کلیات تاریخ تمدن جدید ب+ 364 ص
1321 تصحیح کلیات عبید زاکانی (قصاید و غزلیات و قطعات و رباعیات و عشاقنامہ) از انتشارات مجلّہ ارمغان کد+ 147 ص
1322 نشر مجلّہ یادگار تا سال 1328 (پنج سال)
1324 نشر ارجال کتاب حبیب السیر، گرد آوردۂ عبدالحسین نوائی ضمیمہ سال اول مجلّہ یادگار،

ک+ 304

1325 تصحیح روزنامہ میرزا محمد کلانتر فارس، ضمیمہ سال دوم مجلہ یادگار ک+ 127 ص

1325 نشر، شرح حال بعاس عباس میرزا ملک آرا، باہتمام عبدالحسین نوائی بامقدمہ عباس اقبال در احوال مؤلف (نشریہ شمارہ 1- انجمن نشر آثار ایران)

1325 تصحیح، انیس العشاقہ، تالیف شرف الدین رامی، نشریہ شمارہ 2 انجمن نشر آثار ایران د+ 64 ص

1326 ترجمہ، سہ سال در دربار ایران، تالیف دکتر فوریہ، از انتشارات کتاب فروشی علی اکبر علمی، 325 ص

1327 تصحیح، تاریخ نو، تالیف جہانگیر میرزا، از انتشارات کتاب فروشی علمی اکبر علمی ک 367 ص

1327 نشر "جنگ انگلیس و ایران در سنہ 1273" تالیف کپیتن ہنت ترجمہ حسین سعادت نوری با حواشی واضافات عباس اقبال، ضمیمہ سال سوئم مجلہ یادگار، ب+ 124 ص

1328 تصحیح، شدالا زارفی حط عن زور المزار تالیف معین الدین ابوالقاسم جنید شیرازی بامشارکت مرحوم محمد قزوینی، از انتشارات وزارت فرہنگ ھ+ 621 ص

1328 تصحیح، "سمط العلی للحضرہ العلیاء" تالیف ناصر الدین منشی کرمانی تحت نظر مرحوم محمد قزوینی، ک+ 147 ص

1328 مطالعاتی دربارۂ بحریان و جزایر و سواحل خلیج فارس، 4+ 10 س

1328 تصحیح مجمع التواریخ (در تاریخ انقراض صفویہ و وقایع بعد) تالیف میرزا محمد خلیس، مرعشی صفوی، ح+ 166 ص

1328 تصحیح، ترجمہ محاسن اصفہان، بقلم فروخی، ترجمہ حسین بن ابی الرضا آدی، ضمیمہ یادگار، ز+ 168 ص

1329 تصحیح عتبتہ الکتبہ (مجموعہ مراسلات دیوان سلطان سنجر) بقلم موید الدولہ منتخب الدین بدیع اتابک الجوینی، بامشارکت مرحوم محمد قزوینی، از انتشارات وزارت فرہنگ، + 170 ص

1331 تصحیح المضاف الی بدیع الازمان فی وقایع کرمان، تالیف حمید الدین احمد بن حامد کمانی ملقب بہ افضل کرمان، ھ+ 60 ص

1333 تصحیح و فضائل الانام من رسائل حجتہ الاسلام، (مکاتیب فارسی غزالی) 6+ 400 ص

1333 تصحیح، شرح قصیدہ عینیہ ابن سینا در احوال نفس بزبان فارسی مندرج در شمارہ 4 سال اول مجلہ دانش کدہ ادبیات، ص 14 تا 29

1334 تصحیح، ذیل بر سیر العباد سنائی، از حکیم اوحد الدین طبیب رازی مندرج در شمارۂ 3 سال 2 مجلہ دا نشکدہ ادبیات ص 8 تا 16

1338 وزارت در عہد سلاطین بزرگ سلجوقی، بکوشش محمد تقی دانش پژدہ و یحیٰ ذکاء، انتشارات دانش گاہ تہران، 8+ 361 ص

1340 میرزا تقی خان امیر کبیر، بکوشش ایرج افشار، انتشارات دانش گاہ تہران (ہدیہ دکتر اصغر مہدوی)، 5+ 433 ص

1350 مجموعہ مقالات عباس اقبال آشتیانی شامل یک صد و یک مقالہ، بامقدمہ و تصحیح دکتر محمد دبیر سیاقی، کتاب فروشی خیام وزیری 972 ص

ان کتابوں کے علاوہ ان کے ادبی تاریخی اور اجتماعی مسائل پر بے شمار مقالات ہیں جو عموماً بہار، دانش کدہ، آیندہ، ایران شہر، یادگار، ارمغان، یغما، آموزش و پرورش میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

عباس اقبال ایک فاضل ادیب تھے۔ انہوں نے بیماری سے پہلے اپنی ساری زندگی مطالعہ و تحقیق میں صرف کردی۔ عربی فارسی زبان و ادب پر عبور کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔ وہ صحیح معنوں میں محقق تھے۔ اپنے تاریخی و ادبی مقالات میں اپنے بیانات کے ثبوت میں شواہد پیش کرتے تھے اور پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے علم کے ماخذات کا ذکر کرتے تھے تحقیق کے اس انداز میں ان کی حیثیت پیشوا کی شمار ہوتی ہے۔

تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی تاریخ مغول بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ صفویوں اور قاچاریوں پر بھی ان کا خاص مطالعہ تھا سلاجقہ کے متعلق بھی ان کی ایک بلند پایہ کتاب موجود ہے لیکن وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

عباس اقبال کی طرز تحریر ادیبانہ سلجھی ہوئی اور پختہ ہے۔ بیان سادہ اور رواں ہے۔ عربی کے متداول فصیح الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کا دل پسند اسلوب مقبول خاص و عام ہوا اور ادبیات کے طالب علموں نے اسے سر مشق بنایا۔ نمونہ کیلئے تاریخ ایران سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"قبل از عہد او لجاتیو کاشی کاری در داخل مساجدو
عمارات معمول بودہ ولی فقط در بعضی قسمت ہای
آن، ، گنبد سلطانیہ درمیان ا بنیہ اسلامی اولین

نمونہ ایست کہ درتمام کاشی کاری بکار رفتہ و
ایں بہ عقیدہ جماعتی لو را محققین بر اثر عادت مغول
مراسم ایشان است چہ ایں قوم در چادور ھا
ودیورت ہائی کہ جہت خانہا خود تہیہ میدیدند سعی
بلیغ داشتند کہ دو طرف داخلی و خارجی چادرہا
و خیمہ ہا را باقسام تزئینات بیارایند"۔

پور داوُد

ابراہیم پور داوُد 20 بہمن 1264ھ 1885ء رشت میں پیدا ہوئے والد کا نام باقر بن محمد حسین ہے۔ ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم رشت میں ہی حاصل کی۔ 1284/ 1905ء میں تہران آئے اور طب قدیم پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ اس قیام کے دوران میں مشروطہ طلبوں کا ساتھ دیا اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ تہران میں ہی مدرسہ الیانس میں فرانسیسی پڑھی۔ 1326ھ/ 1947ء میں بیروت چلے گئے اور مدرسہ لائیک فرانسہ میں 3 سال تک ادبیات فرانسہ پڑھنے میں مشغول رہے۔ وطن واپس آکر پھر فرانس چلے گئے اور پیرس یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم شروع کی۔ 1332ھ/ 1953ء میں دو شخصوں کی معیت میں نامہ ایران شہر اجراء کیا۔ جنگ عظیم شروع ہوئی تو پیرس میں نہ ٹھہر سکے۔ بغداد میں آکر مقیم ہوگئے۔ وہاں سے "دست خیز" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا لیکن جب جنگ کے بھبھوکے کوت العمارہ تک پہنچے تو وہ بغداد چھوڑ کر کرمان شاہ میں آگئے لیکن جب جہاں بھی خرابی پیدا ہوئی تو پھر بغداد چلے گئے اور بلقان ہوتے ہوئے برلین پہنچے خیال تھا کہ جرمنی سے گزر کر سوئٹزرلینڈ چلے جائیں لیکن اجازت نہ ملی۔ 1920ء میں وہیں پہلے برلن یونیورسٹی میں اور بعد میں ارلانگن یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ 1299ش 1920ء میں انہوں نے شادی کی اور ان کی اکلوتی بیٹی پورا ندخت پیدا ہوئی۔ 1303ش 1924ء وطن واپس آگئے' 1304ش 1925ء میں ہندوستان گئے اور اوستا کا کچھ حصہ شائع کیا۔ 1310 میں پھر برلن واپس چلے گئے' 1311 ش 1932ء میں شانتی نکتین (کلکتہ) میں ملازم ہو کر گئے۔ دو سال کے بعد پھر برلن واپس چلے گئے' 1316 میں مستقل طور پر ایران آگئے اور دانش گاہ تہران میں استاد مقرر ہوئے اور آج تک اوستا' فارسی' باستان اور فرہنگ و قانون ایران

باستان کی تدریس میں مصروف ہیں۔

1317 سے فرہنگستان کے مستقل رکن ہیں۔ 1323 میں ستر روز تک ہندوستان کی سیر و سیاحت کی اور تعلیمی ادارے دیکھے 1324/ 1955ء میں انجمن ایران شناسی کی بنیاد رکھی۔ 1326/ 1947 میں آموزش گاہ ایران شناسی کا آغاز کیا۔ وفات 1347ش 1968ء۔

تصانیف و تالیفات

گاتھا: پنج سرود زر دشت با متن اوستیائی و با ترجمہ گفتار ہای آن بہ انگلیسی بہ دست یاری دین شاہ ایرانی، بمبئی، خرداد ماہ 1305 (تجدید طبع دانشگاہ تہران 1354)

یشتہا جلد اول: چاپ بمبئی فرور دین ماہ 1310

یشتہا (جلد دوم) چاپ بمبئی فرور دین ماہ 1310، این دو جلد مجدداً در تہران توسط کتاب فروشی ظہوری تجدید طبع شد۔

خردہ اوستا: چاپ مئی مہرماہ 1310

یسنا (جلد اول): چاپ بمبئی۔ بہمن ماہ 1312

یسنا (جلد دوم): بخش دوم بہ کوشش دکتر بہرام فرہ وشی، تہران فرور دین ماہ 1337

گاتھا: دومین گزارش بخش نخست با متن اوستایی چاپ بمبئی، آبانما 1329

یاد داشت ہائی گاتھا: بخش دوم، بہ کوشش دکتر بہرام فرہ وشی، تہران مہرماہ 1336 (تجدید انتشار بہ توسط دانشگاہ تہران 1353)

دیسپرو: بخشی از اوستا بہ کوشش دکتر بہرام فرہ وشی، تہران 1340

ایرانشاہ: تاریخچہ مہاجرت ایرانیاں (پارسیان کنونی) بہ ہند، چاپ بمبئی 1344 ہجری قمری

خرمشاہ: دربار آئین و کارنامہ و زبان ایران باستان، چاپ بمبئی، 1305 خورشیدی

سوشیانس: دربارۂ موعود، یسنا، چاپ بمبئی 1346 ہجری قمری

گفت و شنود پارسی: برای دبیرستان ہای ہند چاپ بمبئی، اسفند ماہ 1312

فرہنگ ایران باستان: چاپ تہران، مرداد 1326 خورشیدی

ہرمزدنامہ: چاپ تہران، دی ماہ 1331 خورشیدی

آنا ہیتا: پنجاہ گفتار پور داؤد، بہ کوشش مرتضیٰ گرجی، تہران انتشارات امیر کبیر 1343

زین ابزار: تہران، چاپ ستاو ارتش تہران 1346

فریدون: (از شاہنامہ) تہران، 1346

بیژن و منیژہ: (از شاہنامہ) تہران، 1344

ان کے علاوہ اور کئی محققانہ مقالات جو وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

پور داؤد اپنی جوانی میں ایک محب وطن درد مند شاعر تھے۔ ملی سوز و اخلاص سے بھری ہوئی ان کی نظمیں داد تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ پوراندخت نامہ کے عنوان سے بمبئی میں شائع ہوا تھا۔ جب سے تحقیق و تدریس کے مشاغل میں مصروف ہوئے شعر کہنا چھوڑ دیا۔

پور داؤد ایک فاضل محقق تھے۔ ان کی علمی وسعت کا اندازہ ان کی تحصیلات سے واضح ہوتا ہے اروپائی زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان اوستا فارسی باستان اور پہلوی کا غائر مطالعہ کیا اور آج اس زباندانی اور قدیم ایران شناسی کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ دنیا میں ان چند شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے قدیم تمدن و مذہب ایران کو زندہ کیا اور قدیم زبانوں میں مہارت حاصل کرکے قدیم ترین کتابوں کے متنوں کو تحقیق کے بعد شائع کیا۔ ان کا ترجمہ کیا اور مبسوط دیباچے لکھے۔ متذکرہ صدر کتابیں تمام اس نوعیت کی ہیں۔ فرہنگ ایران باستان اور ہرمزنامہ بلند پایہ تاریخی کتابیں ہیں۔ مصنف نے لفظوں کی ارتقائی لسانی تحقیق کی مدد سے قدیم ایرانی ثقافت، مذہب آداب و رسوم، تجارت، حرفت، زراعت کا سراغ لگایا ہے۔ جب تک مختلف زبانوں کے ریشوں کا علم نہ ہو یہ مشکل کام انجام نہیں پاسکتا۔ اس قسم کا تحقیقی کام انہیں جیسے فاضل سے ہو سکتا ہے زردشتی مذہب کے پیرو ان کے احسان مند ہیں کہ جو کام ان کے اپنے فاضل علماء انجام نہیں دے سکے وہ ایک غیر زردشتی کے ہاتھوں انجام پایا۔ پور داؤد خود بھی زردشتی عقائد کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ عرب و اسلام کے خلاف ان کا تعصب مشہور ہے چونکہ روایات کے مطابق عربوں نے زردشتیوں کی مقدس کتابوں کو جلا دیا اور ایرانی تمدن کو بھی سخت صدمہ پہنچایا۔ ان کے موجودہ نقطہ نظر سے اسلامی عقاید و رسوم زردشتی دین پر مبنی ہیں وہ زردشتی رسوم و عقائد کو ایرانی عقائد کہہ کر تبلیغ کرتے ہیں چنانچہ بہت سے غیر اسلامی عقاید نژاد نو میں پھیل رہے ہیں۔ اسلامی ناموں کے بجائے اب ایران قدیم کے بادشاہوں یا دوسری نامور شخصیتوں پر بچوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔

پور داؤد کا اسلوب بیان سادہ اور رواں ہے تکلفات شعری سے بالکل عاری وہ سیدھی سادہ کلاسیکی نثر لکھتے ہیں۔ نہ عربی الفاظ کی کثرت ہے، نہ اوستا اور پہلوی کے متروک اور ناخوشگوار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مغربی زبانوں کے طرز تحریر سے بھی وہ متاثر نہیں۔ جملوں کی بندش اور انداز فکر بھی ایرانی ہے۔ علامہ قزوینی نے ان کے اسلوب نگارش کے متعلق لکھا تھا۔

"نہ تمایلی بوضع چیز نویسی فرنگی آبان تازہ دلوع بہ استعمال عین کلمات اروپا ئیمان دیدہ می شوونہ تمایلی۔ بہ انشاء فاضلانہ عالمانہ معتبرین کہ کلمات و اصطلاحات عربی در آن غالب باشد"

مثال کیلئے یہ نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

"جشن تیرگان یادگاری است از منوچہرو گویای جنگ اوست باافرسیاب تورانی پس از چندی زدو خورد ایران شد مذکرہ دست از پیکار بدارند، در سنت دیرین مااست کہ در چینن روزی آرش تیر انداز نامور ایران از بالای کوہ ماز ندران .بیروی بازوی خود تیری رہا کرو۔ آن تیز بخواست خداوندگار فرسنگہا راہ پیمودہ بکرانہ رود آمویہ (جیحون) فرود آمدہ ہمانجا مرزا ایران وتوران گردید"۔

حواشی

(i) حاشیہ صفحہ 80

شرح احوال و آثار ملک الشعراء محمد تقی بہار، خواجہ عبدالحمید عرفانی 1325، ص189

(ii) حاشیہ صفحہ 223

مجلّہ سخن دورۂ دوازدہم، شمارہ، 12

(iii) حاشیہ صفحہ نمبر 310

نویسندگان پیشرو ایران، محمد علی سپانلو، تہران 1321 ھش رمان نویسی۔

کتابیات

کنگرۂ نویسندگان ایران

سخن وران ایران در عصر حاضر — از ڈاکٹر محمد اسحاق

ادبیات معاصر — از رشید یاسمی

سبک شناسی (جلد سوم) — محمد تقی بہار

صادق ہدایت — از VINCENT MONTEIL مترجمہ حسن قائمیان

سخن وران نامی معاصر — محمد باقر برقعی

شاہکار ہای نثر فارسی معاصر — دیباچہ از سعید نفیسی

تطور نثار فارسی — از 60 سال اخیر از ایرج افشار دیباچہ شاہکار ہای فارسی نثر معاصر

فارسی ادبی کے پچیس سال — از الیاس عشقی ساقی سلور جوبلی نمبر 1955ء

شرح زندگانی من — از ابوالقاسم لاہوتی

فارسی نثر میں نئے رجحانات — از سید علی رضا نقوی

کراچی یونیورسٹی میں ایم اے امتحان کیلئے تحقیقی مقالہ

مجموعہ آثار مرزا ملکم خاں — از محمد محیط طباطبائی

بنیاد نمائش در ایران — از ابوالقاسم جنتی

زندگی و آثار، رضا کمال شہزاد — از ابوالقاسم جنتی

نیما، زندگانی و آثارلو — از ابوالقاسم جنتی

دیدو، دیدو بازدید ہفت مقالہ — از جلال آل احمد

ارزش احساسات — از نیما

افسانہ — از نیما

بازیگران سیاست — از ابوالحسن احتشامی

زندگانی و آثار بہار (2 جلد) — از نیکو ہمت

روح پروانہ — از شہریار

تذکرہ شعرائی معاصر ایران — از عبدالحمید خلخالی

علامہ قزوینی — از انتشارات ادارہ، کل نگارش وزارت فرہنگ

تاریخ زندگانی — تقی زادہ

زبان فارسی امروز — از ڈاکٹر محمد باقر (اورینٹل کالج میگزین مئی 1954ء)

در پیرامون شعر و شاعری — از احمد کسروی

زبان پاک — از احمد کسروی

انقلاب ادبی — از وحید دست گردی

تاریخ مختصر نثر فارسی — از حسین قلی کاتبی

زبان ایران عربی یا فارسی — از ذبیح بہروز

مجلات، یغما، سخن، مجلہ دانش کدہ ادبیات، تہران مصور، ہلال

MODERN PERSIAN POETRY BY M.M. ISHAQI

MODERN PROSE & POETRY OF PERSIAN BY E.G. BROWNE

PAKISTAN REVIES, OCTOBER, 1954.

(IRANIAN PRESS BY DR. M. BAQIR)

مجلہ ہفتگی دینائی جدید — شمارہ 12 سال 1335

تاریخ بیداری ایران — از حبیب اللہ مختاری

مصنفین کے دیوان اور ان کی تصانیف

MODERN PERSIAN PROSE LITERATURE,

H. KAMSHAD, CAMBRIDGE, 1996.

صور و اسباب و شعر امروز ایران، اسماعیل نوری، تہران، 1348

ادوار شعر امروز محمد شفیع کوکی، تہران

چشم انداز شعر نو فارسی دکتر حمید زرین کوب تہران 1358

ادبیات دورہ بیداری و معاصر، محمد استعلامی تہران

اسفند ایران کے شاخسار پر۔ ادبی پیشاوری کے اشعار و افکار پر ایک نظم، علی ابوالحسن (منذر اردو ترجمہ) بنیاد اندیشہ، اسلامی، تہران، بورتا۔

ادب نامہ ایران
مرزا مقبول بیگ بدخشانی
(مع ترمیم و اضافہ)

ڈاکٹر ظہور الدّین احمد
فارسی شاعری میں طنز و مزاح
(آغاز تا حافظ)

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
جدید ایرانی افسانے
مُصنّف : سعید نفیسی
مترجم : حامد حسن قادری

نگارشات